ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے قیمت ہے

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور چمک دمک کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے مع مبسوط مقدمہ از مترجم قیمت ہے

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب سلسلہ ۴۲ کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے قیمت [illegible]

سنہ ۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصۂ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے قیمت عہ

غلامان اسلام

پچھتر سے زیادہ ان صحابہ تابعین تبع تابعین فقہاء و محدثین اور ارباب کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ قیمت ہے

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصول اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت [illegible]

مینیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

بُرہان

جلد بست و دوم　　شمارہ (۱)

جنوری ۱۹۴۹ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پچھلے دنوں جے پور کے کانگرس سشن میں صدر کانگرس ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اور پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے جو تقریریں کیں ان کی روئداد پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی سردار پٹیل ایک نہایت مضبوط اور فولادی عزم وارادہ کے انسان ہیں انھوں نے ملک کی فرقہ پرور طاقتوں سے جنگ کر کے انھیں ختم کر دینے کا جو عزم ظاہر کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نائب وزیر اعظم کو اس کا کافی احساس ہے کہ ملک کو باہر سے کسی طاقت کا اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ ملک کی خود ان پارٹیوں سے ہے جو اقتدار وطاقت حاصل کرنے کے لئے مذہب کو آڑ بنا رہی ہیں اور "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگا کر عوام سے تائید حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

صدر کانگرس اور وزیر اعظم ہند نے ہندوستان کی قومی زبان کی نسبت جو قابل قدر خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں گاندھی جی کی اسپرٹ اور اُن کے دل کی گرمی پورے طور پر نمایاں ہے محترم صدر کانگرس نے صاف صاف کہا کہ یو۔پی نے اگر خالص ہندی کو اپنی زبان قرار دے دیا ہے تو وہ ایسا کرے لیکن بہرحال وہ پورے ملک کی قومی زبان نہیں ہو سکتی قومی زبان وہی ہے جو مہاتما گاندھی کے بقول ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے جس میں ہم سب اپنے گھروں میں یہاں اور وہاں بات چیت کرتے ہیں جس کا نام ہندوستانی ہے اور جو فارسی آمیز اردو اور سنسکرت آمیز ہندی کے درمیان کی ایک چیز ہے پنڈت جی نے فرمایا کہ جو لوگ ہندی ہندی کی رٹ لگا رہے ہیں ان کے دماغ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہیں" موقع آنے پر میں ان کو جواب دوں گا۔"

پنڈت جی اور صدر کانگرس نے جو کچھ فرمایا معلوم نہیں کہ اس کا اثر اکثریت پر کیا ہوگا اور ان کے یہ سنہرے خیالات کوئی عملی جامہ بھی پہن سکیں گے یا نہیں۔ کیونکہ یہاں عوامی اور جمہوری حکومت قایم ہے جس کے آئین وقوانین اکثریت کی رائے کے مطابق بنتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ناگزیر اسباب کے باعث اکثریت اس وقت عدل وانصاف اور دیانت وامانت کے جذبہ سے کسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تاہم ہم کو اس کی خوشی ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کی معقولیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہی گاندھی جی نے بھی کہا اور صدر کانگرس اور وزیر اعظم ہند نے بھی اسی کا اعلان کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ گذشتہ دنوں بابو راجندر پرشاد کے جو چند مضامین زبان کے مسئلہ پر "ہندوستان ٹائمز" میں شائع ہوئے ہیں انھیں پڑھ کر بیساختہ ظفر بادشاہ مرحوم کا ایک شعر یاد آگیا۔

بے سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار   خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

کانگرس سیشن کی اس روئداد سے جہاں خوشی ہوئی پچھلے دنوں دستور ساز اسمبلی میں پرسنل لا کی نسبت ممبر قانون ڈاکٹر امبیدکر نے جو کچھ کہا اسے پڑھ کر بڑا افسوس ہوا حکومت کے دعوے اور دستور ہند کی بنیادی دفعہ کے مطابق یہاں کی حکومت سیکولر گورنمنٹ ہے اور سیکولر کے معنی ہیں مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہونا اس بنا پر ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر مذہب کے لوگوں کو خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی پرسنل لا کے معاملہ میں آزاد رکھا جاتا اور حکومت اس پر قید و بند لگانے کا کوئی حق اپنے لئے محفوظ نہ کرتی اگر اسی قسم کا برتاؤ روس میں ہوتا تو کسی کو اس پر حیرت اور افسوس کے ظاہر کرنے کا موقع نہ تھا لیکن جس حکومت کو گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے کا دعوی ہے اس کے لئے مذہبی معاملات میں اس طرح دخل اندازی کا حق حاصل کرنا نہایت افسوس اور شرم کی بات ہے۔

گاندھی جی مذہبی معاملات میں آزادی کے کتنے قائل تھے! اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چھوت چھات کو وہ ایک بالکل غیر انسانی رسم یقین کرتے تھے انھوں نے اس

کے خلاف اخلاقی جنگ لڑی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قایم ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ چھوت چھات ایسی قبیح رسم کو قانونی جبر سے بند کریں کیوں؟ محض اس لئے کہ یہ رسم اگرچہ معاشرتی اعتبار سے ایک غیرانسانی رسم ہے تاہم ایک طبقہ ہے جو اس رسم کو ایک مذہبی حکم سمجھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا یہ فیصلہ کسی فرقہ وارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ اس کی زد میں کوئی ایک فرقہ ہی نہیں آتا بلکہ سب ہی آجاتے ہیں لیکن چونکہ اکثریت کی حکومت ہے اس بنا پر اس کو کبھی اس کا اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت اس حق کا استعمال کبھی ان کی مرضی کے خلاف کرے گی البتہ اقلیت کو اس سے بے اطمینانی اور تشویش پیدا ہو سکتی ہے اور وہ بالکل بجا بھی ہے۔

پھر اس کے علاوہ اس کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندو مذہب پر مستند اور فاضل مصنّف مسٹر اے تھوبیسن کے قول کے مطابق ہندو مذہب کی کوئی دینیات (Theology) نہیں ہے بلکہ وہ خواص کے لئے ایک فلسفہ ہے اور عوام کے لئے چند رسومات کا مجموعہ (Mythology)

اس کے برخلاف اسلام ایک مکمل دین کا نام ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کے تمام مسائل و معاملات کے لئے الگ الگ اور مستقل احکام رکھتا ہے اس بنا پر پرسنل لا کے ختم کر دینے سے مسلمانوں کا اضطراب ایک قدرتی اور طبعی چیز ہے۔

ملک میں ایک مکمل یک جہتی اور کامل ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ضرورت اس کی تھی کہ اقلیتوں میں اعتماد پیدا کیا جائے اور ان کی دلداری کر کے ان کو اپنایا جائے نہ یہ کہ اس طرح کی اشتباہ انگیز باتیں کر کے ان میں بددلی اور بدمزگی کا احساس ابھارا جائے

مسلمانوں کے دنیوی مصائب کے دینی اسباب؟

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمونچہ کی حیثیت جواب کی نہیں بلکہ استفہامی علامت ہی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ لکھنے والا کچھ پوچھنا چاہتا ہے، گویا مفتی نہیں بلکہ اہل علم کے سامنے مستفتی بن کر حاضر ہو رہا ہے۔ دوسری بات اسی سلسلہ میں کہنے کی یہ ہے کہ میری بحث یا سوال کا دائرہ صرف دینی اسباب تک محدود ہے، دنیوی اسباب کا قصہ ان ہی لوگوں کے غور و فکر کے سپرد کرنا مناسب ہے جو دنیا اور اس کے معاملات کا تجربہ رکھتے ہیں اور یوں بھی یہ مسئلہ غالباً چنداں قابل توجہ بھی نہیں، بقول سعدیؒ جب "مسکین خر" اپنی ساری بدتمیزیوں کے باوجود بھی "بار ہمی برد" کی ضرورت کو ثابت کر کے اشرف المخلوقات کے عزیزوں میں شریک ہو سکتا ہے تو انسانیت کی ایک ہی برادری والوں میں عزیز بن جانا اور عزت کی زندگی

لہ مرا اشارہ گلستان کے مشہور مکبنی شعر کی طرف ہے یعنی ؎ مسکیں خر اگرچہ بے تمیز ست، چوں بار ہمی برد عزیز ست :: کمالات پیدا کر کے قوموں نے ہمیشہ اپنی قیمت ان لوگوں سے بہر حال وصول کی ہے جو کسی خاص جذبہ کے تحت انسانی حقوق سے ان کو محروم کرنا چاہتے تھے بنی امیہ اور بنی عباس تک کے عہد میں عیسائیوں اور یہودیوں اور مجوسیوں نے ان حکومتوں کو مجبور کیا کہ اپنی صحت اپنے مالیات اپنے زرعی کاروبار کو ان قوموں کے حوالہ کریں۔ تاریخ کے صفحات ان کی داستان سے معمور ہیں ۱۲

کا حاصل کرلینا ایک انسان کے لئے کیا دشوار ہو سکتا ہے؟ آخر جینے کے جس سے گدھے بھی واقف ہیں، اگر باوجود آدمی ہونے کے کسی قوم کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی تو اس کے لئے نہ تقریریں مفید ہو سکتی ہیں اور نہ تحریریں۔ ان کے لئے ع۔ خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ ہی جاہتا ہے کہ اکبر مرحوم کے اسی مصرعہ کو دہرا کر چپ ہو جائے۔ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ

ان پھولوں کو چھوڑ لینے کے بعد اب آئیے اور سنئے پوچھنے والا کیا پوچھنا چاہتا ہے یہ ایک خالص دینی سوال ہے دین اور علم دین سے دلچسپی رکھنے والے میرے تمام مخاطب ہیں۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ (عقاید یا کلام کی کسی فرقہ واری کتاب میں نہیں) بلکہ قرآن ہی میں جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ

" نہ تمہاری آرزوؤں، اور نہ کتاب والوں کی آرزوؤں کا تابع بلکہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ جو بھی کرے گا کوئی برائی، بدلہ اس کا، اسے دیا جائے گا"

یعنی سورۃ النساء کی آیت لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَہْلِ الْکِتَابِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ کا مفاد اور حاصل ہے۔

اسی کے بالمقابل قرآن ہی میں یہ بھی ہے کہ

" اور جو کرے کوئی برائی، یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر بخشش اور مغفرت چاہے اللہ سے، تو ہے گا اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان"

یعنی اسی سورۃ النساء کی دوسری آیت وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا کا لفظی ترجمہ ہے، اور ایسی آیتیں جن کا مفاد بھی یہی ہو جو اس

بت کا ہے قرآن کے متعدد مقامات پر جیسا کہ قرآن پڑھنے والے جانتے ہیں پائی
باتی ہیں بلکہ اسی سورہ میں وہ مشہور آیت بھی ہے جس میں اس کلی قانون کا اظہار
رمایا گیا ہے کہ

"قطعاً اللہ نہ بخشے گا، اس بات کو کہ اس کے ساتھ شریک اور ساجھی
ٹھیرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لئے چاہے گا"

نی اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ کا جو معنی اور مطلب ہے
، دو باتیں ہوئیں۔ اب تیسری بات قرآن ہی کی یہ بھی ہے کہ

"میں نے دھمکایا تم کو آگ سے جو بھڑک رہی ہے، نہ گھسے گا اس آگ
میں مگر جو سب سے زیادہ بدبخت ہے وہی جس نے جھٹلایا، اور پیٹھ پھیری"

یعنی سورۃ اللیل کی آیت فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی لَا یَصۡلٰىہَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی الَّذِیۡ کَذَّبَ
وَتَوَلّٰی کے واضح الفاظ سے صراحۃً جو بات سمجھ میں آتی ہے اب اسی کے ساتھ تشریحاً
بخاری کی ان دونوں حدیثوں کو بھی ملا لیجئے پہلی حدیث حضرت معاذ بن جبل صحابی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی جس میں ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے ایسا کوئی آدمی جو گواہی
دے اس بات کی کہ نہیں ہے الٰہ (معبود) مگر اللہ ہی، اور یہ کہ قطعاً محمد (صلی
اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، دل کی سچائی کے ساتھ جس نے ان دونوں
باتوں کی گواہی دی اور اقرار کیا، تو نہیں ہے (اس کے لئے کوئی صورت
بجز اس بات کے) کہ حرام کردے اللہ اس پر آگ کو یعنی جہنم کو"

یعنی ما من احد یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ صدقاً من قلبہ الا حرمہ

اللہ علے النار (متفق علیہ دیکھئے مشکوٰۃ مولوی محمد ادریس کاندھلوی والی ص۲۹ ج ۱) اور دوسری روایت عتبان بن مالک صحابی کی جس میں ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطعاً اللہ نے آگ یعنی (جہنم) پر حرام کر دیا اس کو جس نے لا الہ الا اللہ کہا اللہ کے چہرے کو اس کے ذریعہ تلاش کرتا ہے۔"

یعنی اِنَّ اللہ حرم علی النار من قال لا الہ الا اللہ یبتغی بذلک وجہ اللہ رواہ جمع الفوائد ص

ظاہر ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مفہوم بھی وہی ہے جو سورہ واللیل والی آیت کا مفاد ہے یعنی جہنم میں صرف وہی جائیں گے جنھوں نے اللہ کے رسول کے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلا دیا ہو، اور جھٹلا کر پیغمبر سے رشتہ توڑ لیا ہو با لفاظ دیگر تکذیب و تولی کا مجرم بن کر جس نے اپنے آپ کو شقاوت اور بدبختی کی آخری منزل تک پہنچا دیا ہو، یعنی الاشقی الذی کذب و تولی کا جو مصداق بن گیا ہو، ان صفات سے موصوف ہونے کے بعد چونکہ کوئی مسلمان باقی نہیں رہ سکتا، اس لئے آیت کا واضح اور کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ جہنم میں وہی جائے گا اور اس کے سوا کوئی نہ جائے گا، جو مسلمان نہیں ہے یہی حاصل اس آیت کا بھی ہے اور اسی مضمون کی تائید و تشریح بخاری شریف کی ان دونوں صحیح حدیثوں سے بھی ہو رہی ہے۔

پوچھا اب بھی جاتا ہے کہ مذکورہ بالا تین قسم کی آیتوں کی بنیاد پر کیا یہ عقیدہ قرآنی عقیدہ نہ ہوگا کہ جہنم کا عذاب صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مسلمان نہیں ہیں خواہ وہ صراحۃً منکر و مکذب ہوں، یا منافق[1] ہوں، اور کسی قسم کا مسلمان ہو، جہنم کی آگ اس کے لئے

---

[1] منافق کے متعلق عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دل سے تو بالکلیہ منکر و مکذب ہو اور زبان سے اسلام (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حرام، اور جہنم کی آگ کے لئے وہ حرام ہے، گویا نہ جہنم ہی مسلمان کے لئے ہے اور نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا اقرار کرتا ہو، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت تو منافق طبقہ کی ایک قسم کی ہے یہ وہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جس کی مثال اس آگ سلگانے والے سے قرآن میں دی گئی ہے جو اپنی شعلہ زبانیوں سے لوگوں کو اطمینان دلاتا رہتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان پر ہے وہی دل میں بھی ہے لوگ جب مطمئن ہو جاتے ہیں تو خود اس روشنی سے وہ قطعاً محروم ہو جاتا ہے جسے زبان کی بتی جلاکر دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے پھیلا رہا تھا، کیونکہ اس روشنی کا اس کے باطن سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا یوں تاریکیوں کے احاطہ میں خود گھر جاتا ہے اور ایسی حالت میں گرفتار رہتا ہے کہ نہ دوسروں کو اپنے باطن کی واقعی کیفیت سے مطلع کر سکتا ہے کہ اس کے زبانی دعوے کے خلاف یہ بات پڑے گی اس لئے بکم یعنی اس قسم کے لوگ گونگے ہو جاتے ہیں اور تاریکیوں میں گھر جانے کی وجہ سے باہر سے بھی نہ اُن کی آنکھیں کچھ لے سکتی ہیں اور نہ اُن کے کان۔ اسی لئے صم (بہرے) عمی (اندھے) وہ ہو جاتے ہیں یہ انسانی نفسیات بھی ایسی ناپاک کیفیت ہے کہ واقعی روشنی کی طرف اس قسم کے زبان درازوں کے لئے واپسی کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا فہم لا یرجعون، مگر دوسری تمثیل اسی طبقہ کی برستی ہوئی پھواروں یعنی کصیب من السماء سے دی گئی ہے جن میں ظلمات اور تاریکیاں تو زیادہ ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی رعد کی گرج سے ان کے کان اور برق کی چمک سے ان کی باطنی بینائی متاثر بھی ہوتی رہتی ہے یہ فکری نفاق کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر ہے وساوس وشکوک کی پھواروں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی حق کی گرج اور صداقت کی چمک بھی ان کے ساتھ کوند جاتی ہے مگر ان سے زیادہ دیر تک قصداً مستفید ہونا نہیں چاہتے کہ ان کی غیر دینی فاجرانہ زندگی پر اندیشہ ہوتا ہے کہ "مذہب فانی" یہ استفادہ نہ ثابت ہوا اسی لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر فسق وفجور کی زندگی کو موت سے بچانا چاہتے ہیں الغرض ان ہی نفسیاتی کیفیتوں میں الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں، جب کچھ روشنی چمکی ذرا دیر کے لئے چل پڑے پھر تاریکی کا حملہ ہوا اور جہاں تھے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے، بہرحال نفاق کی پہلی قسم کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو فکری وعقلی قوت سے کام نہیں لیتے اور دنیاوی کاروبار میں ہوشیار ہوتے ہیں دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے منہ سے کچھ باتیں بنالیا کرتے ہیں ان کا باطن قطعاً سیاہ ہوتا ہے جس میں ایمان کی کوئی کرن نہیں ہوتی، لیکن دوسری قسم ارباب فکر ونظر کے طبقہ منافقین کی ہے بظاہر ان کو کبھی اپنی فکری ونظری جد وجہد میں صداقت وایمان کی کچھ شعاعیں ہاتھ آتی ہیں لیکن ان سے وہ مستفید نہیں ہوتے وساوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مسلمان ہی جہنم کے لئے ہے بتایا جائے کہ اس عقیدے کو غیر قرآنی عقیدہ قرار دینے کی کیا صورت ہے خصوصاً جب بخاری کی دو دو صحیح حدیثوں کا صریح و واضح مفاد بھی یہی ہے جو سورہ واللیل کی آیت سے سمجھا جا رہا ہے جب تک کہ خدائی الفاظ کے ساتھ بیرونی آمیزش کو شریک کرنے کی جرأت نہ کی جائے اس وقت تک قرآن کی اس آیت کا ترجمہ و مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جس کی تائید اور تشریح ان دونوں حدیثوں کے الفاظ سے ہو رہی ہے۔

اب اس کے بعد پہلی آیت جو نقل کی گئی ہے اس کا مفہوم سامنے آتا ہے یعنی ہر برائی کا بدلہ برائی کرنے والوں کو دیا جائے گا مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا یہی حاصل ہے اسی کے ساتھ دوسرے مد والی آیتیں یعنی قرآن ہی کے قانون عفو و مغفرت کو بھی رکھ لیا جائے ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سمجھا اور سمجھایا جائے کہ عذاب کی بدترین قسم اور سزا کی شدید انتہائی شکل تو وہی ہے جسے بھگتنے والے جہنم میں بھگتیں گے جو مسلمان ہے وہ اس عذاب سے تو بچ جائے گا مگر عذاب کی اور بھی تو قسمیں ہیں، یعنی جہنم میں داخل ہونے سے پہلے جسر (پل صراط) میدان حشر کی فوقانی و تحتانی ظاہری و باطنی پریشانیاں، نیز اس سے پہلے برزخی عذاب کا بھی ایک مستقل سلسلہ ہے یہ تو مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہونے سے پہلے سزائیں

(بقیہ حاشیہ بسلسلۂ صفحہ گذشتہ) واد بام کے لکد کوب سے ان کے قلوب چور ہوتے ہیں گو بہ ظاہر مسلمانوں کی جماعت میں شریک رہتے ہیں حدیثوں میں جن لوگوں کے متعلق آیا ہے کہ مقدار خردل یا ذرہ برابر بھی ایمان جن میں ہوگا غالباً فکری نفاق کے ان مریضوں کا یہ حال ہوگا ان کو جہنم میں جلنے اور سزا بھگت لینے کے بعد پھر ان کو نئی زندگی مقدار خردل والے ایمان کی بدولت بخشی جائے گی لیکن یہ مومن و مسلم نہیں بلکہ منافق طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں ۱۲

کی مختلف غیبی شکلیں ہیں جو آئندہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پیش آئیں گی اور ان کے سوا موت سے پہلے خود اسی دنیا میں مصائب و آلام کی گوناگوں شکلوں کا حصہ بھی ہے ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچ جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ سزاؤں کی دوسری شکلیں جو موت کے بعد یا موت سے پہلے اسی زندگی میں مجرموں کو پکڑتی ہیں ان سے بھی مسلمان ہو جانے سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے مسلمان ہونے کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ جہنم کی آگ اس پر حرام ہو جائے بلکہ جب قرآن کا یہ اعلان ہے کہ ہر سوء اور برائی کا بدلہ اس کے مرتکب کو چکھایا جائے گا اس لئے یقین کرنا چاہیے کہ جہنم کی سزا سے بچ جانے کے بعد مسلمانوں کے لئے سزا کی یہی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں جو جہنم میں داخل ہونے سے پہلے بنی آدم کے سامنے آئیں گی چونکہ قرآن ہی نے یہ خبر بھی دی ہے کہ برائی کرنے والے اور اپنے آپ پر ظلم توڑنے والے اللہ تعالیٰ سے اگر مغفرت چاہیں گے، تو اللہ کو بہت بڑا بخشنے والا اور بہت بڑا مہربان پائیں گے، اس لئے اگر یہ مانا جائے کہ حشر یا میدان حشر یا عذاب قبر وغیرہ کی سزاؤں پر مغفرت کے اسی قانون کا یہ عمل ہوگا کہ بجائے ان کے ان ساری سزاؤں کو دنیا کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی شکل میں قدرت بدل دیتی ہے تو قانون عفو و مغفرت کا اقتضا بھی پورا ہو جاتا ہے اور مجازاۃ و مکافات کا وہ قانون عام جس کا اعلان من یعمل سوءً یجز بہ میں کیا گیا ہے اس کی تکمیل کی راہ بھی نکل آتی ہے، بلکہ دنیا کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں بھی سارے مصائب و آلام دکھ پہنچانے کے لحاظ سے چونکہ برابر نہیں ہیں اس لئے مغفرت طلبی میں زور لگانے والے جتنا زیادہ زور لگائیں گے، سزاؤں کے قالب بھی بدلے چلے جائیں گے، یعنی نسبتاً

کم تکلیف پہنچانے والی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر قانون مجازاۃ کا اقتضا ان کے لئے پورا ہوگا اور سچ پوچھئے تو صحاح کی کتابوں میں اسی قرآنی آیت یعنی من یعمل سوءً یجز بہ جس میں ہر جرم کو مستحق سزا قرار دیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مجازاۃ کے قانون سے کسی مجرم کا کوئی جرم مستثنیٰ نہیں ہے، اسی کے متعلق بکثرت ایسی روایتیں جو مروی ہیں کسی میں ہے کہ

"جب مذکورہ بالا آیت (من یعمل سوءً یجز بہ) نازل ہوئی تو مسلمانوں پر یہ آیت بہت گراں ثابت ہوئی، اور حد سے زیادہ ان کو تشویش میں اس آیت نے ڈال دیا، لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اس احساس کو جب ظاہر کیا، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیدھے بنو اور (نیکی) سے قریب ہونے کی کوشش میں لگے رہو اور یقین کرو، کہ مسلمان پر جب کوئی مصیبت (دنیا میں آتی ہے) حتیٰ کہ کانٹا بھی جو کوئی چبھ جاتا ہے، یا کوئی ٹھوکر لگتی ہے، یہ کفارہ تمہارے گناہوں کا بن جاتی ہے۔"

تفسیر درمنثور میں اس روایت کو درج کرتے ہوئے صحیح مسلم کا بھی صحاح کی دوسری کتابوں مثلاً ترمذی ونسائی وغیرہ کے ساتھ حوالہ دیا ہے اسی کے ساتھ بخاری ومسلم کی وہ روایت بھی درج کی ہے جس میں ہے کہ

"کسی مومن کو کوئی دکھ درد، بیماری، غم والم، یا کسی قسم کا کوئی زدو ہوتا ہے اس کے ذریعہ بھی اس کے گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے"

یعنی وہی سزا جو کسی اور عالم میں ہونے والی ہوتی ہے وہ اسی دنیا میں ان مصائب

کی شکل میں پوری ہوجاتی ہے اس باب میں کس حد تک مغفرت کا قانون سزاؤں کی تخفیف میں اثر انداز ہوتا ہے اس کا اندازہ ان روایتوں سے ہوتا ہے جن میں ہے کہ اپنی چیز رکھ کر آدمی بھول جاتا ہے اور اس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے فکر کی تکلیف میں اسے مبتلا ہونا پڑتا ہے یہ بھی اسی مجازاتی قانون کی تکمیل ہی کی ایک تخفیفی شکل ہوتی ہے یہ بھی ان ہی روایتوں میں ہے کہ کسی چیونٹی کے کاٹ لینے سے یا دل کی دھڑکن سے پسینہ جو آجاتا ہے اس میں بھی مجازاۃ کا قانون اپنا حق پورا کرتا ہے، ابوہریرہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابن ابی شیبہ کا حوالہ دیتے ہوئے درمنثور میں نقل کیا ہے کہ

"مسلمان مرد یا عورت دنیا کی مصیبتوں میں مبتلا ہوکر بالآخر صفائی کے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ ما علیہ من خطیئۃ (گناہ کا کوئی دھبہ ان میں باقی نہیں رہتا)

بعض روایتوں میں "بے داغ چاندی" اور "سونے کے مصفا ڈلے" سے اس شخص کو تشبیہ دی گئی ہے، جو مجازاتی قانون کے عمل کو دنیاوی مصائب کی شکل میں بھگت کر پاک وصاف ہوجاتا ہے،

بہرحال جہنم سے اس شخص کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا جو نفاقاً نہیں بلکہ واقعۃً دائرہ اسلام میں داخل ہوچکا ہے جہنم سے وہ بیگانہ اور جہنم اس سے بیگانہ ہوجاتا ہے اگر یہ مانا جائے تو سورہ واللیل والی آیت اور معاذ بن جبل و عتبان بن مالک والی صحیح حدیثوں کا کیا مطلب سمجھا جائے اور ان نصوص سے آخر کیا وجہ ہوگی کہ اس عقیدے کے پیدا کرنے سے لوگوں کو روکا جائے خصوصاً ابتدا اسلام میں بھی صحابہ کے شاگردوں یعنی تابعین میں سے محمد بن سیرین کے متعلق حافظ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں یہ

روایت بھی نقل کی ہے کہ سورہ واللیل کی مذکورہ بالا آیت کا مطلب وہ بھی بیان کرتے تھے کہ مسلمان خواہ عملاً کسی حال میں ہو جہنم کی سزا سے بری ہو جاتا ہے۔ اور آخر زمانہ میں ہندوستان کے مشہور مجدد اسلام حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے مکتوب ۲۶۶ ج ۱ میں فرماتے ہیں کہ

اہل کبائر کہ گناہان ایشان بمغفرت
نہ آمدہ اند بہ توبہ یا شفاعت
یا بمجرد عفو و احسان و نیز ان
کبائر را بآلام و محن دنیوی یا شدائد
سکرات موت مکفر نہ ساختہ امید
کہ در عذاب آنہا جمعے را العذاب
قبر کفایت کنند و جمعے دیگر را
باوجود منتہائے قبر یا اہوال قیامت

کبیرہ گناہوں کے مجرموں کے گناہ
توبہ کی وجہ سے یا شفاعت یا حق تعالیٰ
کی عام مہربانی و عفو و کرم کی وجہ سے
نہ بخشے گئے، نیز ان کبیرہ گناہوں کا
ازالہ دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں
سے، یا سکرات موت کی تکلیفوں
سے نہ ہوا ہو تو اس کی توقع ہے کہ
بعضوں کے لئے عذاب قبر کی سزا کافی

ؔ مسلمان ہونے کے ساتھ ہی جہنم سے انسانیت کا رشتہ قطعی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اس قرآنی عقیدے کے ساتھ خواہ مخواہ اہل کتاب کے ان امانی اور آرزوؤں سے شک میں مبتلا نہ ہونا چاہئے جن کا قرآن ہی میں مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے یعنی یہود کہتے تھے کہ صرف چند گنتے گنائے دن کے لئے ہمیں جہنم چھوئے گی (لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ) یا اہل کتاب کہتے تھے کہ جنت یہود و نصرانی ہوئے بغیر کوئی جا سکتا (لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصٰری) بلکہ ان دعووں کی بنیاد عقیدے اور عمل پر نہیں بلکہ یہود کی نسلی برتری اور اسرائیل کی اولاد ہونے پر مبنی تھی اسی طرح نصاریٰ کفارہ کے مغالطے میں غلطاں و پیچاں تھے ان کو باور کرایا گیا کہ خدا کا بیٹا عیسائیوں کے جرائم کی سزا صلیب پر چڑھ کر پا چکا پھر ان بیچارے جرائم کی دوبارہ سزا عیسائیوں کو کیسے مل سکتی ہے ۱۲ "والقصۃ بطولہا" ابن سیرین کے قول حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۲۷ مطبوعہ المصر میں ملاحظہ فرمائیے ۱۲

وشدائد اں روز اکتفا فرمایند | ہوگی اور بعضوں کے لئے عذاب قبر کے ساتھ قیامت کے دن کے مصائب اور سختیاں کافی ہوجائیں گی۔

سزا یا مجازاۃ کی ان مختلف شکلوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد آخر میں حضرت مجدد قدس اللہ سرۂ العزیز یہ فرماتے ہیں کہ

"از گناہاں باقی نہ گذارند کہ محتاج بعذاب نار گردند" ص۳۲۸ ج۱

جس کا حاصل یہی ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد خواہ کسی قسم کے کبیرہ اور بڑے بڑے ہم گناہوں میں کوئی مبتلا ہو، پھر بھی سزا پانے کے "عذاب نار" یعنی جہنم کی ضرورت س مسلمان کے لئے باقی نہ رہے گی، بلکہ جہنم سے پہلے سزا کی مختلف منزلوں میں اپنے کئے کے خمیازوں کو وہ بھگت لے گا۔

محدث دہلوی حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب قایم فرما کر اس پر بحث کی ہے کہ دنیا میں بھی اعمال کے نتائج کا ظہور کن کن شکلوں میں ہوتا ہے، شاہ صاحب نے اس قسم کی قرآنی آیتوں کو نقل کر کے جن میں ارشاد ہوا ہے کہ

"جو مصیبت بھی تم پر ٹوٹی، یہ خود تمہارے ہاتھوں کی کمائی سے ہوا"

یعنی ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم وغیرہ مشہور آیتوں میں اسی مضمون کو جو بیان کیا گیا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے من یعمل سوء یجز بہ (جس نے جو برائی بھی کی اس کا بدلہ اسے دیا جائے گا) کو پیش کر کے ان ہی حدیثوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا بہ تفصیل ذکر گذر چکا آخر میں فرماتے ہیں کہ دنیاوی مصائب کے

قالب میں ان سزاؤں کو بھگت لینے کے بعد بندہ اپنے گناہوں سے اتنا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے کثافتوں سے صاف وپاک ہو کر سونا بھٹی سے باہر نکل آتا ہے شاہ صاحب کے عربی الفاظ یہ ہیں کہ "ان العبد لیخرج من ذنوبہ کما یخرج التبر الاحمر من الکیر" دنیاوی مصائب تو یہ کام کرتے رہتے ہیں باقی اسی کے ساتھ اگر توبہ استغفار نماز روزہ وغیرہ جیسے اعمال میں بھی اگر وہ مشغول رہا یعنی حسن اعمال سے گناہوں کے زہر کا ازالہ ہوتا ہے اور خبر دی گئی ہے کہ گناہوں کے کفارہ کا کام وہ دیتے ہیں ان کا اثر شاہ صاحب یہ بتاتے ہیں کہ "رفع البلاء وتخفیفہ" میں ان سے مدد ملتی ہے بالفاظ دیگر یہی مطلب ہوا کہ رفع بلا کے سوا سزا کی سخت شکلوں کو نسبتاً آسان اور کم تکلیف دہ سزاؤں کے قالب میں بھی اسی قسم کے اعمال بدلتے چلے جاتے ہیں دیکھو حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۵ ج ۱ مطبوعہ مصر باب الجزاء علی الاعمال فی الدنیا

ایسی صورت میں بدکرداریوں کے نتائج ظاہر ہیں کہ جہنم سے ہٹ کر حسب وحشر وقبر میں بھی اگر کرنے والوں کے سامنے نہ آئے، تو من یعمل سوءً یجز بہ کے مجازاۃ عام کے تحت مسلمانوں کو اسی دنیاوی زندگی کے مصائب وآلام ہی کی شکل میں اپنے اعمال کے خمیازوں کو بھگتنا پڑے گا، شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہ نے یہ لکھ کر کہ امراض اور غم وحزن خوف وغیرہ کے قالب میں ان سزاؤں کا ظہور کبھی ہوتا ہے اور کبھی مسلمانوں کے مال وآل واولاد کی تباہی، کے رنگ میں کبھی خود انسانوں کو، یا فرشتوں کو یا جانوروں کو الہام ہوتا ہے"

یعنی "تارۃ فی اھلہ ومالہ وربما الھم الناس والملئکۃ والبھائم" اور برے برتاؤ کے ساتھ مسلمانوں کے آگے وہ نمایاں ہوتے ہیں، شاہ صاحب نے مشہور حدیث نبوی

جس میں آیا ہے کہ

" مومن (مسلمان) کی مثال کھیتوں کے ان پودوں جیسی ہے جنھیں ہوائیں کبھی ادھر گراتی ہیں اور کبھی ادھر گراتی ہیں اور کبھی ان کو سیدھا کر کے کھڑا کر دیتی ہیں، تاآنکہ دنیا میں قیام کی جو مقررہ مدت ہے وہ پوری ہو جاتی ہے برخلاف اس کے جو منافق اور مومن نہیں ہے اس کی مثال صنوبر کے اس اکڑے ہوئے درخت کے مانند ہے جو ہواؤں سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا، تاآنکہ ایک دفعہ اکھڑ کر زمین سے الگ ہو جاتا ہے"

یعنی مثل المومن کمثل الخامۃ من الزرع تفیئھا الریاح تصرعھا مرۃ وتعدلھا اخری حتی یاتیہ اجلہ، ومثل المنافق کمثل الارزۃ المجذیۃ التی لا تصیبھا شئی حتی یکون انجعافھا مرۃ واحدۃ" صحاح کی اسی حدیث سے مسلمانوں کی مجازاتی زندگی کی تشریح کی ہے۔

مطلب یہی ہوا کہ جہنم سے اپنا رشتہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر توڑنے کا موقعہ آدم کی اولاد میں جن لوگوں کو میسر نہ آسکا، ان کے لئے تو کھلا میدان ہے مرنے سے پہلے بھی، مرنے کے بعد بھی، قبر میں بھی حشر میں بھی جسر پر بھی اور بالآخر جہنم میں پہنچ کر بھی کافی گنجائش اپنے کرتوتوں کے خمیازوں کے بھگتنے کے لئے موجود ہے، یہاں نہیں تو وہاں، وہاں نہیں تو آگے اور بالآخر جہنم میں پہنچ کر مجازاۃ کے قانون کے نتائج کو اپنے سامنے وہ پائیں گے لیکن مومن کے لئے تو جہنمی سزاؤں کا کوئی موقعہ ہی باقی نہیں رہتا پھر برائیوں کے ساتھ بھلائیوں کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح وہ جاری ہی رکھتا ہے توبہ کرتا ہے استغفار سے کام لیتا ہے، ان نمازوں کو بھی

پڑھتا ہے جن کی خاصیت بتائی گئی ہے کہ ایک وقت سے دوسرے وقت تک کے وقفہ میں جو گناہ بھی سرزد ہوتے ہیں ان سے نمازی کو پاک کرتی رہتی ہے پھر وضو کے آثار و نتائج بھی یہی بتائے گئے ہیں کہ پانی سے صرف بیرونی آلودگیوں ہی کی صفائی نہیں ہوتی بلکہ قربِ حق کے باطنی احساس کے ساتھ چونکہ اعضاء کو وضو کرنے والا دھوتا ہے اس لئے باطنی اثر بھی وضو کا پڑتا ہے اور ہر عضو جو دھویا جاتا ہے اس عضو کے گناہ صاف ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ گھر سے نماز کی نیت کرکے جو نکلتا ہے تو ہر قدم پر بتایا گیا ہے کہ ایک ایک گناہ کو اڑاتا چلا جاتا ہے یہ اور ان کے سوا اعمال و اشغال کے دوسرے سلسلے ایسے ہیں جن سے گناہ کی روح پژمردہ ہوتی چلی جاتی ہے ایسی صورت میں مجازاۃ کا قانون مومن کے لئے صرف دنیاوی آلام و مصائب کے قالبوں میں منحصر ہو کر رہ جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اور اسی سے اس اچنبھے کو بھی لوگ اپنے دلوں سے چاہیں تو دور کر سکتے ہیں، جو مسلمانوں کی ماضی و حال کی تاریخوں میں مصائب و آلام کا ہجوم نظر آتا ہے پچاس سال بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر گذرنے نہ پائے تھے کہ واقعہ حرہ میں پیغمبر کے شہر میں قتل عام کی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ تین دن تک مدینہ کے رہنے والوں کے مال کے ساتھ جان کے ساتھ ناموس کے ساتھ وہ سب کچھ کیا گیا جو درندہ یا جنگل کے جانور بن کر آدم کی اولاد کبھی کبھی کر گذرتی ہے بلکہ اس سے پہلے بھی جمل و صفین و کربلا میں کیا کچھ نہیں دیکھا گیا، پھر ان مصائب کا سلسلہ کیا کسی صدی میں کبھی ٹوٹا ہے لوگ گھبراتے ہیں کہ قدرت کے مسلمانوں کے ساتھ اس عجیب و غریب سلوک کی کیا توجیہ کی جائے؟ ان کے نشاعروں کو مزدد کی خدائی کا دھوکہ ان کی بندگی پر بھی کبھی کبھی اس صورت

حال کو دیکھ کر لگا[1]، سوال یہی ہے کہ گذشتہ بالا قرآنی حقائق کا صحیح حدیثوں اور حکمار اسلام کے افکار کی روشنی میں اگر مطالعہ کیا جائے۔ تو مسلمانوں کے دنیوی مصائب کی توجیہ میں کیا کوئی دشواری باقی رہتی ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ رحمتوں کے مظاہر میں جو نہیں سوچتے ہیں ان کو زحمتوں کا زور نظر آتا ہے۔ کاش! علمائے امت مسائل کے سوال پر بجائے توبیخ وزجر کے فکر و مہر سے کام لیں۔ اور دنیا کی ایک قوم جو دوسروں کی نگاہوں میں اضحوکۃ الامم بنی ہوئی ہے اور اپنے حال سے وہ خود مطمئن نہیں ہے، زندگی کا راز اس پر واضح کیا جاتا، عارف روم نے موزے کے تمثیلی قصے کا ذکر کر کے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عقاب موزے کو لے اڑا لیکن زمین پر اسی موزے کو اوپر جاکر جب چھوڑا تو اس سے ایک کالا سانپ نکل پڑا، تب کہا گیا کہ

موزہ بربودی دمن درہم شدم		تو غمم بردی دمن درہم شدم

اور آخر میں اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

کان بلا دفع بلا ہائے بزرگ		واں زیاں منع زیانہائے سترگ

لیکن ظاہر ہے کہ دنیا کے مصائب وآلام میں تخفیف وتحویل کی کارفرمائیوں اور ان کارفرمائیوں میں قدرت کے تکوینی مراحم کی قیمت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی حدود کے حوادث وواقعات کے لئے عین الیقین بنایا ہے جہنم میں جسر پر، حشر میں، قبر میں جن مہیب وجاں گسل مناظر سے الشا ینت دوچار ہو گی عین الیقین کی اسی معصوم اور مقدس آنکھ سے آج بھی ان کا مطالعہ کر رہے ہیں باقی اسلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے کی وجہ سے اور مسلمانوں کی جماعت

---

[1] غالب مرحوم کا مشہور شعر ہے کیا وہ نمرود کی خدائی تھی + بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

میں شریک ہونے کے مجرم بن کر دنیا بھر کی مصیبتوں کو بھی جھیلتے چلا جانا، اور خود اسلام اور اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو بھی اشتباہی ذہنیت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر دفن کئے رہنا جن دین با ختوں کی یہ حالت ہے واقعہ یہ ہے کہ دین ہی نہیں بلکہ وہ تو اپنی عقل کے ساتھ بھی کھیل رہے ہیں، وَمَا یخدعون الا انفسھم وما یشعرون اپنے اس استفہامی معروضہ کو ختم کرتے ہوئے آخر میں چاہئے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جہنم سے بے تعلق قطعاً بے تعلق ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو حق تعالیٰ کے فضل و کرم یا اپنے محبوب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور دعاؤں کی ضرورت باقی نہیں رہتی واقعہ یہ ہے کہ جہنم سے پہلے سزاؤں کے مختلف منازل اور مختلف قالبوں میں ان کے ظہور کی خبریں جو دی گئی ہیں جیسے مکفرات یعنی اعمالِ صالحہ توبہ و استغفار، صلوٰۃ و صیام، حج و زکوٰۃ وغیرہ ان سزاؤں کا قالب کبھی اور ان کا محل و مقام کبھی تخفیفاً بدلتا چلا جاتا ہے، جسر سے ہٹ کر حشر میں حشر سے ہٹ کر قبر میں، قبر سے ہٹ کر خود اسی حیوٰۃ الدنیا اور پست زندگی میں مجازاۃ کا قانون اپنے قدرتی اقتضاء کو پورا کرتا ہے اور دنیا میں بھی بڑی مصیبتوں کو نسبتاً ہلکی مصیبتوں کی شکل میں بدل دیا جاتا ہے حتیٰ کہ جو تردد جوتیوں کے تسمے کے ٹوٹنے سے یا کسی معمولی چیز کے تل پٹ ہو جانے یا رل مل جانے کی وجہ سے ہوتا ہے یہاں تک تحویل و تخفیف و تحویل کا قانون اترتے ہوئے چلا آتا ہے حتیٰ کہ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ خواب میں بھی موحش اور پریشان کن حالات تک کی شکل مجازاۃ کا یہی قانون کبھی کبھی اختیار کر لیتا ہے گویا رویا میں اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتنے والے بھگت لیتے ہیں اسی طرح سزاؤں کی ان ہی منزلوں میں حق تعالیٰ کی رحمت بھی دستگیری فرماتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی اپنا کام کرتی ہے بلکہ جرائم کے نتائج سے پاک ہونے کے بعد بہشتی زندگی سے استفادہ تو زیادہ تر فضل حق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ کے ساتھ وابستہ ہے جس کی تفصیل کا بیان موقع نہیں ہے۔ بینوا وتوجروا و علی اللہ اجرکم ۱۲

پیغمبر اسلامؐ کا پیغام امن و سلام

مولانا زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی قاضی شہر و خطیب جامع مسجد میرٹھ

فتنہ و فساد کی ان اندھیری گھٹاؤں میں، جبکہ افق پر کوئی ستارۂ امید نظر نہیں آتا۔ ظلم و طغیان کی ان ہولناک موجوں میں جبکہ کشتی مراد پاش پاش ہو کر آخری جھکولے کھا رہی ہے، نومیدی و یاس کے ان جھکڑوں میں جبکہ گلشن آرزو کی آخری کلیاں بھی بکھر گئی ہیں، آپ کو زمانۂ جاہلیت کا صحیح تصور کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئیگی اگر آپ تاریخ کی سوئی کو چودہ سو سال پیچھے گردش دے دیں۔

دنیائے جاہلیت | یہ ایران ہے، یہاں فحاشی و زناکاری جزو دینی بنادی گئی ہے، "دین مزدکی" نے عصمت و عفت کی چادر انسانیت کے چہرہ سے اتار پھینکی ہے عوام کی بہو بیٹیوں کی عزت، امراء کی شہوت پرستی کے ہاتھوں کا کھلونا بن رہی ہے

یہ یونان ہے، یہاں غلاموں کو انسانیت کے ابتدائی "حق زندگی" سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ آقاؤں کی پیشانی کی ہر شکن ان کے لئے زنجیر پا بن سکتی ہے ذرا ذرا سے قصوروں پر بپھرے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دینا، اور غلاموں کی ہڈیوں کے گوشت سے جدا ہونے کا منظر دیکھنا ارکان حکومت کا ایک دلچسپ تماشا ہے۔ کمزور بچوں کو بھی یہاں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، پہاڑ کی چوٹی سے غار کی گہرائی تک ان کی منزلِ زندگی کو مختصر کر دیا گیا ہے۔

یہ ہندوستان ہے، یہاں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کرکے حقوقِ انسانیت کو صرف تین ذاتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے، بیچارہ اچھوت مذہبی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور عبادت گاہوں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔

یہ ارضِ فلسطین ہے یہاں یہودیوں نے نحن ابناء اللہ واحباءہٗ کا نعرہ لگایا ہے بنی اسرائیل ہی ان کے زعم میں خدا کے لاڈلے بیٹے ہیں اور کسی کو اس کے فضل و کرم کے سفرۂ عام سے ایک ریزہ اُٹھانے کی بھی اجازت نہیں۔

پھر اصولِ انسانیت کی اس تحقیر، اور اخلاق و مدنیّت کی اس تذلیل ہی پر بس نہیں۔ بلکہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ انسانیت کے وجود ہی کو ختم کردیا جائے۔

ارضِ فلسطین یہودیوں اور عیسائیوں کے خون سے لالہ زار ہورہی ہے نصرانی حکومت یہودیوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتی ہے، یہودیوں کا ملی وجود تسلیم کرنے سے اس نے انکار کردیا ہے ان کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے شعائرِ مذہبی کو آزادانہ انجام دے سکیں۔ یہودیوں نے شہرِ "صور" کا محاصرہ کرکے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ کردیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ "جنگ روم و ایران" میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہونے والے اسی ہزار عیسائی قیدیوں کو خرید کر ان کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کیا ہے (محمد المثل الکامل جاد مولیٰ بک المصری)

مدائن سے قسطنطنیہ تک کی سرزمین وقت کی دو سب سے بڑی شہنشاہیتوں کی جوع الارض کا لقمہ بنی ہوئی ہے، تہذیب پامال ہورہی ہے، شرافت سر پیٹ رہی ہے، انسانیت خون کے آنسو رو رہی ہے مگر شہنشاہیت کا سر پرغرور اونچا ہورہا ہے اور وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آبادیاں اُجڑ رہی ہیں، گھر لٹ رہے

ہیں، کھیتیاں پامال ہو رہی ہیں مگر انسانوں کی کھوپڑیوں پر قصر قیصری و ایوان کسروی کی شان دار بنیادیں اٹھائی جا رہی ہیں۔

"عرب" سرزمین حرم کا حال نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں، بلکہ سب سے بدتر ہے ایام العرب کا ایک سلسلہ ہے جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ میں پھیلا ہوا ہے۔ جنگ و جدال، قتل و خون، سلب و نہب مایۂ فخر و ناز ہے، امن و اطمینان، آرام و سکون باعث شرم و عار، قمار بازی فخر کی بات ہے، شراب نوشی عزت نفس کی دلیل ہے، زناکاری قابل تحسین کارنامہ ہے، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عظمت و شرافت ثبوت ہے۔

ادب جاہلی کی شہادت | اگر یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ کا لٹریچر، اس زمانہ کی تہذیب و اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے تو سنئے! بنی قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے۔

انا محیوک یا سلمیٰ فحیینا وان سقیت کرام الناس فاسقینا

اے سلمیٰ (معشوقہ شاعر) ہم تجھے سلام کرتے ہیں تو بھی ہمیں سلام کر اور اگر تو سرداران قوم کی تواضع شراب سے کرتی ہے تو ہمیں بھی شراب پلا۔

اب دوسرا شاعر جھوم کر کہتا ہے:۔

الا ھبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں، اپنا شراب کا پیالہ لے کر اٹھ اے محبوبہ اور ہمیں صبوحی پلا۔ اور دیکھ اندرین کی شرابوں میں سے کوئی باقی نہ رکھ۔

اب اور شاعر ابو کبیر ہذلی فخریہ بیان کرتا ہے:۔

ممن حملن بہ وھن عواقد حبک النطاق فشب غیر مھبل

میں ان جوانوں میں سے ہوں جن کی ماؤں سے زبردستی ہمبستری کی گئی لہٰذا وہ جوان ہوئے اس حال میں کہ چھریرے بدن کے ہیں۔

اور رئیس الشعراء امرؤ القیس نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ومثلك حبلیٰ قد طرقت ومرضع   فالهيتها عن ذی تمائم محول

اور تجھ جیسی بہت سی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں ہیں جن کے پاس میں رات کے آخری حصے میں پہنچا اور انھیں اپنے شیر خوار بچوں سے غافل کر دیا۔

وہ اک بنی ہمثل مازنی اپنی ہوس جنگ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

اذا استنجدوا لم يسألوا من دعاهم   لاية حرب ام بای مکان

میں ان بہادروں میں سے ہوں جب کوئی ان سے مدد مانگتا ہے تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کس جنگ کے لئے اور کہاں

حصین بن ہمام مری کہتا ہے:۔

نفلق هاما من رجال اعزة   علينا وان كانوا اعق واظلما

ہم ذی عزت لوگوں کے سروں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اگرچہ وہ بڑے ظالم و جابر ہوں

بنی عقیل کا ایک شاعر اپنے عزیزوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:۔

ونبكي حين نقتلكم عليكم   ونقتلكم كانا لا نبالی

ہم تمہیں قتل کر دینے کے بعد تم پر روتے ہیں مگر جب قتل کرتے ہیں تو کوئی پروا نہیں کرتے۔

سوار بنی مضرب سعدی کہتا ہے:۔

وانی لا ازال اخا حروب   اذا لم اجن كنت مجن جان

میں ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہوں، اگر خود ظلم نہیں کرتا تو ظالموں کا سپر بن جاتا ہوں۔

ندائے صفا ظلم وستم، جور و جفا، قتل و غارت، سلب و نہب، عیاشی و فحاشی، عشرت پسندی و شہوت پرستی کی اس دنیا میں یکایک ایک صدائے حق بلند ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کا ایک مقدس بندہ "حراء" کی خلوت راز سے باہر آتا ہے اور صفا کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے:۔

یَاأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ	اے افراد نسل انسانی، تم (اخوت و محبت
خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَّخَلَقَ	کے رشتہ کو توڑتے ہو) اپنے اس پروردگار
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک اصل سے
رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَاءً	پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا

کیا پھر ان دونوں کی نسل سے گروہ در گروہ مرد اور عورتیں پیدا کیں (جو سطح ارضی کے مختلف حصوں میں پھیل گئی)

جب تمہارا پیدا کرنے والا ایک ہے، تمہاری اصل و نسل ایک ہے، تمہاری حقیقت و ماہیت ایک ہے تو پھر، ملک و وطن کی حد بندی سے، رنگ و روپ کے فرق سے، غربت و امارت کے امتیاز سے یہ تزاحم و تصادم کیوں؟

اس آیۃ کے ذیل میں صاحب روح البیان لکھتے ہیں:۔

تقویٰ کے حکم کو جو اس واقعہ پر مرتب کیا گیا تو اس واسطے کہ یہاں انسانوں کو اپنے اہل خاندان اور اپنے ابناء جنس کے حقوق کی حفاظت کے بارہ میں خداوند جل و علیٰ سے ڈرنے کا حکم دینا تھا اور اس واقعہ کو اس کی تمہید بنانا تھا، گویا کہ یہ فرمایا گیا۔

"اے انسانو! جس پروردگار نے تم سب کو ایک سلسلہ میں جکڑ دیا ہے اور ایک جڑ کی مختلف شاخیں بنادیا ہے اس پروردگار سے تعلقات باہمی کے حقوق کی ذمہ داری کے بارہ میں ڈرو۔ ان حقوق کا پورا پورا خیال رکھو اور ان سے غافل نہ ہو" (روح البیان دوم صـ۱۵۹)

پھر چونکہ خطاب تمام کائنات انسانیت سے کرنا تھا اور سب کو ایک اخوۃ انسانیہ کے رشتہ میں جکڑنا تھا لہذا قرآن کریم نے "نفس واحدۃ" فرمایا آدم نہیں فرمایا اس لیے کہ مختلف اقوام وملل کے درمیان انسانی گھرانے کے جداعلیٰ کے متعلق اختلاف رائے ہے یہود اور جمہور اہل اسلام نسل انسانی کی ابتدا آدم (علیہ السلام) سے مانتے ہیں بعض دوسری قومیں دوسری شخصیتوں کا نام لیتی ہیں۔ مثلاً اہل ہند برہما کو زنجیر انسانیت کی پہلی کڑی بتاتے ہیں۔ حکمار مغرب چند اصول کو خاندان انسانیت کا مبدأ قرار دیتے ہیں (تفسیر المنار سورۃ النساء)

بہرحال اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ "حقیقت انسانیت" تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہے لہذا قرآن کریم اس وحدت حقیقت ہی کی طرف متوجہ کرکے ان سے باہمی الفت ومحبت کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی شخصیت کی تعینی کرکے دعوۃ اخوہ کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔

پھر اس نے بتایا کہ تم معرفت وشناخت کی آسانی کے لئے خاندانوں اور کنبوں کی حدبندیاں قایم رکھ سکتے ہو مگر انھیں کسی طرح عزت وذلت، برتری وکمتری کا معیار نہیں بنا سکتے، عزت وذلت اور برتری وکمتری کا معیار تو صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی اور بس!

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس نے تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے

اس نے اعلان کر دیا کہ اگر حقیقی بلندی و برتری کی تمنا ہے تو اس کا طریقہ صرف ایک ہے اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے نیازمندانہ جھک جاؤ، اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرو، اس کے کمزور اور ستم رسیدہ بندوں کی مدد کرو اور برائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ
رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا
مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ

اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ہر تکلیف پر صبر کیا، نمازوں کو ان کے آداب کے ساتھ ادا کرتے رہے اور جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا اس میں سے کچھ پوشیدہ و علانیہ ہماری راہ میں خرچ کرتے رہے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے رہے تو یاد رکھو یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے

اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی، محبت کا سلوک کرنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اگر کوئی ایسا کر سکے تو یہ نیکی و سعادتمندی کا اونچا مقام ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ
ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، فَإِذَا
الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ
كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا

نیکی اور بدی کا درجہ برابر نہیں ہو سکتا، برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دو، اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو تم دیکھو گے کہ اچانک تمہارا دشمن تمہارا دلی دوست

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ

بن گیا ہے البتہ انسانیت کے اس بلند مقام پر وہی پہنچ سکتا ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے اور جس کی قسمت میں نیکی وسعادت کا حظ عظیم ہو۔

اس نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظلم وشقاوت کی دنیا کو امن وسعادت کا گہوارہ بنانے کے لئے دنیا میں بدامنی وخون ریزی کے جو اسباب ہوسکتے ہیں ایک ایک کرکے ان کو ختم کیا۔

شہنشاہیت | دنیا میں فتنہ وفساد کا بڑا سرچشمہ "شہنشاہیت" رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قصر شاہی کی آبادی ورونق کے لیے رعیت کی جھونپڑیاں ہمیشہ اُجڑتی رہی ہیں۔ خدا کی زمین اس کے بندوں کے خون سے اس لئے سیراب ہوتی رہی ہے تاکہ بادشاہوں کا نخل آرزو برگ وبار لائے۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے سب سے پہلے فتنہ کی اس جڑ کو صاف کیا

وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔

اور خدا کو چھوڑ کر، ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا پروردگار قرار نہ دے

دنیا خدا کا ملک ہے اور حکم بھی یہاں خدا ہی کا جاری ہوگا۔

لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ

اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں حکم

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

صرف خدا ہی کا چل سکتا ہے۔

یہاں تک کہ جب وفد بنی عامر نے آپ سے کہا اَنْتَ سَیِّدُنَا آپ ہمارے سردار ہیں تو آپ نے جواب دیا السید اللہ تبارک وتعالیٰ سردار تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اس پر ان لوگوں نے عرض کیا بہرحال شرف وعزت میں تو آپ ہم سے ملند

وبرتر ہیں ہی توآپ نے جواب دیا ہاں یہ تم کہہ سکتے ہو۔

اسی لئے اس وقت کی شہنشاہیت کے مظہر اتم ، اور آقائیت کے مجسمہ کامل "کسریٰ" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے :۔

اذا مات کسریٰ لا کسریٰ بعدہٗ　　اس خاندان کسروی کے بعد اب اور کسریٰ نہ ہوگا۔

سرمایہ داری | سرمایہ داری بھی امن عالم کے لئے بڑا فتنہ رہی ہے۔ ساہوکاروں کی مجلس نشاط کا ساغر احمری ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کے خون سے تیار ہوتا رہا ہے پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے زبان وحی ترجمان سے انسانی سوسائٹی کا ایسا نقشہ کھینچا جس میں ہر انسان کو خدا کے پیدا کیے ہوئے وسائل معیشت سے استفادہ کا موقع دیا گیا اور جد وجہد کے بعد جو کچھ حاصل ہوا اس میں اس کا حق ملکیت وانفاق بھی تسلیم کیا گیا مگر طرق اکتساب وانفاق پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جس سے دولت چند افراد کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ　　یہ اس لئے کیا گیا تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں ہی گردش کرتی نہ رہ جاتے

جو لوگ اسلام کے اس عادلانہ نظام معیشت سے بغاوت کریں اس کے ممنوعہ طریقوں سے دولت جمع کریں، ذاتی تعیش وتنعم پر اسے خرچ کریں اور سوسائٹی کے محتاج وضرورتمند طبقہ کو اس سے محروم رکھیں ان کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دی گئی۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ　　جو لوگ چاندی سونے کے خزانے جمع کرتے

وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ	ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں
فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ	کرتے تو آپ انھیں عذاب الیم کی بشارت دیدیجئے
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ	بے محل دولت کا استعمال کرنے والے
الشَّيٰطِيْنِ	شیطان کے بھائی ہیں

سرمایہ داری کے دو بڑے مظاہر ساہوکاری اور جاگیر داری ہیں۔ اسلام نے احتکا اکتناز اور اس کے وسائل سود، قمار وغیرہ کو ممنوع قرار دے کر اور وراثت، زکوٰ عشر وغیرہ تقسیم دولت کی صورتوں کو لازمی قرار دے کر، ان دونوں کے پنپنے ک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

وطنیت وطنیت بھی ہمیشہ سے ایک ایسا بت رہی ہے جس پر ہزارہا انسانوں کے سروں کے چڑھاوے چڑھتے رہے ہیں" جرمنی" جرمنوں کے لئے ہے، انگلستان انگریزوں کے لئے ہے، ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہ یہ ایسے نعرے ہیں کہ آج بھی جن سے دنیا کی فضا گونج رہی ہے اگر ان نعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قوموں کو یہ حق نہیں کہ وہ کمزور قوموں کے اسباب حصول دولت پر اپنی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہو جائیں تو یہ نعرے درست ہیں، لیکن اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور وطن کے نام پر خدا کی مخلوق میں منا پیدا کی جائے اور خدا کے بندوں کو اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے کسی حصہ سے جا طریقوں سے فائدہ اٹھانے سے روکا جائے تو اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام کا اعلان

لا فضل لعربی علی عجمی ولا	عربی النسل کو عجمی النسل پر اور سرخ رنگ
لاحمر علی اسود کلکم من آدم	والے کو کالے رنگ والے پر کوئی برتری

وآدم من تراب	حاصل نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو

(آ)دم علیہ السلام کا مایہ خمیر مٹی ہے۔

لیدعن رجال فخرھم باقوام	لوگ اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں ایسا
انما ھم فحم من فحم جھنم	کرنے والے جہنم کا کوئلہ بنیں گے۔
لیس منا من دعا الی عصبیۃ	وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے عصبیت
ان الارض للہ	کا نعرہ لگایا۔ زمین اللہ ہی کی ہے۔
وجعلنا لکم فیہا معائش	ہم نے تم سب کے لئے زمین میں سامان
	معیشت پیدا کر دئے ہیں۔

(مذ)ہبی منافرت | مذہب کے نام پر بھی، جو دنیا میں امن و صلح کا پیغام ہونا چاہئے، (جنگ)ـ و جدل کے نعرے بلند ہوتے رہے ہیں بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) (کے) وقت بھی فضا ان نعروں سے گونج رہی تھی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی:۔

"ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی ان کے نزدیک پرمیشر صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا خدا کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور نہیں کے بعض خاندانوں کے لئے محفوظ تھا زردشت خاک ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں خدا کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندان سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ پیغام محمدی ہی ہے جس نے پورب پچھم اتر دکن ہر طرف خدا کی آواز سنی اور بتایا کہ خدا کی رہنمائی کے لئے ملک قوم اور زبان کی تخصیص

نہیں۔ اس کی نگاہ میں فلسطین، ایران، ہندوستان اور عرب سب برابر ہے ہر جگہ اس کے پیغام کی بانسری اور ہر طرف اس کی رہنمائی کا نور چمکا"
قرآن کریم نے اس زمانہ کے ارباب مذہب کے تعصب وغرور کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى	یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین بے
عَلٰى شَىْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى	بنیاد ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں
لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ وَّهُمْ	کا دین بے اصل ہے حالانکہ دونوں کے
يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ	پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ اسے پڑھتے
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ	ہیں۔ ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی

جو مقدس کتابوں کا علم نہیں رکھتے۔
پھر ان مذہبی گروہوں کے ان غلط خیالات کی تردید اس طرح فرمائی:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ	کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خدا کے
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا	عذاب سے ڈرانے والا نہ آیا ہو اور بلاشبہ
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ	ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث

کیا جس کا پیغام یہ تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے رہو اور شیطان سے بچتے رہو۔
پھر حکم دیا گیا کہ پیغام محمدی کے ہر قبول کرنے والے کے لئے، تمام پچھلے پیغمبروں اور اُن کے صحیفوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلم نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	پرہیزگار وہ ہیں جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ — ہیں اور ان تمام کتابوں پر جو اس سے پہلے اُتریں۔

پھر خدا کے ان مقدس بندوں میں نبی ہونے کے لحاظ سے، کسی قسم کا فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ — (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے) سب ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اقرار کیا کہ ہم اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ شمع نبوت کی یہ روشنی جو آج عرب کے ذروں کو جگمگا رہی ہے کوئی نئی روشنی نہیں، بلکہ مختلف عہدوں میں یہی روشنی، زیتون کے مرغزاروں کو اور ہمالیہ کے کہساروں کو بھی روشن کر چکی ہے اور اب "پیغام محمدیؐ" کے نظر افروز فانوس میں ساری دنیا کو دعوت تماشا دے رہی ہے اور جمال حقیقت اور چشم شوق کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں چھوڑ رہی۔

بے شک آفتاب نبوت اپنی عالم افروز اور جہاں تاب کرنوں کو دنیا کے چپہ چپہ میں بکھیرتا ہوا طلوع ہو چکا ہے، اس لئے ڈوبے ہوئے چاند اور تاروں سے رہنمائی کی جستجو بیکار ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ — در حقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

تاہم آفتاب کا کام یہ ہے کہ وہ اندھیرے کو دور کر دے اور دنیا کو روشنی سے

معمور کردے، لیکن اگر کوئی چادر میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے اور روشنی سے فائدہ ا
پسند نہ کرے تو اس کی چادر کو کھینچ کر اتار پھینکنا آفتاب کا کام نہیں۔

نورِ اسلام نے اپنی ظلمت پاش شعاعوں سے، حق و باطل، معروف و
طاعت و معصیت، عدل و ظلم میں امتیاز پیدا کر دیا۔ ہر شخص کے لئے جس کو د
بصیرت حاصل ہے اب یہ ممکن ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی شاہراہ پر چل کر منز
حقیقت کا سراغ پائے لیکن اگر کوئی عقل کا اندھا کفر و طغیان کی گھاٹیوں میں
ٹامک ٹوئیاں مارنا پسند کرے تو اس پر کوئی جبر نہیں

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ	دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں، کیونکہ حق
مِنَ الْغَيِّ	اور باطل میں کھلا امتیاز قائم ہو چکا ہے
اِنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ	ہم نے یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لئے
بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ	آپ پر سچائی کے ساتھ اتاری ہے سو جس
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا	کسی نے راہ ہدایت قبول کی تو اپنے فائدے
وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ	کے لئے اور جس کسی نے گمراہی اختیار کی

تو اپنے نقصان کے لئے اور اے پیغمبر آپ ان کے ذمہ دار نہیں۔

ایک اور جگہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوشِ دعوت کی مزاحمت کی جاتی

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي	اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین پر سب
الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ	بسنے والے ایمان لے آتے (لیکن اس کی
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ	حکمت کا یہ تقاضا نہیں) تو پھر کیا تم لوگو

کو مجبور کر دو گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

اللّٰہ ، اگر کوئی فرد یا گروہ صداقت کی اس روشنی ہی کو گل کر دینا چاہے، یا دوسرں سے جبراً استفادہ نہ کرنے دے، تو بے شک اس کی مزاحمت کی جائے گی ص کو اختیار ہے کہ اپنی آنکھیں بند کرلے اور ٹھوکر کھاکر گر پڑے مگر دوسروں نکھوں پر پٹی باندھنے کا حق کسی کو نہیں۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ	کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو منہ سے
بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ	پھونکیں مار مار کر بجھا دیں مگر اللہ تعالیٰ کا
کَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ	فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہیگا

ہ کافر اسے پسند نہ کریں۔

انتقام در انتقام | انتقام در انتقام کا چکر کبھی ہمیشہ دنیا میں خون کے طوفان برپا کرتا رہا ہے۔ خود جزیرۃ العرب بعثت محمدی سے پہلے اس طوفان کی موجوں میں گھرا ہوا تھا گاہوں میں ، میلوں میں ، یا شاعری کی مجلسوں میں کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تھی سیکڑوں تلواریں نیام سے تڑپ کر نکل آتی تھیں اور پھر برسوں اور قرنوں تک ن کی برق انسانی جاری رہتی تھی۔

انتقام کے اس مجنونانہ جذبہ میں ، مجرم و غیر مجرم اور حق و ناحق کا کوئی فرق ئی نہ رہتا تھا اسلام نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ خدا کی مخلوق درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کا فیصلہ خدا ہی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ں حکومت کے ذریعہ ہونا چاہئے جو اس قانون کے نفاذ کے لئے قایم ہوئی ہو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ	حکومت اور فیصلہ کا حق صرف خدا ہی کو

حاصل ہے۔

ایسی حکومت کے ارباب بست وکشاد کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ	یہ وہ جماعت ہے کہ اگر ہم انھیں زمین پر
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا	صاحب اقتدار بنا دیں تو ان کا کام یہ ہوگا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ	کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں، بھلائی

کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔

قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حق نہیں دیا گیا چنانچہ جب اسلام کے نامور خلیفہ حضرت عمر فاروق رضؓ کو ابولولو نامی ایک غلام نے جفینہ نصرانی اور ہرمزان پارسی کی سازش سے شہید کر دیا اور جوش غضب میں وارفتہ ہو کر عبید اللہ بن عمر نے اپنے باپ کے انتقام میں ہرمزان کو تہ تیغ کر دیا تو قائم مقام خلیفہ حضرت صہیب کے حکم سے انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور جب تک ان کی طرف سے دیت ادا نہ کر دی گئی رہائی نہ ہو سکی۔

پھر ایک عام حکم دیا گیا کہ دشمن ہوں یا دوست، اپنے ہوں یا غیر، مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی سے بھی برتاؤ کرتے وقت عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دیں

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَنْ	کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس سے بے انصافی
لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ	پر آمادہ نہ کر دے عدل کو ہاتھ سے نہ دو کہ وہ
لِلتَّقْوٰی	پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص قانون کے دائرہ میں رہ کر قانون کے ذریعہ جو زیادتی اس پر کی گئی ہے اس کا بدلہ لے سکتا ہے

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا	جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی

عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر کی ہے۔

پھر بھی عفو و درگزر اور مرحمت و مغفرت کا درجہ بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے:۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ
اور درحقیقت جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو بے شبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے

فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ
اور جس نے معاف کیا اور صلح کی راہ اختیار کی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے

خود جناب رسول اکرم صلعم کی حیات طیبہ اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہے۔ دشمنوں نے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو گالیاں دیں، آپ کو دیوانہ و مجنون کہا، آپ کا مذاق اڑایا، آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے، آپ کے جسم اطہر پر نجاست پھینکی، آپ کی پیشانی انور کو زخمی کیا آپ کے قتل کی سازش کی اور آخرکار محض اس جرم میں کہ آپ خدا کے گھر میں خدا کا نام کیوں لیتے ہیں آپ کو راتوں رات مکہ سے نکل کر مدینہ جانے پر مجبور کردیا اور پھر وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بار بار قتل کی سازشیں کی گئیں، عہد نامے توڑے گئے، بدر، احد اور خندق کے معرکے برپا کئے گئے لیکن جب قدرت کے امتحان کی مدت ختم ہوئی اور رب العزت کے دست انتقام کو جنبش ہوئی یہی مجبور و مقہور ستم دیدہ و جفا کشیدہ "مہاجر" اسی کعبہ میں جہاں سے انھیں رب کعبہ کا نام لینے اور اس کی بارگاہ نیاز میں سر جھکانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس شان سے مجلس آرا ہوا کہ ہزار ہا گردنیں اس کے سامنے عاجزانہ جھکی ہوئی تھیں ہزار ہا زبانیں اس کی عظمت و سطوت کا اعتراف کررہی تھیں اور ہزار ہا کان اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے اس کی جنبش لب پر لگے ہوئے

تھے، تو تمہیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے جان و مال، عزت و آبرو، دین و ایمان کے دشمنوں کے متعلق کس فیصلہ کا اعلان کیا؟ اس نے اعلان کیا:۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ	آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو جو چاہو کرو

استیلاء کامل کے بعد یہ پہلا پیغام امن و سلام تھا پھر حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں جو امت کے نام آپ کا آخری پیغام تھا آپ نے جنگ کے دیوتا اور انتقام کے بھوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پا بہ زنجیر کر دیا آپ نے فرمایا:۔

الا ان کل شئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع ودماء الجاھلیۃ موضوعۃ واول دم اضعہ من دماء نا دم ابن ربیعہ	سنو، میں جاہلیت کی تمام رسمیں اپنے پاؤں تلے کچل دیتا ہوں اور انتقام خون کی رسم بھی اپنے پاؤں تلے کچلتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے بھائی ربیعہ ہی کے خون کے مطالبہ کو ختم کرتا ہوں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلق عظیم اور ذکر جمیل آج تیرہ سو سال گذرنے کے بعد بھی دنیا کی امن پسند اور صلح جو قوموں کے لئے ایک منارۂ روشنی ہے۔ ہر قوم و ملت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آدمی اس روشنی میں اخلاق و انسانیت اور صلح و امن کی گم شدہ منزل کا سراغ پا سکتا ہے چنانچہ اگر ہر امن پسند اور صلح جو کے لئے فمن عفی واصلح فاجرہ علی اللہ (جس کسی نے عفو و صلح کی راہ اختیار کی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے)، کی بشارت سنائی گئی تو آپ کو وان لک لاجرا غیر ممنون وانک لعلی خلق عظیم (آپ کے لئے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں کیونکہ آپ کا اخلاق نہایت بلند ہے)، کی کرامت عطا فرمائی گئی۔ اس لئے کہ:۔

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجر من عمل بھا	جس کسی نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اسے ان سب لوگوں کے برابر ثواب ملے گا جو اس طریقہ کو اختیار کریں گے

فصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وبارک وسلم

نانا راؤ پیشوا

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

نانا راؤ پیشوا کا نام مہاراجہ دھندو پنت تھا۔ مرہٹہ سردار مادھو نرائن راؤ بھٹ کے صاحبزادے تھے پیشوا خاندان سے تعلق تھا۔

ولزلی ہندوستان آیا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے حکمرانوں کو کمزور کر دیا جائے تاکہ انگریزی طاقت سے ٹکر نہ لے سکیں۔

اس نے "عہد معاونت" مدد کا طریقہ اختراع کیا جو راجہ اسے قبول کرلے وہ ہمیشہ کے لئے ختم اور جو نہ قبول کرے اسیر انگریزی فوج کشی مگر اس کا مطلب دکھاوے کا یہ تھا کہ جو حکمران اسے قبول کرے انگریز اس کے معاون ہوں گے فوجی مدد دیں گے۔ دشمن کا مقابلہ ہو یا خود ملک کے اندر چپقلش یا بغاوت۔ اس مدد کے بدلے حکمران کا فرض تھا کہ وہ ملک کا کچھ حصہ کمپنی کو نذر کرے اور معاون انگریزی فوج اپنے ملک میں رکھے اگر مدد قبول کرانے والوں میں جھگڑا ہو تو کمپنی پنچ بنے گی اور اس کا فیصلہ ماننا پڑے گا وغیرہ یہ تھا لارڈ ولزلی کا جال ٹیپو سلطان کے سامنے یہ جال پھینکا گیا مگر اس نے اپنی جان پر کھیلنا گوارا کیا اگر نظام اور مرہٹہ ولزلی کا ساتھ نہ دیتے تو ٹیپو سلطان فرنگیوں کو خلیج بنگال میں ڈھکیل چکا تھا۔ پھر اپنوں کی غداری سے سلطان میدان جنگ میں کام آیا نظام انگریز کے

دوست بن چکے تھے مرہٹوں کی خلش ولزلی کو باقی تھی۔ اس وقت باجی راؤ پیشوا مرہٹوں کا سردار تھا ولزلی کے ارادے نے مرہٹوں کو فکر مند کیا وہ متفقہ تقدیر آزمائی پر آمادہ ہوگئے مگر مہاراجہ گائیکواڑ اور ہلکر شریک نہ ہوتے۔ انگریزوں نے پیشوا پر حملہ کیا مہاراجہ دولت راؤ سندھیا پیشوا کی مدد کو آیا مہاراجہ ہلکر انگریزوں سے جا ملا نتیجہ یہ ہوا کہ پیشوا اور سندھیا شکست کھا گئے اور مجبوراً "عہد معاونت" قبول کرنا پڑا باجی راؤ جب پونا پہنچا تو اس کا مزہ چکھنا پڑا پھر اس نے کروٹ لی ولزلی کا پھندا گردن سے نکالنا چاہتا تھا۔ سندھیا نے بھونسلہ کو مدد کے لئے پونا بلایا۔ مگر فوج کے افسر یورپی تھے ولزلی نے پوری قوت مرہٹوں کے مٹانے کے لئے لاکھڑی کی مقابلہ ہوا یورپین افسر نمک حرامی کر گئے نتیجہ مرہٹوں کی شکست تھا ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور بھونسلہ نے انگریزوں سے صلح کر لی ۱۸۱۸ء میں باجی راؤ سر جان میلکم کی سپردگی میں آگئے اور پونا چھوڑ کر بٹھورا کانپور میں اقامت پذیر ہوئے ۸ لاکھ روپیہ پنشن مقرر ہوئی باجی راؤ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس نے اپنے عزیز مادھو نراین راؤ بھٹ کے صاحبزادے دھوندو پنت کو گود لے لیا مادھو نرائن کا وطن "برہم ورتا" تھا دھوندو پنت کی عمر ۲½ سال کی تھی۔[1]

باجی راؤ نے ان کو متبنیٰ کیا اور رسوم بھی ادا کی گئیں نام نانا راؤ رکھا گیا۔

تعلیم و تربیت | باجی راؤ نے نانا راؤ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی انگریزی میں معقول استعداد تھی کتب بینی کا بڑا شوق تھا تاریخ سے دل لگاؤ تھا۔

اوائل عمری میں انگریز حکام سے گہرے تعلقات تھے بڑے بڑے ڈنر ان کے یہاں ہوتے اور افسران ان میں شرکت کرتے تھے۔[2]

---

[1] کانگریس کے ساٹھ سال صفحہ ۴۴ [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل

۱۸۵۱ء میں باجی راؤ نے نانا راؤ کو اپنا گدی نشین کیا اس کے ایک سال بعد ۱۸۵۲ء میں وہ انتقال کر گئے یہ زمانہ لارڈ ڈلہوزی کا تھا۔ نانا راؤ کے کلکٹر کانپور ملنے والے تھے انھوں نے عظیم اللہ خاں کی تعریف کی چنانچہ نانا صاحب نے ان کو بلایا کچھ عرصہ میں تعلقات بے حد قایم ہو گئے

عظیم اللہ خاں کانپور مشن کالج میں مدرس تھے۔ تھے غریب گھرانہ کے جس انگریز کے یہاں ان کے باپ ملازم تھے اس نے ان کا رجحان طبیعت دیکھ کر مشن اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ ماسٹر گنگا دین وہاں مدرس تھے ان کی توجہ بھی زیادہ ہونے لگی محمد علی خاں جمی گرین ہم سبق تھے فارغ التحصیل ہو کر کالج میں ہی منسلک ہو گئے[1] عظیم اللہ خاں کو نوکری چھڑوا کر اپنی ریاست کا سربراہ کار کر دیا۔

پنشن کی ضبطی لارڈ ڈلہوزی نے جہاں ریاستیں ضبط کیں وظائف پر بھی ہاتھ مارا نانا صاحب کو متبنی تسلیم ہی نہیں کیا اور پنشن باجی راؤ کی ضبط کر لی ۸ لاکھ روپیہ کی کمی کا اثر نانا صاحب نے بہت لیا عظیم اللہ خاں نے یہ تجویز نانا راؤ کے سامنے رکھی کہ میں انگلستان جا کر ڈائرکٹران کے سامنے لارڈ ڈلہوزی کا ظالمانہ حکم سامنے رکھوں گا امید ہے وہاں ہماری استدعا منظور ہو جائے چنانچہ نانا صاحب نے ۵ لاکھ روپیہ اور اپنے بھائی بالا صاحب گوکھلے اور محمد علی خاں عرف جمی گرین کو عظیم اللہ خاں کے ساتھ انگلستان روانہ کیا یہ جب وہاں پہنچا شاندار ہوٹل میں مقیم ہوا اور بڑے پیمانہ پر دارالامرا کے لارڈس کی دعوتیں کیں اور روپیہ مثل پانی کے بہایا مشہور دکیں کیے گئے ان کے رئیسانہ ٹھاٹ نے "انڈین پرنس" کے نام سے شہرت عظیم اللہ کو دی۔

---

[1] جمی گرین (مصنف علیگڈھ)

عظیم اللہ خاں ایک حسین افغانی تھا جوان العمر امرائے انگلستان کی صاحبزا
جھک پڑیں خط و کتابت ہونے لگی یہ دامن بچا گیا۔ اس زمانہ میں ستارہ کے راجہ
کی طرف سے رنگو جی باپو جی آئے ہوئے تھے وہ بھی ناکامیاب ہوئے اور عظیم ا
کی تمام مساعی خاک میں مل گئیں ۵ لاکھ روپیہ برباد گیا عظیم اللہ براہ قسطنطنیہ ہندو
۱۸۵۵ء میں روانہ ہوا قسطنطنیہ میں کچھ عرصہ قیام کیا وہاں سے کریمیا گیا ان دنوں وہاں ر
اور انگریزوں میں جنگ ہو رہی تھی ۱۸ جون ۱۸۵۵ء کو انگریزوں نے حملہ کیا شکست یا
ہوئے یہ کریمیا میں لندن ٹائمس کے نامہ نگار سر ولیم ہاورڈ رسل کے خیمہ میں مقیم تھے[1] وہا
سے لوٹ کر قسطنطنیہ آئے جس ہوٹل میں ٹھہرے چند روسی افسران بھی مقیم تھے۔ ان
تبادلہ خیالات ہوا۔ انھوں نے کہا تم انگریزوں کا بچہ ہندوستان سے کیوں نہیں نکا
اگر انقلاب کی تیاری کرو ہماری حکومت ساتھ دے گی۔ چنانچہ ان کی رضامندی حا
ہوئے کچھ روسی پیچھے لگ گئے ایک نے ہندوستان آکر اپنا نام عبداللہ بیگ رکھا عظیم ال
اور محمد علی خاں روہیلکھنڈی ہندوستان واپس آئے مگر روسیوں کی باتوں کا اثر لے
ہوئے تھے نانا راؤ سے تمام روداد سفر بیان کی نانا کو پنشن کے بند ہونے کی اور انگریز
کی بے انصافی کی خلش تھی ہی وہ عظیم اللہ کے ہم رائے ہو گئے اور کمپنی کے راج کو سر زم
ہند سے کھونے کے درپے ہوئے[2] رنگو جی باپو جی ستارا واپس آیا اس نے اپنے علاقہ
میں انگریز کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

<u>انگریزی بیزاری کا سبب</u> | انگریز نے جنگ پلاسی کے بعد سے روپیہ کی لوٹ کھسوٹ اور
انگلستان کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے ہندوستانی صنعت کی پامالی۔ ریاستو

---

[1] دی وار آف دی کریمیا از ولیم رسل [2] محمد علی خاں جمی گمرین مصنف جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۸۱

لحاظ اس سے بڑھ کر ہندو مسلمانوں کے مذہبی رسوم میں مداخلت ہندوستان
اس کا تسلط تو ہو چکا تھا ایک ہی دسے کے مذہب رہ گیا تھا اس پر بھی ڈاکہ ڈالنے لگا
عیسائی مشنریوں نے رسائل بازی شروع کر دی ہر مذہب پر حملہ کرنے لگے ہندو
مذہب کے خاتمہ کے خواب نظر آنے لگے خیال یہ تھا اگر یہ لوگ عیسائی ہو گئے تو
ہندوستان کا دوامی پٹہ انگلستان کے حق میں ہو جائے گا مسلمانوں سے حکومت لے
لی تھی اور ان پر عتاب کی نظر تھی بھی زیادہ بلکہ بقول گارسان دتاسی
"جامع مسجد دہلی کو گرجا بنانے کے منصوبے ہو رہے تھے"
عیسائی مناد سے علماء بھڑ پڑے رسالہ بازی کا جواب رسالہ سے دینے لگے
مسلمانوں میں انگریز سے منافرت دن بدن بڑھنے لگی ہندو پنڈتوں نے بھی اپنی مقدس
کتابوں سے انگریز کے خلاف اشلوک پیش کرنا شروع کیا[1]
مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ (نواب چینا پٹن مدراس کا لخت جگر) نے
تاج و تخت کو چھوڑ کر کوچہ فقر میں قدم رکھا پیری مریدی کا شغل اختیار کیا اور سیاحت
کمر باندھی گوالیار آ کر محراب شاہ قلندر سے خلافت لی اور نصاریٰ سے جہاد کی
اجازت لے کر دلی آئے یہاں مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے مل کر آگرہ گئے مفتی
انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی وکیل صدر نظامت کے یہاں مقیم ہوئے ان کا گھر
انکا مرکز تھا مجلس علماء کی تشکیل کی وعظ اور تذکیر کا سلسلہ جاری کیا مسٹر جوزف
فرانسیسی مبلغ عیسویت شاہ صاحب کے ہمنوا ہو گئے بابو بنی پرشاد وکیل الہ آبادی
مدد تھے بقول مولوی طفیل احمد منگلوری دس دس ہزار ہندو مسلمان شاہ صاحب

---

[1] تاریخ بغاوت ہند

کے وعظ میں شریک ہوتے آگرہ سے کانپور آئے عظیم اللہ خاں ان سے ملے پھر لکھنؤ ہو کر فیض آباد گئے۔

جی ڈبلو فارسٹر "انڈین میوٹنی" میں جارلس نال کے حوالہ سے لکھتا ہے

"اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا اس مولوی کو انگریز حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصہ سے جانتے تھے شمالی مغربی صوبہ جات میں ظاہرہ مذہبی تبلیغ کی خاطر پھر چکے تھے لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا اپنے سفر کے دوران میں ایک عرصہ تک وہ آگرہ میں مقیم رہا حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے عرصہ بعد اس کا یقین ہوا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا وہ آزاد رہے اور لکھنؤ اور فیض آباد گئے جس وقت ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی ...... ایک طاقت ور فوج کے سپہ سالار بن گئے"

اسی طرح ہندوستان میں اور حضرات بھی انگریز کے خلاف عوام کو تیار کر رہے تھے اس کا اثر سرکاری ملازمین پر بھی پڑ رہا تھا۔

نانا راؤ اور عظیم اللہ نے وقت کا اندازہ کر کے بٹھور میں ایک جماعت کی تشکیل کی جس میں مرہٹے سردار تانتیا ٹوپی، منا بائی۔ تانتیا ٹوپی کے والد سری پانڈو رانگ راؤ بھٹ اور البرٹ میکسر فرانس کا جرائم پیشہ اور مسٹر گارڈن اور مولوی عبد اللہ صمد الصمدور اور مسماۃ عظیما وغیرہ شریک ہوئے میکسر انگریزی فوج میں ملازم تھا مگر وہ برٹش حکومت کا تختہ الٹ کر پھر فرانس کا اقتدار ہندوستان پر قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

نانا راؤ نے مرہٹوں اور مسلمانوں کی سادھو اور فقرا کی صورت میں ٹولیاں
کانپور سے پونا تک بھیجنی شروع کر دیں خود نانا ٹوپی جوگیانہ لباس میں طوفانی دورا
کرتے ہوئے افواج سرکاریں بددلی پھیلا آئے اور عظیم اللہ خاں نے رجواڑوں
اور نوابوں کے پاس سفیر روانہ کئے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ نے جاترا کے نام سے
ملک کا دورا کیا۔ واجد علی شاہ سے ملے وہ تو کانوں پر ہاتھ رکھ گئے۔ البتہ علی نقی
خاں ہمنوا تھے۔ دلی گئے نانا صاحب خود بادشاہ سے ملے مگر انہیں سکت نہ تھی مگر
نانا صاحب اور عظیم اللہ ہمت نہ ہارے۔ مولوی احمد اللہ شاہ سے مشورہ ہو چکا تھا
بغاوت کی اسکیم مرتب ہوگئی ملک آغاز ۱۸۵۷ء میں مثل بارود بن چکا تھا شتابہ کی
دیر تھی بارک پور میں فوجی سپاہی منگل پانڈے نے انگریزی اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی
فوجی آئین کی رو سے اس کو گولی کا نشانہ بنایا پڑا ہمراہی برخواست کر دئے گئے اس واقعہ
سے افواج سرکاری میں ہیجان پیدا ہوگیا اس کے بعد میرٹھ میں فوجی کمانڈر کی وجہ سے
فوج بگڑ گئی شعلے بھڑک اٹھے دور دور اس کی لپٹیں پہونچیں۔ دلی۔ لکھنؤ۔ کانپور نے ریڈ
اثر لیا مولوی احمد اللہ شاہ فیض آباد میں گرفتار کئے گئے تھے چھوٹ کر لکھنؤ آئے اور
نصف علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور نواب واجد علی شاہ کے صاحبزادے مرزا برجیس قدر زیر
نگرانی حضرت محل تخت پر بٹھا دئے گئے راجہ جواہر سنگھ راجہ مان سنگھ نواب مموخاں کی
کارفرمائی کو دخل تھا۔

کانپور۔ منشی رسول بخش کاکوروی جو تحریک انقلاب کے ایک رکن تھے ان کی کارگذاری
کی اطلاع مسٹر کارنگی کو مل گئی دھوکہ سے بلا کر مع ۲۲ نفوس کے پھانسی پر چڑھا دیا لکھنؤ
سے کانپور خبر پہنچی تیسرا رسالہ جس کے ساتھ توپ خانہ تھا وہ غصہ سے بے تاب ہوگیا اور

بنگلے حکام کے نذر آتش کئے اب اس کے ساتھ شہر کے انقلابی شریک ہوگئے۔

انقلابی تحریک میں کچھ قبل پھوٹ پڑ گئی ملک گو تیار ہو چکا تھا مگر بعض علاقے ہموار نہیں ہوئے تھے جس کا اثر بعد میں برا پڑا۔

سرکاری فوج جو حریت نواز ہو چکی تھی سیدھی کانپور سے بٹھور پہونچی وہاں سب سردار جمع تھے اس واقعہ کے گذرنے سے ان کی اسکیم میں کمزوری واقع ہوگئی تھی مشورے ہو رہے تھے کہ فوج نے جاتے ہی نانا راؤ پیشوا کو سلامی دی۔ اور تخت نشین کیا۔ ایک کانسل کی تشکیل ہوئی۔ عظیم اللہ خاں۔ تانتیا ٹوپی۔ بینا بائی۔ میکسر فرانسیسی بالا صاحب گوکھلے وغیرہ۔ نانا صاحب نے اس وقت دربار کیا۔ عظیم اللہ خاں نے تمام ہندوستان کا راجہ نانا صاحب کو قرار دیا اس رائے کو ہر ایک نے بطیب خاطر منظور کیا دوسرے دن نانا صاحب تزک و احتشام کے ساتھ کانپور رونق افروز ہوئے اور عظیم الشان دربار کیا گیا تمام عمائد شہر اور فوجی افسران شریک دربار ہوئے عظیم اللہ خاں دیوان بنائے گئے۔ نانا صاحب نے سبز جھنڈا لہرایا اور تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ

بہادر شاہ دہلی کا یہ جھنڈا ہے اور میں ان کا نائب ہوں بادشاہ ہمارے وہی ہیں" دربار میں سناٹا چھا گیا عظیم اللہ کی منشار کے خلاف نانا صاحب کا عمل تھا عظیم اللہ اور تانتیا ٹوپی تمام ہندوستان میں پیشوا کا راج ملوا رہے تھے مگر وقت کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے اور ایک تقریر معرکہ کی کی دربار میں ہر شخص جانبازی اور سرفروشی کے لئے تیار ہو گیا نانا صاحب نے فوج کا وزیر جنگ تانتیا ٹوپی کو مقرر کیا اور ان کی نائب بینا بائی تجویز ہوئیں بارہ ہزار فوج سوار پیدل معہ توپ خانہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی[1]

---

[1] تاریخ کانپور

کانپور کی سرکاری فوج کا کمانڈر جنرل ویلر تھا وہ یہ رنگ دیکھ کر اسپتال میں قلعہ بندی کر کے بیٹھ گیا۔ ننا بائی فوج کو لے کر حملہ آور ہوئی ۲۸ دن متواتر مقابلہ ہوتے رہے انگریزی فوج کو سخت نقصان اٹھانا پڑا آخرش جنرل ویلر نے ننا بائی سے کہا ہم ہتھیار ایک شرط پر ڈالنے کو تیار ہیں کہ ہم سب انگریزوں کو الہ آباد جانے دیا جائے ننا بائی نے تانتیا ٹوپی سے کہا اور عظیم اللہ خاں سے مشورہ ہوا پھر نانا صاحب کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا چنانچہ افسران نانا راؤ اور جنرل ویلر میں عہد و میثاق ہوا ویلر معہ دیگر انگریزوں کے کشتیوں پر سوار کر دیئے گئے جنرل ویلر کی کشتی آگے بڑھی مگر فوجی افسروں کو یہ صورت ناگوار گذری ادھر ماما صاحب گو کھلے اور البرٹ میکسر اور نانا صاحب کی داشتہ عظیما جوالا پرشاد نے کشتیوں پر توپوں سے بندوقوں کی باڑ لگوادی۔ عظیم اللہ خاں نے اپنی وعدہ خلافی کا بُرا اثر لیا اور وہ نانا صاحب سے بگڑ بیٹھے۔ جو انگریز بچ سکے وہ الہ آباد چلے گئے۔

کانپور میں نواب محمد علی خاں عرف ننّے نواب قرابت دار نواب معتمد الدولہ جو انگریز سے گٹھے ہوئے تھے ان کا گھر لوٹ لیا گیا۔ پھر شہر میں امن قایم ہو گیا مرہٹہ سردار تانتیا ٹوپی رانی جھانسی کی امداد کے لیے گئے نانا صاحب بٹھور میں مقیم ہو گئے اور انگریز کی طرف سے ان کو غفلت سی رہی۔ کامیابی پر محض رقص و سرود نے انگریز کو موقعہ دے دیا چنانچہ جنرل سر ہنری ہیولاک اور جنرل سر جیمس اوٹرم فوجِ گراں لے کر بٹھور پر حملہ آور ہوا۔ جاں نثار اس معرکہ میں زیادہ کام آئے نانا صاحب کو عنان ہزیمت ہاتھ میں لینی پڑی اور مقابلہ سے ہٹ گئے مگر ان کا خاندان محلات

---

[1] تاریخ بغاوت ہند

بٹھور میں گھر گیا۔ نانا راؤ گنگا سے اتر کر فتح پور چوراس پہنچے اور مقیم ہو گئے ادھر میدان خالی پاکر انگریزی فوج نے بٹھور پر قبضہ جما لیا لوٹ شروع ہوئی محلات کو توپوں سے اڑا دیا جو اس میں تھے وہ بھی خطرے میں مبتلا ہوئے مینا بائی کو گرفتار کر لیا اور محلات میں آگ لگا کر اس میں جھونک دی گئی۔ جنرل ہیگ نے تین ہزار انقلابیوں کو دار پر چڑھا دیا[1]۔

نانا راؤ نے نواب عالیہ حضرت محل والدہ نواب برجیس قدر بہادر کے پاس لکھنؤ اپنا وکیل روانہ کیا نواب عالیہ نے راجہ جے لال سنگھ کللکٹر کو حکم دیا کہ ۱۲ اونٹ اور ۲۹ چھکڑے۔ اگاڑیاں پچیس ہاتھی لے کر فتح پور چوراسی جاؤ اور نانا صاحب کا احترام اور ان کا حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھنؤ لے آؤ چنانچہ نانا صاحب ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ کو لکھنؤ میں داخل ہوئے ۱۱ ضرب توپ کی سلامی دی گئی ۲۵ ہزار روپیہ دعوت کے اور خلعت قبائے زریں بشمشیر د سہ مالائے مروارید نورتن۔ مرصع۔ دو شالہ رومال۔ اسپ معہ ساز نقرہ دھودرج نانا راؤ کی خدمت میں حضرت محل کی جانب سے نذر کیا گیا[2]۔

نانا راؤ سے عظیم اللہ خاں آکر ملے پھر مولوی احمد اللہ شاہ کے کیمپ میں صاحب گئے شاہ صاحب کے یہاں کا دربار جانبازوں اور سرفروشوں کی محفل تھی نانا صاحب کو شاہ صاحب نے گلے سے لگایا اور پہلو میں جگہ دی۔ جنرل بخت خاں اور شہزادہ فیروز شاہ سے بھی ملاقات ہوئی پھر نانا صاحب بریلی میں نواب خان بہادر خاں کے پاس گئے۔ ممو خاں کی تلون مزاجی سے حضرت محل نے لکھنؤ چھوڑا شاہ

---

[1] قیصر التواریخ حصہ دوم صفحہ ۲۰۱ [2] ایضاً

بھی ہٹ کر شاہجہاں پور پہنچ گئے یہاں نواب قادر علی خاں ناظم شہر نواب بہادر خاں کی طرف سے تھے

نواب تفضل حسین خاں رئیس فرخ آباد جنرل اسمٰعیل خاں یہاں آگئے شاہ صاحب نے تمام منتشر فوج کو پھر یکجا کیا ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو بھیجوریہ کے قریب انگریزی فوج سے سخت مقابلہ کیا سر کالن کمپل جو لکھنؤ میں شاہ صاحب سے شکست کھا چکا تھا وہ فوج گراں لے کر شاہجہاں پور آگیا سب کے مشورہ سے محمدی پور کی گڑھی پر قبضہ کیا اور حکومت قائم کی فوج کے جنرل بخت خاں مقرر ہوتے۔ قاضی سرفراز علی گورکھپوری قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے نانا راؤ پیشوا دیوان اور شاہزادہ فیروز شاہ وزیر اور کونسل میں ڈاکٹر وزیر خاں نواب تفضل حسین خاں نواب ممو خاں مولوی عظیم اللہ خاں مولوی لیاقت علی الہ آباد نواب خان بہادر خاں وغیرہ تھے سکہ مضروب ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ ؎ حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ [1]

مگر شاہزادہ فیروز شاہ اور شہزادہ مرزا کوچک برادر اور ظفر بہادر نے چیمگوئیاں شروع کردی تھیں فیروز شاہ خود بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے یہاں بھی دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوگئی حضرت محل برجیس قدر کو لیکر نیپال گئی ممو خاں چلتے ہوئے شاہ صاحب اپنے مرید راجہ بلدیو سنگھ رئیس پوائیں کی دعوت پر پوائیں گئے دھوکے سے تنہا پر گولیاں برسائی گئیں یہ ۵ جون ۱۸۵۸ء کا واقعہ تھا [2]

ڈاکٹر وزیر خاں اور شاہزادہ فیروز شاہ سندیلہ گئے تمام ساتھی منتشر ہوگئے

---

[1] قیصر التواریخ حصہ دوم [2] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۰۱

نانا راؤ اور عظیم اللہ بھی نیپال کی طرف چلتے ہوئے گورنمنٹ نے گرفتاری کا انعام مقرر کیا چند ہمشکل مرہٹے شبہ میں پکڑے گئے اور پھانسی پر لٹکا دئے گئے نانا راؤ پیشوا اور عظیم اللہ نیپال کی ترائی میں ۱۸۵۹ء تک لوگوں کو نظر آئے۔[1]

نانا راؤ کے حالات انگریز مورخین نے بھدے لفظوں میں بڑھا چڑھا کر لکھے ہیں۔ حتیٰ کہ گارساں دتاسی اپنے خطبات میں ایک جگہ کہتا ہے۔

"غدر کے جگر خراش اور اندوہ گیں مناظر کے بڑے بانیوں میں نانا صاحب ایک تعصب کی آگ میں بجھا ہوا ہندو تھا یہ شخص پیشوا باجی راؤ کا لے پالک (متبنیٰ) تھا نانا صاحب نے بٹھور میں سکونت اختیار کر لی تھی یہ مقام کانپور کے پاس ہے سنا ہے کہ یہ خونخوار انسان انگریزی تقریر و تحریر میں ید طولیٰ رکھتا تھا اس شخص نے شکسپیر کے مشہور ڈرامہ ہملٹ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔"[2]

مگر ذمہ دار برطانوی مورخوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ نانا صاحب کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہ تھا جو کچھ کیا وہ اپنا ملک انگریز سے نکالنے اور بچانے کے لئے کیا چنانچہ گیرٹ اور تھامپسن کی مشہور تصنیف ہندوستان میں برطانوی حکومت کا عروج اور تکمیل" میں یوں لکھا ہے

"کانپور میں بچوں اور عورتوں کا قتل ایک مجنونانہ فعل تھا لیکن اس کا باغی فوجیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی ان افواہوں کی تصدیق ہو سکی ہے کہ عورتوں پر مظالم اور عصمت دری کے واقعات ہوئے حقیقت

---

[1] بغاوت ہند حصہ دوم صفحہ ۱۹۳ [2] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۲۲۶

یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل عام دہشت زدگی پھیلانے یا خود اپنے ہاتوں کیا گیا ہو اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان وحشیانہ سزاؤں کے بعد ہوا جو انگیارڈ کے سنتریوں نے الہ آباد اور بنارس میں ہندوستانی فوجوں کو دیں۔"

وفات | نیپال کی ترائی میں نانا صاحب نے اواخر ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا[۱]۔

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۴۸

آمد نامہ

مؤلفہ مولانا فضل امام عمری خیرآبادیؒ

(از جناب حکیم محمد بہاؤ الدین[۲] صاحب صدیقی)

(۱۱) ملا حسن لکھنوی | از تلامذہ ملا کمال الدین در علم منطق و حکمت بے نظیر بودہ شرح سلم بغایت خوب نوشتہ است و متنے در منطق مسمی بمعارج العلوم و متنے در علم فلسفہ بغایت العلوم بطور شمس بازغہ تحریر فرمودہ و مطالب عالیہ دراں درج کردہ و بر میر زاہد رسالہ و میر زاہد ملا جلال و میر زاہد شرح مواقف نیز حواشی دارد شرح مسلم شروع فرمودہ بود ناتمام ماند۔

(۱۲) ملا محمد برکت اللہ الہ آبادی | نیز از شاگردان مولوی کمال الدین اند جامع فضائل وحادی فواضل بودند رسالہ در تحقیق و مرتبہ علم و رسالہ در حدوث و قدم و حاشیہ مبسوطہ بر میر زاہد شرح مواقف تحریر فرمودہ از دیدن آں کتب احوال جلالت شان و جامعیت مولوی دریافت می گردد۔

(۱۳) مولانا مولوی حمد اللہ سندیلی | از تلامذہ ملا کمال الدین است مگر فاتحہ فراغ از مولوی نظام الدین خواندہ در فنون عقل و نقل سرآمد زمان بودہ از تصانیف او شرح تصدیقات سلم است و حاشیہ شمس بازغہ کہ بغایت متین نوشتہ است۔

(۱۴) قاضی محمد مبارک گوپاموی | ذہن رسا و طبیعت عالی داشت و در امور

عامه دانی مشهور بوده اول کسے که حاشیه بر میرزاہد نوشت وسلم را شرح کرد او بوده
بتتبع طرز میر باقر داماد است در عبارت شرح سلم پیروی میر اختیار کرده وآں کتاب
غایت متین واقع شده است قاضی شاگرد ملا قطب گویا موی است و بعضے کتب
از شاه حاجی صفت الله خیر آبادی اخذ کرده۔ مدتہا در شاہجہاں آباد ماند دہمیں جا داعی
اجل را لبیک اجابت گفت۔ نعش او را بگو پامؤ بردند۔

(۱۵) مولوی باب اللہ جونپوری | شاگرد مولوی حمد اللہ سندیلی در خوش ذہنی دو قت
ہی مسلم روزگار بود و طریق تعلیم خوب میدانست ہرچند تصنیف نکرده مگر بعض جا حواشی
نوشته است ہرچه نوشته است خوب نوشته است۔

(۱۶) مولوی عبد اللہ سندیلوی | در اوائل از تلامذه ملا کمال الدین بود و در طلبه که در مدرسه
جمع بودند علم امتیاز می افراشت و نظر بر خوش ذہنی وحدت طبع و تیزی فہم ملا نظر تربیت
بحالش بیشتر بود چوں پیش بازغه رسید برائے مصلحت وقت فراغ از مولوی حمد اللہ
کرده طنطنه تدریس او در اوائل بسیار بوده آخر مائل بفقر شد و درس و تدریس بگذاشت۔

(۱۷) مولوی احمد اللہ سندیلی | از تلامذه ملا حمد اللہ است بر سلم شرح و بر سه میر
زاہد حواشی نوشته است۔

(۱۸) استاد الاستاد مولانا مولوی محمد اعلم الشہیر بالعالم سندیلوی | فاضلے جلیل الشان
عالمے ماہر البرہان بوده در جودت ذہن وحدت طبع وکشف معضلات وحل دقائق
بین الاماثل والاقران ممتاز و فائق بوده تلمیذ ملا کمال الدین است در حداثت سن از تحصیل
کتب درسی فراغت کرده برائے بہم رسانیدن مایه توکل شاہجہاں آباد آمد بجامع مسجد وارد
مدصباح آں برائے ملاقات شاه باسط که در حضرت محمد شاه پادشاه تقرر داشتند و

عزالنفس غربا و فضلا معرفت ایشاں بتخطی رسیدند تشریف برده شاه باسط را برادر زاده بود که فضیلت جید داشت معمول شاه باسط ایں بوده که اگر فاضلے برائے ملاقات ایشاں می آمد برادر زادهٔ خود را طلبیده امتحانا بامباحثه کنانیدند شاه صاحب موافق دستور برادر زاده خود را طلبیدند در میان مولوی صاحب بحث واقع شد وطول کشید آخر برادر شاه مجی الزام خوردند وصحبت فیمابین کوک نشد مولویصاحب ازانجا برخاسته بمکان آمدند واز فرط علو نفس وسمو ہمت و مزید استغنا عہد فرمودند بدل خود قرار دادند که من بعد حاجت دنیاوی پیش کسے نبرند و در گوشه توکل بنشینند و چار روز در شاہجہاں آباد مانده معاودت بوطن فرمودند و در سنہ مربع نشین چار بالش توکل شدند و مدت العمر برائے تلاش دنیاوی خود از مکان برنخاستند و بدرس وافاده علوم وافاضه فنون اشتغال ورزیدند و در داب تعلیم جناب حضرت مولوی صاحب در عہد خود نظیر نداشتند واز فیض تربیت جناب ایشاں اکثر مردم بذروه کمال رسیدند در اوائل حال بر اکثر کتب درسیه تعلیقات وحواشی تحریر فرمودند روزے مسودات خود را از ہر جا که یافتند جمع فرموده ہمه بار اشستند انچه که از تصانیف مولویصاحب که مردم نقل برداشته بودند که مولوی صاحب را وقت شستن مسودات بدست نامد باقی ماند چند رسائل و چند حواشی است منجمله آں حاشیه صدرا و رساله مسمیٰ لقیط اللبیب در مسائل متفرقه و حاشیه دائر در رساله تشکیک و تعلیقات بر میرزاہد ملا جلال و دیگر چند کتب است عمر مولوی صاحب بچهل و پنج سال رسیده بود و چوں وقت ارتحال جناب مولوی صاحب قریب شد مولوی صاحب تلامذه و دیگر بزرگان طلب فرموده استشهاد کردند و فرمودند که شمایان گواه باشند که من بر مذہب حنفی وطریقه حسینی و عقاید نسفی ازیں عالم رحلت میکنم و ہماں وقت ایں بیت فرمودند ؎

بااین دو حرف آمد ایں راه — الله محمد و محمد الله

پس کلمہ تشہد وطیب بر زبان راندہ بادل بیدار بعالم بقا شتافتند۔

(۱۹) استادی مولانا مولوی عبدالواحد خیرآبادی | از فاضلان تحریر وعالمان خوش تقریر بودند
صیت فضل وکمالش باکناف عالم رسیدہ واکثر مستعدان از فیض تربیت جناب ایشاں
بمدارج عالیہ ارتقا کردہ اند از دستجائے در زبان مولوی صاحب برکتے دادہ بود کہ ہر کہ در سلک
شاگردانش انسلاک یافتہ از علم بہرہ کافی وحظ شافی یا وعطامی شد حسن تقریر اوشاں بمرتبہ بود
کہ اکثر عامی وبازاری تقریر مطالب غامضہ می فرمودند اودقائق علمی را در اول دہلہ می فہمید بحلم
وسعت اخلاق ودیگر صفات حمیدہ وملکات پسندیدہ اتصاف داشتند۔ شاگرد رشید
مولوی محمد اعلم سندیلی ومولوی محمد اعلم مغفور ومبرور را باجناب استاذے محبتے والس خاص بود
جناب استادی اکثر کتب درسی از مولوی صاحب خواندہ بعضے کتب از مولوی وہاج الدین
ابن مولوی قطب الدین گوپاموی اخذ کردہ وقدرے صدرا باتفاق مولوی غلام طیب درخیر
آباد از مولوی احمد اللہ خیرآبادی ابن حاجی صفت اللہ فرا گرفتہ فراغ از مولوی محمد اعلم مرحوم
نمود در ۱۲۱۶ھ ہجری ازیں جہاں رحلت فرمودند عزیزے در تاریخ وفات گفتہ است قطعہ

روز جمعہ کہ بود چہارم عید | از جہان سوئے جنت الماویٰ
رفت وآمد نوید از رضوان | رضی اللہ عنک زود بیا

مولانا مولوی عبدالعلی لکھنوی ابن مولوی نظام الدین ابن ملا قطب الدین | از اساطین علمائے کبار است۔ در
قدر دریں آخر زمان عدیل ومثیل مولوی نیست بر اکثر کتب حواشی وشروح وتعلیقات تحریر
نمودہ از انجملہ حاشیہ صدرا وحاشیہ میرزاہد شرح مواقف است کہ بغایت مبسوط ومنقح
است وشرح سلم وشرح مسلم وشرح تحریر اصول وحواشی بر زاہدین وشرح مثنوی
مولانا روم در فارسی در ابتدار در لکھنو افاضہ علوم می کرد بعد ازاں بسببے از اسباب از لکھنو

برآمدہ چندے در رامپور ماندند وانجا بہ افادہ وافاضہ پرداختند پس ازاں بہ بنگالہ تشریف بردند وچند سال در بنگالہ نشر فوائد فرمودہ بدکھن تشریف بردند نواب محمد علیخاں صاحب صوبہ ارکاٹ مقدم اوراگرامی داشت بانواع احترام پیش آمد وبیک ہزار روپیہ ددمایہ مدد خرچ ذات سوائے مصارف طلبہ مقرر کرد وتاحال در دکھن تشریف می دارند قوت حافظہ جناب مولوی صاحب بدرجہ آنست کہ عبارت اکثر کتب درسی از بر است ایزد تعالیٰ ظل ظلیل ایشاں بر مفارق مستفیدان مخلد ومستدام دارد۔

سید الہدیہ ہرگامی | در علم وفضل نظیر نداشت۔ در علم لغت ودیگر علوم سرآمد روزگار بودہ از تصانیفش نادر البیان است در نحو کہ ابنا گردے سبقاً سبقاً از ظہر قلب بے مراجعت بکتب نوشتہ میداد وفاتحہ آں کتاب اینست الحمد للہ الذی جعل الکلمۃ لفظا وضع بمعنی الایمان ثلاثیہ بہ فعل الی اسم الکفر وحرف العصیان وحسابا بالسیرا است در علم حساب کہ اکثر مسائل را حاوی است و "وجیز" است در فرائض کہ تمامی کتاب یک جملہ است وقاموس اللغۃ را در فارسی ترجمہ ساخت ونام خود دراں نہ نگاشتہ۔

ملا ابوالوفا عطا ہرگامی | از اساطین علماء وارکین فضلاء بودہ در جمیع علوم دستگاہے بلند وقدمے تمام داشتہ۔ بر ہدایہ ومطول وملا جلال ودیگر کتب حواشی نوشتہ بود بیشتر تلف شدند زبانی جناب استادی مولوی سید عبد الواحد رحمہ اللہ شنیدہ ام کہ میفرمودند کہ حاشیہ ملا را کہ بر ملا جلال بودہ دیدہ ام بغایت متین نوشتہ بودند وازاں حاشیہ مبلغ علم ملا معلوم می شد در پنولا از کتب ملا نشانے یافتہ نمیشود اطارت بہا العنقا اغالت بہا الغول یک رسالہ در تحقیق جملہ خبریہ متضمن جواب شبہ جذر الاصم محرر ایں اسباب ہم دیدہ است الحق بہایت خوب وبمرتبہ متین است۔ نقل است گویند کہ محب اللہ بہاری صاحب سلم برائے سبق پیش ملا آمدہ بود وچوں کدام وقت خالی نبود ازانجا

برخاستہ نزد مولوی قطب الدین سہالی رفت سبق شروع کرد و نیز نقل می کنند کہ ملا قطب الدین
بارادۂ مباحثہ و مذاکرہ نزد ملا ہرگام تشریف بردہ بودند مگر اتفاق نشدہ ملا امتناع کردہ فرمودہ کہ من کبیر السن
شدہ ام حالا ہوسِ درس تدریس ندارم و شما حدانت سن دارید و جوانید وقت افادہ است و مباحثہ
اگر الزام عائد بطرف من شد مرا خود ہوس درس و تدریس درسی نیست آہنگ دیگر درس است
و اگر الزام بطرف شما رسید موجب سقوط اعتبار شما بین الطلبہ خواہد گردید و اختلالے در امر درس
شما رو خواہد داد و فیض عظیم مسدود و بند خواہد شد چوں قطب الدین ایں سخن شنیدہ فرمودند کہ مرا داعیہ
تلمذ است نہ داعیہ برابرے اگر استفادہ خواہم کرد کتاب درمیان خواہم نہاد آخر کہ آں دو بزرگوار
بکمال خلوص و اتحاد و فرط اخلاص و محبت دو چہار روز باہم صحبت داشتند۔ ملا از استادان
عالمگیر بادشاہ اند و در تالیف فتاوی عالمگیری شرکت داشتند و خوارق عادات و کمالات
باطنی ملا بسیار نقل می کنند۔ مزار متبرک ایشاں در ہرگام است۔

(۲۳) ملا عبد الواحد ہرگامی | جد اعلائے محررا وراق فاضلے متبحر بودند بر کافیہ شرح مبسوط
و بر تحریر اقلیدس حاشیہ و تعلیقات متفرقہ بر ہدایہ نوشتہ بودند چوں در عہد بہادر شاہ گردی تمام
اسباب آہالی قصبہ بتاراج رفت و راجپوتان و دیگر مردم اشرار کتب و غیرہا آتش دادند
ہمہ کتب خانہ سوخت و برباد شد آں مسودات نماندہ استادی مولوی سید عبد الواحد مغفور فرمودند
کہ من حواشی ملا بر تحریر اقلیدس نوشتہ دیدہ ام و بغایت خوب نوشتہ اند و آں کتاب محشی
بحواشی ملا عبد الواحد ہرگامی در گوپامؤ در کتب خانہ ملا قطب بود و شاید الحال ہم باشد در
ہرگام وفات یافت و ہمانجا مدفون شد۔

(۲۴) مولوی محمد صالح ابن ملا عبد الواحد ہرگامی | جد حقیقی ایں محرر است حافظ کلام مجید و
حاوی اکثر فنون بودہ بدرس اشتغال نہ نمود و ز عنفوان شباب مائل نوکری شدہ در عہد

محمد شاه بادشاه صاحب جاگیر و منصب بوده میل خاطرش بطرف تصوف بیشتر بود اوراق بوسیده بطور مسوده افتاده بودند دیده ام و کتاب فارسی در تذکرهٔ بزرگان و اولیا تحریر فرموده است ان کتاب بدستخط خاص او نزد محرر موجود است عبارت سلیس و شسته نوشته اند در حیدرآباد انتقال فرمودند مزارش همانجا است۔

(۲۵) مولوی محمد عظیم لاهرپوری | فاضل ذکی الطبع بودند در علم فقه هم توغل بسیار کرده بودند بر میر زاهد شرح تهذیب بعض بعض حواشی ایشان دیده شد از ملاحظه آن جودت ذهن و حدت طبع مولوی میتوان یافت که بچه درجه بوده است۔

(۲۶) مولوی احمد عظیم خیرآبادی | شاگرد مولوی محمد اعلم و معاصر استادی مولانا عبدالواحد است ذهن رسا و فکر وقت آشنا داشت مولوی محمد برکت وقت رحلت خود پسر و برادر زاده خود را وصیت تحصیل پیش مولوی موصوف کرده بودند مولوی در طب مهارت کلی پیدا کرده بود در عنفوان شباب به بیماری دق از جهان رحلت فرمود۔

(۲۷) مولوی محمد عظیم ملاوی | از تلامذه مولوی قطب الدین گوپاموی است۔ بر سلم و زاهدین حواشی و تعلیقات تحریر فرموده است و بر صدرا هم حاشیه دارد۔

(۲۸) مولوی امجد قنوجی | بر صدرا حاشیه نوشته است خالی از فوائد نیست و شاگرد ملا نظام الدین است۔

(۲۹) مولوی وهاج الدین بن مولوی قطب الدین گوپاموی | صاحب ذهن ثاقب و درک صائب و فکر عمیق و غور دقیق بود طبع وهاجش بدقائق علمی خوب می رسید در علوم اصول نظیر خود نداشت در هدایه دانی مشهور بوده خلق کثیر در حلقه درس او حاضر شده استفاده علوم می کردند یکمرتبه در مجلس عرس در بلگڈھ که جمع از فضلاء و علماء منعقد بوده از مولوی محمد حسن لکھنوی و

مولوی صاحب در فن اصول مباحثہ شدہ بود چوں سخن بطول کشید وقت نماز رسید مقدمہ ناصاف
ماندہ ہر دو صاحبان برخاستند۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ محدث | کابرآعن کابر ۔ در علم حدیث و نقد
اصول و تمامی علوم عربیت خاصہ لغت مشہور اند و جناب شاہ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب
در صغر سن حفظ کلام مجید کردہ تجوید قرأت آموخت و در سیزدہ سالگی از تحصیل علوم رسمی
فراغت حاصل کردہ چندگاہ بر مسند تدریس متمکن شدہ خلائق را بافاضہ علوم و اشاعت
انوار احادیث بہرہ مند ساخت از چندے بسبب عروض بیماری با طاقت و حالت کتاب
بینی در مولوی صاحب نیست اگر از ذہن و حافظہ اش حکایت کردہ شود سامعان کہ بہرہ
یاب ملازمت شریفش نشدہ اند غالب است کہ محمول بر حسن ظن و اغراق نمایند تمام علوم و
سائر فنون چہ عقلی و چہ نقلی ہمہ از بر اند و در جمیع علوم مولوی صاحب را مرتبہ عقل مستفاد بہم
رسیدہ روزے یک انگریزے برائے ملاقات مولوی صاحب رفتہ بود ذکر در سفر دریا و بعضے
جزائر کہ سفائن را در انجا خطرہ ہا است افتاد مولوی صاحب عرض و طول آں جزیرہ و خم و پیچ
دریا وغیرہ بیان بنمط بیان کردند کہ فرنگی در حیرت افتاد و گفت کمالات نفسانی و ملکات فاضلہ انسانی
جناب ایشاں چندانست کہ خامہ متصدی تحریر یکے از ہزار نمی تواند شد۔ مصنفات عالیہ
مولوی صاحب برائے ہر کسے کہ اقتباس انوار حضوری و صحبت صوری را ادراک نمودہ دلیل
روشن است از جملہ تصانیف متنے است در علم کلام و متنے در علم بدیع و بیان و معانی و
از انجملہ تفسیر فارسی است کہ قریب صد جزو بود در سہ پارہ تحریر فرمودہ و ایں تفسیر در حالت بیماری
و استیلائی ضعف کہ طاقت نوشتن نداشتند تصنیف فرمودہ اند از شاگردے کہ تازہ بشرف
اسلام مشرف شدہ بود فرمودند کہ آنچہ بگویم بنویس پس او نوشتن شروع میکرد و مولوی صاحب

فرمودن آغاز می کرد بایں طور در چند ماه ان تفسیر دو دهم سیاره را ارقام شد ـ واز جمله فوائد مولوی صاحب قصائد عربی است که جلالت شان ان قصائد هر کسے که از علم عربیت بهره واز محاورۂ عرب آشنائی داشته باشد می تواند دریافت که , در چه درجه بلاغت واقع است و در علم حدیث خود نظیر مولوی صاحب در هیچ جا نبوده باشد و تحفۂ اثنا عشریه در بحث امامت از مصنفات اوشان است و برادر صغیر مولوی شاه عبد العزیز صاحب ایشان اند برادر بزرگ خود هادی فضائل و مستجمع فواضل اند امروز در علم ریاضی کم کسے بوده باشد که مساهمت با مولوی صاحب تواند نمود. دیگر برادر مولوی شاه عبد العزیز در بندگی و علم و اخلاق عدیل خود ندارند در زهد و تقوی و طهارت بے مثل اند علم حدیث و احوال . . . .
. . . همه از بر است کتب حدیث و فقه را بیشتر درس میگویند و درس معقول را گذاشته اند۔

امام اعظم ابو حنیفه کوفی | جلالت شانش ازاں افزوں است که در حیطۂ ضبط در آید. امام شافعی گفته که الناس فی الفقه عیال ابو حنیفه تولد شریفش در سنه هشتاد هجری واقع شد و هفتاد ساله عمر یافته و در سنه یکصد و پنجاه هجری ازیں جهاں رحلت فرمود قطعه تاریخ وفات

سال هشتاد بو حنیفه بزاد + داد هر علم و علم فقه بداد ؛ در صد و پنجهش وفات رسید + سال عمرش رسید تا هفتاد

امام ملک | در سنه نود و پنج متولد شده و در سنه یکصد و هشتاد و دو ازیں جهاں بعالم بقا شتافت و عمر مبارک او هشتاد و هشت ساله بود۔

امام شافعی | ولادت او در سن یکصد و سه هجری بوده و در سن یکصد و هشتاد و هشت رحلت کرد و پنجاه و دو سال دریں جهاں ماند۔

امام احمد بن حنبل | در سه یکصد و پنجاه تولد یافته و در سه یکصد و نود و چهار بریاض جنت خرامید و سنین عمرش بچهل و چهار رسیده

قطعه

سال هشتاد بو حنیفه بزاد + ده و دو بعد ازاں شده مالک ؛ مظهر شافعی صد و پنجاه + چار ده بعد احمد مالک

ادبیات

نذرِ سیّد الشہدا

(جناب شفیق صدیقی جونپوری)

انت کہفی وملاذی واما می ساقی — فالیٰ بابک رجحان مرامی ساقی
اعتمادی ورجائی لسلامی ساقی — حین یبلی کفنی فوق عظامی ساقی
فاسقنی الیوم بکاس الکریم والنعیم — ذاب فی ہجرک لحمی وعظامی ساقی
کلمۃ ارضٍ بقیع وبتارِ النجف — انت کالبدر علیٰ کل مقام ساقی
بتیک الاطہر ملجاء شفیق ابداً — بلغ اللہ صلاتی وسلامی ساقی

اےکہ آگاہ مقامِ رسن ودار توئی — رازِ ایثار توئی معنیٔ ایثار توئی
بارک اللہ کہ دربیکسی وخشک لبی — اسد اللہؓ توئی جعفر طیارؓ توئی
فرش تا عرش مثالِ کف ید بیش نظر — اےکہ از جملہ مقامات خبردار توئی
تن بہ خاک است وسرِ پاک تو برنوکِ علم — درجہانِ شہدا یوسفِ بازار توئی
منزلِ عشق ومن مضطر وحیران مددے — کہ دریں راہ مرا قافلہ سالار توئی

ہر جگہ بے سر وساماں ہیں مسلماں آجا — قوم کو یاد نہیں نکتۂ قرآں آجا
مسجد ومدرسہ وخانقہ وصحنِ حرم — ہر جگہ ہو ترے جلووں سے چراغاں آجا
آکہ خدام بڑی دیر سے تکتے ہیں تجھے — ترا کابل ترا ترکی ترا ایراں آجا
راکبِ دوشِ نبیؐ حاملِ اسرارِ علیؓ — رونقِ بارگہ بوذرؓ وسلماں آجا
بس گئے بدعتِ سرمایہ سے نادار کے دل — اے حسینؓ ابن علیؓ سوئے غریباں آجا

تبصرے

بزم تیموریہ | از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے ضخامت ۴۶۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر تقطیع کلاں قیمت عہ؍ پتہ :۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔

تیموری سلاطین جہاں تیغ زن و کشور کشا تھے۔ شعروادب اور علم و فن کا بھی شگفتہ ذوق رکھتے اور اس کے قدردان تھے یہاں تک کہ ان کی خواتین بھی علمی و ادبی ذوق میں مردوں سے کم نہیں تھیں لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کی شمشیرزنی کے واقعات سے تو تاریخ کے دفتر کے دفتر بھرے ہیں۔ مگر ان کے ان علمی و ادبی کارناموں کو اس طرح پر مرتب نہیں کیا گیا کہ جس کو دیکھ کر ان سلاطین کی تصویر کا دوسرا روشن رُخ بھی بیک وقت سامنے آسکتا بڑی خوشی کی بات ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے ایک تجربہ کار و لائق رفیق نے بڑی محنت و جستجو اور کاوش و تحقیق کے بعد ایک ایسا خوشنما مرقع بنا کر پیش کر دیا جس میں ان ارباب اورنگ و نگیں کی بزم آرائیوں کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے بابر (بلکہ تیمور سے) لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے تمام سلاطین مغل اور مرزا کامران (ہمایوں کے بھائی) سے لیکر شاہ عالم کے لڑکے مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ تک شہزادگان عالی تبار اور بابر کی مشہور و معروف بیٹی گلبدن بیگم سے لیکر اورنگ زیب عالمگیرؒ کی بیٹی بدرالنساء تک تمام سراپردگیاں عفاف شہزادیوں کے ادبی کارناموں اور ان کی فنی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے پھر سلاطین کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کے دربار سے متعلق بڑے بڑے شاعروں اور اربابِ کمال کا بھی تذکرہ آگیا ہے فاضل مصنف نے محض اشعار یا چند واقعات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مورخ اور نقاد کی حیثیت سے اس زمانہ کے علمی ماحول اور سلاطین کی تعلیم و

ترتیب پر روشنی ڈالنے کے بعد کلام کے مختلف نمونے پیش کئے ہیں اور اس پر تبصرہ کر کے اس کی معنوی اور لفظی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ البتہ شہزادوں اور شہزادیوں کا تذکرہ بہت مختصر ہے اور اس پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ کتاب زبان و بیان۔ ترتیب و تدوین۔ کاوش و تحقیق کے اعتبار سے نہایت دلچسپ۔ پر از معلومات اور فائدہ بخش ہے۔ تاریخ اور ادب کے طلبار اور اساتذہ اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لکھنؤ کی آخری شمع از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی تقطیع خورد ضخامت ۹۲ صفحات کتابت طباعت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علیگڈھ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم نے دہلی کی آخری شمع لکھی تھی مفتی صاحب نے اسی طرز پر لکھنؤ کی آخری شمع کا حال سنایا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے جادو نگار قلم سے دہلی کی بزم آخر کے نقشہ میں جو رنگ و روغن بھرا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ارباب ذوق اسے پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں مفتی صاحب نے بھی واجد علی شاہ مرحوم کے عہد کا ایک آخری بزم مشاعرہ۔ جو لال بارہ دری میں خود جانعالم اختر پیا کی زیرصدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس کی داستان اس انداز سے سنائی ہے کہ اس عہد کے عام ادبی مذاق۔ رنگینی طبع۔ زندہ دلی اور سرمستی و رندی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے مفتی صاحب نے اس مشاعرہ میں انتالیس شعرا کی نشست دکھائی ہے جن میں لکھنؤ اسکول کے شاعروں کے ساتھ مرزا غالب اور ذوق بھی شریک ہیں مشاعرہ طرحی ہے اور طرح بھی نہایت عجیب و سنگلاخ۔ پھر بھی بعض بعض شاعروں نے خوب اشعار کہے ہیں۔ پورا مقالہ پڑھنے کے بعد حسرت ہوتی ہے کہ ہائے وہ زمیں کھاگئی آسماں کیسے کیسے!

سیاسیات کے اصول از میر نثار علی صاحب کوثر بی۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۱۸۰

صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۶؏ پتہ اردو محل حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب اگرچہ ابتدائی ہے لیکن اس میں سیاسیات کے مبادی سے متعلق اصولی مباحث مثلاً مملکت کی ماہیت۔ مملکت کا آغاز وارتقا اس سلسلہ میں مملکت سے متعلق مختلف نظریئے اور انکا قانون کی تعریف اور اس کے ماخذ۔ مملکت کی تنظیم۔ حکومت کی قسمیں اور مملکت کا مقصد۔ یورپ اور ایشیا کے مختلف دستوری نظام اور ان کے خاکے یہ سب اختصار مگر جامعیت کے ساتھ سہل اور عام فہم زبان میں بیان ہو گئے ہیں اردو زبان میں سیاسیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہوگی۔

تعمیر تقطیع متوسط اخباری۔ ضخامت دس صفحے کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ چھ روپے فی پرچہ ۲؍ پتہ:۔ ادارۂ تعلیمات اسلامی نمبر ۴۸ امین آباد پارک لکھنؤ۔

یہ پندرہ روزہ اخبار ندوۃ العلما لکھنؤ کے دو اساتذہ مولانا سید ابوالحسن علی اور مولانا عبداللہ قدوائی کی زیر ادارت چند ماہ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اخبار کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا اور اسلام کی تعلیمات سے ان کو آشنا کرنا ہے اب تک اس میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اگ وہ استدلالی سے زیادہ خطابی اور اقناعی طرز کے ہیں سب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں جبکہ اسلام سے بہت دور جا پڑنے کے باعث مسلمان حد سے زیادہ خوف زدہ بزدل اور کمزور ہو گئے ہیں اور خدا سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے بجائے ماد طاقتوں کا سہارا لینے کے خوگر ہو گئے ہیں انھیں اس اخبار کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ۔ دینی اور اصلاحی مضامین کے علاوہ ہر نمبر میں صالح ادبیات کا عنصر بھی شریک ہوتا ہے جس سے ذوق کی شگفتگی اور تر و تازگی کا سامان بہم پہنچتا رہے ہے۔

بُرہان

جلد بست و دوم شمارہ (۲)

فروری سنہ ۱۹۴۹ء مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

باخبر اصحاب کو معلوم ہے. کلکتہ میں کلکتہ مدرسہ کے نام سے تقریباً پونے دو سو برس سے مشرقی و مغربی علوم و فنون کی ایک درسگاہ تھی جس کو وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں قائم کیا اور مشرقی علوم کی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں یہ پہلی درسگاہ تھی جس کو انگریزوں نے ان علوم کی سرپرستی کے خیال سے بنایا تھا۔ ڈاکٹر ڈینی سن راس اور ڈاکٹر اسپرنگر ایسے فاضل مستشرق اس کے پرنسپل رہے ہیں۔ آخری انگریز پرنسپل مسٹر ہارلے تھے۔ ان کے بعد جو ہندوستانی مسلمان پرنسپل مقرر ہوئے وہ بھی علم و فضل کے اعتبار سے نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ یہ درسگاہ گورنمنٹ کی تھی جس کے تمام وسیع اخراجات کا بار بنگال گورنمنٹ برداشت کرتی تھی یہاں کے فارغ التحصیل طلباء کی امتحانی سندات کا اعتبار گورنمنٹ کے ہاں بھی تھا اور ان کے ذریعہ سے یہ لوگ علمی و تعلیمی ترقی بھی کرتے تھے اور معاشی اعتبار سے باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل بھی ہوتے تھے اگرچہ گورنمنٹ کی سرپرستی کے باعث عام مسلمانوں نے اس درسگاہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس سے کہ وہ اسی قسم کی دوسری آزاد درسگاہوں کو دیکھتے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلکتہ مدرسہ کا فیض پورے مشرقی ہندوستان میں عام تھا۔ طلباء یہاں عربی اور دینیات بھی پڑھتے تھے اور انگریزی کے بڑے بڑے امتحانات بھی پاس کرتے تھے۔ اس چیز نے مشرقی ہندوستان کی سوسائٹی پر ایسا خوشگوار اثر ڈالا کہ آج بھی مغربی بنگال میں عموماً اور کلکتہ میں خصوصاً عربی اور فارسی کا حسب سابق چرچا ہے اور اردو بھی یہاں ایسی زبوں حال نہیں جیسی کہ وہ اپنے دیس میں ہے۔

تقسیم ہندوستان کے وقت کلکتہ مدرسہ کا پورا اسٹاف خود بخود اٹھ کر مشرقی بنگال چلا گیا اور اس شان سے گیا کہ یہاں بالکل جھاڑو دے گیا حد یہ ہے کہ بجلی کے تار تک باقی نہیں رکھے۔ ان کے بس میں نہ تھا ورنہ مدرسہ کی عمارت کو بھی سر پر اٹھا کر لے جاتے یا کچھ اور نہیں تو اسے منہدم ہی کر جاتے۔

اس صورت حال پر ایک سال گذر چکا تھا۔ اور مدرسہ کی عمارت ایک ظرف بے مظروف کی مانند اپنے ویران کر جانے والوں کے ظلم و ستم کی شکوہ سنج بنی کھڑی تھی کہ مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ العالی اور اکابر جمعیت علماء ہند کی تحریک دایما پر مغربی بنگال کی گورنمنٹ نے اس درسگاہ کو پھر اس کی اسی دیرینہ شان و روایات کے ساتھ از سر نو جاری کرنے کا عزم کر لیا اور اس سلسلہ میں اس کی پرنسپل شپ کی پیش کش خاکسار راقم الحروف کو کی۔

قارئین برہان جانتے ہیں کہ اصلاح تعلیم کے سلسلہ میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہوں اس بنا پر یہ خیال کر کے کہ میں یہاں اپنے اس نقطۂ نظر کی عملی تشکیل میں کر کے اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کو وقت کے مطالبات کے مطابق بنا کر کوئی مفید خدمت کر سکوں گا میں نے یہ پیش کش بخوشی قبول کر لی اور ۲ر فروری کو کلکتہ پہنچ کر اپنی اس جگہ کا چارج بھی لے لیا

کل کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ بہر حال اس وقت صورت یہ ہے کہ تعلیمی خدمت کے جذبہ نے مجھ کو برہان سے ایک ہزار میل دور کی مسافت پر پہنچا دیا ہے۔ احباب کو مختلف ذرائع سے اس کا علم پہلے ہی ہوگیا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں دفتر برہان میں کثرت سے خطوط موصول ہوئے اور انہیں تشویش و بے چینی کے اظہار کے ساتھ دریافت کیا گیا کہ "برہان کا اب کیا ہوگا؟" واقعہ یہ ہے کہ برہان کی نسبت سے مجھ کو اپنے وجود کی اہمیت کا پہلی مرتبہ علم انھیں خطوط سے ہوا ورنہ من آنم کہ من دانم!!

ان دوستوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ آپ کے حسن ظن اور میرے متعلق

اس درجہ توجہ فرمائی کا تہ دل سے شکر گزار رہوں۔ رہا برہان۔ تو حقیقت یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ ندوۃ المصنفین اور برہان کا قیام و بقا اور اُس کی ترقی و اشاعت یہ سب چیزیں بڑی حد تک برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین کی ہی کوششوں اور اُن کے حسن تدبر کا نتیجہ ہیں لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں بربادی کے بعد ادارہ کی نشأت ثانیہ تو سرتا سر انھیں کا کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے جس حیرت انگیز اولوالعزمی ہمت بلند اور استقلال و استقامت کا ثبوت دیا ہے وہ بے شبہ ہمارے بہت سے قومی کارکنوں کے لئے لائق تقلید ہے۔ میں صرف ایک طالب علم کی حیثیت سے بعض تحریری کاموں میں ان کا رفیق ہوں۔ اور جہاں کہیں بھی رہوں گا میری ان کے ساتھ یہ رفاقت برابر قایم رہے گی۔ اب ادارت برہان سے متعلق مقامی امور کی نگرانی عزیز مکرم خواجہ احمد فاروقی ایم اے اور مکرمی مفتی انتظام اللہ شہابی کرتے رہیں گے۔ ان دونوں حضرات نے میرے کہے بغیر ہی ازراہ محبت و ہمدردی برہان کی یہ مدد کرنے کا پختہ وعدہ کیا ہے اور ان کی مستعدی و خلوص سے توقع ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیتے رہیں گے۔

برہان کے دوسرے ارباب قلم دوستوں سے توقع ہے کہ میری عدم موجودگی میں آپ برہان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں گے اور اس کی بقا و ترقی کو اپنا علمی اور اجتماعی فریضہ تصور فرمائیں گے۔

اب آئندہ برہان سے متعلق تمام خط و کتابت دفتر برہان دہلی کے پتہ پر کیجئے اور صرف اہم علمی کتابیں برائے تبصرہ اور دینی و اسلامی مقالات برائے اشاعت مجھ کو پتہ ذیل پر بھیجئے!

"پرنسپل کلکتہ مدرسہ ولزلی اسکوائر کلکتہ"

تدوین حدیث

تدوین حدیث کا ماحول

(۲)

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ
دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

ہو سکتا ہے کہ دعویٰ کی اس کلیت میں اغراق کا پہلو پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ ابن صلاح نے
اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، اور ابراہیم نخعی، عامر شعبی وغیرہ عربی النسل علما کا تذکرہ
کر کے عبدالرحمٰن کے اس دعوے پر تنقید بھی کی ہے لیکن کلیت نہ سہی اکثریت کا تو کسی
طرح انکار نہیں کیا جا سکتا خصوصاً لفظ "الموالی" کے اطلاق میں اس وسعت کو اگر پیش
نظر رکھا جائے جو اس زمانے میں لفظ موالی کے استعمال میں پائی جاتی تھی[۱]۔

---

[۱] یہ الموالی کا لفظ عربی زبان کا عجیب لفظ ہے بیسیوں معانی کے ساتھ یہ بھی عربی زبان کے ان الفاظ
میں ہے جن سے دو متضاد معانی سمجھے جاتے ہیں یعنی اسی مولیٰ کے معنی جہاں غلام کے ہیں، وہاں
مولیٰ آقا کو بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہنے والے خداوند تعالیٰ کو بھی مولیٰ تعالیٰ کہتے ہیں۔ پھر غلام
کی دو قسمیں مولیٰ کے تحت میں داخل ہیں یعنی ایک تو براہ راست غلاموں کو بھی موالی کہتے ہیں نیز
اسلام کی تاریخ کے چند عجائب میں ایک طرفہ یہ ہے کہ آزاد ہونے کے ساتھ ان آزادیوں سے مستفید
ہوتے ہوئے جو مفتوح اقوام کے افراد کو اسلام نے دے رکھا تھا۔ بہت جلد ان آزاد ہونے
بقیہ بر صفحہ آئندہ

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے موالی کا اطلاق ان غیر عربی لوگوں پر ہوتا تھا
ان کے آباد اجداد غلام ہونے کے بعد آزاد ہو جاتے تھے اسی طرح موالی میں
کے لوگ بھی شریک تھے، جن کا نسلاً کسی عربی قبیلہ سے تعلق نہ ہوتا تھا، اور وطن
عرب سے باہر کسی ملک میں ہوتا۔ اسلامی علاقے کے امن دامان، عدل وا
کا شہرہ سن کر مسلمان ہونے کے بعد عربی قبائل کی آبادیوں مثلاً کوفہ بصرہ وغیرہ
بنانا چاہتے تو کسی عربی قبیلہ سے دوستی اور باہمی امداد و معاونت کا معاملہ اور مہ
رہ پڑتے پھر جس قبیلہ سے ان کا تعلق ہوتا اسی قبیلہ کی طرف ان کو منسوب بھی
تھا اور اسی قبیلہ کے موالی میں وہ شمار ہونے تھے اسی طرح جب عربی مسلمان
ہو غیر عربی آدمی اسلام لاتا، تو جو قبیلہ اس عربی النسل آدمی کا ہوتا تھا اسی قبیلہ
اس نومسلم عجمی مسلمان کو بھی منسوب کر دیتے تھے اور یوں اسی قبیلہ کے موا
ان کو داخل کر لیا جاتا تھا کہتے ہیں کہ امام المحدثین امام بخاری جو نسلاً ترکی نژاد
وہ الجعفی کی نسبت کے ساتھ جو مشہور ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے جیسا کہ سب

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) والے غلاموں کی معاشی حالت اتنی بلند ہو جاتی تھی کہ چند ہی د
بعد غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے لگتے تھے۔ اسی طرح یہ غلاموں کے غلام جو موالی ا
کہلاتے تھے اسی طرح آزاد ہو کر غلام خریدتے اور آزاد کرتے اس سلسلہ میں ابن سعد
لطیفہ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن حنین جو زہری وغیرہ کے اساتذہ میں ہیں لوگ عموماً ان کو
عباس کے موالی میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت حضرت عباس پانچویں درجہ
کے آقا ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عباس نے شماس نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا
نے منقب نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا اور شماس نے مسحل نامی غلام کو خرید کر آزاد کی
نے حنین نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا تھا مگر بولنے میں لوگ حنین کو حضرت عباس کا موالی
کہتے صـ۱۲۱ ج ۵ ابن سعد

ں لکھا ہے۔

ن جدہ کان مجوسیا	امام بخاری کے دادا مجوسی (آتش پرست
لم علی ید الیمان بن	پارسی تھے)، پھر یمان بن اخنس الجعفی کے ہاتھ
نس الجعفی ص۲۶۷	پر اسلام لائے اس لئے وہ بھی جعفی کی نسبت
	سے مشہور ہوئے۔

نیفہ کے متعلق بھی ان کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہی دعوے تھا۔

بہر حال اسلام کی وجہ سے جو موالی ہوتے تھے ان کو موالی الاسلام کہتے تھے
باہمی کے معاہدہ کی وجہ سے مولیٰ کہلانے والے مولی الحلف سمجھے جاتے تھے
ں والے مولی کو مولی العتاقہ کہتے تھے۔ نودی نے لکھا ہے کہ گو موالی کے لفظ
سب ہی پر ہوتا ہے لیکن

لی عتاقہ ھو الغالب	مولیٰ کے لفظ کا اطلاق زیادہ تر مولی عتاقہ
تقریب ص۱۶۷	ہی پر کیا جاتا ہے یعنی آزاد شدہ غلام یہی
	مفہوم اس لفظ کا زیادہ عام اور غالب ہے۔

ل سے میری غرض یہ ہے کہ اسلام کی ان ابتدائی صدیوں میں "موالی" کی یہ عجیب
طاقت دینی علوم کی حفظ و نگرانی تبلیغ واشاعت کے لئے قدرت کی طرف
ہیا ہوگئی تھی اس میں گو زیادہ تعداد توان ہی لوگوں کی تھی جنہوں نے یا جن کے
نے غلامی کے بعد آزادی حاصل کی، اور اسلام کے عطا کردہ حقوق سے
ہوتے ہوئے حکومت وقت کی بے اعتنائیوں کے باوجود مسلمانوں میں
ں امتیاز حاصل کر لیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ سب ہی غلام اور غلاموں

کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ایک گروہ ان میں دوسری قسم کے موالی کا بھی تھا
چونکہ نسلاً عرب قبائل سے ان بے چاروں کا کبھی رشتہ نہ تھا اس لئے حکومت کا نقطۂ
نظر ان کے ساتھ بھی قریب قریب وہی تھا جو غلاموں کے ساتھ اور غلاموں کی نسل
کے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس نقطہ نظر کے قایم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔
جتنا ان کو گرانا چاہتی تھی۔ اسلام ان کو اسی قدر بلند و برتر کرتا چلا جاتا تھا آپ ہی خیال
کیجئے کہ جہاں حال یہ ہو کہ بخارا کا رہنے والا نومسلم جس کا نام بشیر تھا بخارا سے بہ تلاش
روزگار مسلمانوں کی نئی فوجی چھاؤنیوں اور نئی آبادیوں کی طرف رخ کرتا ہے حالات
مساعدت کرتے ہیں بنی امیہ کے طاغیہ حجاج بن یوسف اس کے پکائے ہوئے کھانے
کو پسند کرتا ہے۔ حجاج کے باورچی خانہ میں اس کا تقرر ہو جاتا ہے کوفہ میں اس طریقہ
سے اس بے چارے کو قیام کا موقعہ مل جاتا ہے ساتھ اس کے اس کا لڑکا ہشیم نامی
بھی ہے۔ ہشیم کوفہ کے تعلیمی حلقوں میں آنا جانا شروع کرتے ہیں غریب باورچی اپنے
بچے کے اس علمی ذوق کو پسند نہیں کرتا۔ چاہتا تھا کہ مجھ سے طباخی کے کچھ گر سیکھے
یہ اس بچے کے لئے زیادہ مفید ہو گا اسی عرصہ میں ہشیم بیمار پڑتے ہیں اسی زمانہ میں
واسطہ کے قاضی ابوشیبہ کے حلقہ درس میں ہشیم آمد و رفت رکھتے تھے بیمار ہو جانے
کی وجہ سے حلقہ درس میں شریک نہ ہو سکے تو قاضی صاحب نے ساتھیوں سے پوچھا
وہ نوجوان ہشیم کیوں نہیں آ رہا ہے۔ لوگوں نے علالت کی خبر دی۔ قاضی پر ہشیم کی
غیر معمولی صلاحیتوں کا اتنا اثر تھا کہ اسی وقت ہشیم کی عیادت کے لئے روانہ ہوئے
بشیر باورچی گھر ہی میں تھا اطلاع دی گئی کہ قاضی ابوشیبہ تمہارے بچے کی عیادت
کے لئے آتے ہوئے ہیں گھبرا کر باہر نکلا واقعی شہر کے قاضی کو دروازے پر کھڑا پایا

ن کی خواہش پر اندر لے گیا جب عیادت کر کے قاضی رخصت ہوئے تب بشیر نے
شیم کو خطاب کر کے کہا کہ

یا بنی قد کنت امنعک من — بیٹے! تجھے علم حدیث کے سیکھنے سے
طلب الحدیث فاما الیوم — میں روکا کرتا تھا، مگر آج کے دن کے بعد
فلا صار القاضی یجیء — نہیں، شہر کا قاضی، میرے دروازے پر
الی بابی متی املت انا ھذا؟ — آنے لگا، مجھے اس کی کہاں امید تھی؟

خطیب ص۸۵ ج۱۴

ر باورچی کے اسی لڑکے کا ذکر اس وقت تک حفاظ حدیث کے سلسلے میں ان الفاظ
، ساتھ کیا جاتا ہے جیسا کہ الذہبی نے ان ہی الفاظ سے ان کا تذکرہ شروع کیا ہے

الحافظ الکبیر محدث — حدیث کے بہت بڑے حافظ اپنے وقت
العصر ص۲۲۹ ج ا تذکرۃ الحفاظ — کے محدث،

ثابت ہوا کہ اس باورچی کے لڑکے کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ عبداللہ بن المبارک جیسے
محتاط ناقد کو کہنا پڑا

من غیر الدھر حفظہ — زمانہ یعنی بڑھاپے کی وجہ سے کسی کا حافظہ
فلم یغیر حفظ ھشیم ص۲۳۰ — متاثر بھی ہو گیا ہو لیکن ہشیم ان لوگوں میں
ہیں جن کے حافظہ میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔

اور یہ تھیں قدرت کی وہ مخفی کارروائیاں جن کے ذریعہ سے اپنے آخری پیغمبر کے
متعلقہ معلومات کی حفاظت و اشاعت کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں کے رکھنے والے
دماغوں اور دلوں کو مختلف گوشوں سے اکٹھا کر کے اسی خدمت میں ان کو وہ مشغول

کر رہی تھی حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ جو بڑے بننے اور بڑھنے کے لئے
پیدا کئے گئے تھے دنیا میں بڑھنے سے ان کو روکا جاتا تھا تو وہ قدرتاً دین اور دینیا
کی طرف آکر آگے بڑھ جاتے تھے بصرہ کے ایک تابعی بزرگ جن کا نام فرقد تھا اپنے
شاگردوں کو خطاب کرکے کبھی فرماتے بھی تھے۔

ان ملوککم تقاتلوتکم	تمہارے سلاطین تم سے دنیا کے متعلق
علی الدنیا فدعوھم الدنیا	جھگڑتے اور لڑائیاں کرتے ہیں، پس مناسب
صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی ج ۳ ص ۱۹۶	ہے کہ ان کو اور ان کی دنیا کو ان ہی کے لئے
	چھوڑ دو۔

انتہا اس ذوق کی یہ تھی کہ موالی میں وہی نہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، بلکہ جو مسلم
نہیں ہوئے تھے ان کے اندر بھی اس علم کے طلب اور حصول کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا
میں یہ کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ پہلے بھی کہا ہے کہ اسلامی شہروں کے امن وامان
فراغبالی و فراخی کے چرچوں کو سن سن کر عرب کے باہر کے لوگ بھی عرب میں آکر آباد
ہو رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ ایک عیسائی طبیب جو شام کا رہنے والا
اس نے طبابت کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا اور مشہور قریشی خاندان
آل جبیر بن مطعم سے موالاۃ کا رشتہ اس نے قائم کر لیا تھا یہ پہلی صدی ہجری کے آخر
کا زمانہ تھا نام اس عیسائی طبیب کا عبدالرحمٰن اور کنیت اس کی ابوداؤد تھی ابن سعد
نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں قیام کے باوجود آخر وقت تک عیسائی ہی رہا۔ کوہ صفا
طرف حرم کی مسجد کا جو مینار تھا، اسی مینار کے نیچے اس کا مطب تھا کعبہ سے اس
کے باوجود کفر پر اس کا اصرار عجیب تھا کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے بطور ضرب المثل

یہ نقرہ مشہور ہو گیا تھا کہ

اکفر من عبد الرحمٰن — یعنی فلاں آدمی عبد الرحمٰن نصرانی سے بھی زیادہ کافر ہے

بہر حال خود تو یہ عیسائی ہی رہا اور مرا بھی اسی حال میں لیکن مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے کا یہ اثر پڑا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے بچے سب مسلمان ہو چکے تھے بلکہ بعض روائتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے باپ ہی کے اشارے سے وہ مسلمان ہوئے تھے لکھا ہے کہ بچپن ہی میں اپنے بچوں کو

یعلمھم الکتابۃ والقرآن والفقہ — لکھنے کی اور قرآن و فقہ کی تعلیم دلاتا تھا

یہ بھی لوگوں کا بیان ہے کہ

ویحثھم علی الادب ولزوم اھل الخیر من المسلمین — اپنے بچوں کو اس کا شوق دلاتا کہ ادب سیکھو اور مسلمانوں میں جو نیک کردار ہستیاں ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔

ابن سعد ص۲۶۵ ج ۴

اسی عبد الرحمٰن نصرانی کے بچوں میں داؤد جس کی وجہ سے اس نے اپنی کنیت ابو داؤد رکھی تھی۔ علاوہ دوسرے اسلامی علوم کے خصوصیت کے ساتھ حدیث میں خاص امتیاز انھوں نے حاصل کیا تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ

وکان کثیر الحدیث ص۳۶۵ ج ۵ — حدیث کا کافی ذخیرہ ان کے پاس تھا

وقت کے مستند ائمہ اور شیوخ سے داؤد نے اس علم کو حاصل کیا تھا حافظ ابن حجر نے ان کے اساتذہ میں ہشام بن عروہ ابن جریج معمر ابن خثیم عمرو بن دینار وغیرہم کا نام لیا ہے اور داؤد کے شاگردوں میں تو ہم دوسروں کے ساتھ امام شافعی اور عبد اللہ بن المبارک

جیسی مشہور ہستیوں کو بھی پاتے ہیں۔ جو داؤد کے استناد و جلالت شان کے لئے کافی ہے ابن حبان نے ان کی توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان متقنا من فقہاء اہل مکہ	بڑے سنجیدہ آدمی تھے مکہ کے فقہا میں ان کا شمار تھا
تہذیب ص ۱۹۲ ج ۳	

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر الحدیث ہونے کے ساتھ "فقہ" میں بھی ان کی قابلیت مسلم تھی سیرت و کردار کے لحاظ سے یہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجر نے ابراہیم بن محمد الشافعی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ

ما رأیت احدا اعبد من فضیل بن عیاض ولا اورع من داؤد بن عبد الرحمن ولا افرس فی الحدیث من ابن عیینۃ	میں نے فضیل بن عیاض سے زیادہ عبادت گذار اور داؤد بن عبد الرحمن (العطار) سے زیادہ پرہیزگار اور ابن عیینہ سے زیادہ حدیث کے فن میں ہوشیار آدمی نہیں دیکھا۔

فضیل بن عیاض اور ابن عیینہ جیسے اکابر کے ساتھ داؤد کا تذکرہ خود ہی بتا رہا ہے کہ اس لحاظ سے بھی مسلمانوں میں ان کا کیا مقام تھا۔ اور اس قسم کے واقعات مثلاً ابن سعد نے دمشق کے محدث عبد الرحمن بن میسرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ خواب میں ایک دفعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ان کو نصیب ہوئی خیال گذرا کہ اس سے بہتر موقعہ اور کیا ملے گا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے عبد الرحمن نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لیکن کس چیز کی دعا کرائی جاتے؟ جب یہ سوال ان کے سامنے آیا تو اس وقت دنیا اور آخرت کی باتوں میں سے ایسی بات جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرائی

جائے ان کی سمجھ میں یہی آئی جیساکہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا

یا نبی اللہ ادع لی اکون عقولا للحدیث ودعاء لہ ابن سعد ص ۱۶۳ ج ۷ قسم دوم | اے اللہ کے نبی! میرے لئے دعا فرمائیے کہ حدیث کی سمجھ مجھ میں پیدا ہوجائے اور اس کا ظرف میں بن جاؤں (یعنی حدیثیں مجھے محفوظ ہوجائیں)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں "طلب حدیث" کے متعلق لوگوں کے دل ودماغ کی کیا نوعیت تھی. گویا کہا جا سکتا ہے کہ بیداری تو بیداری خواب میں بھی اسی کا ذوق ان پر مسلط رہتا تھا۔

طلب حدیث میں سفر لوگ سوچتے نہیں ورنہ ان کی معلومات کی جستجو اور تلاش میں لوگوں کا یہ حال تھا کہ نہ وقت کی ان کو پرواہ ہوتی تھی نہ مال کی اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی جو دی جاسکتی تھی دینے والے دے رہے تھے عبدان جن کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ "الحافظ الامام رحلۃ الوقت" خود اپنا حال بیان کرتے تھے کہ اپنے سیکڑوں اساتذہ میں سے صرف ایوب کی حدیثوں کی تلاش میں

دخلت البصرۃ ثمانی عشرۃ مرۃ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۳ ج ۲ | شہر بصرہ کا اٹھارہ دفعہ میں نے سفر کیا۔

ابوحاتم رازی جو علل کے امام ہیں، لکھا ہے کہ رحل وھو امرد یعنی سبزہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طلب حدیث میں وطن سے نکل پڑے. برسوں سفر میں رہتے وطن واپس لوٹتے اور پھر روانہ ہوجاتے، خود ان کا بیان الذہبی نے نقل کیا ہے کہ

اول ما رحلت اقمت سبع | پہلی دفعہ گھر سے جب طلب حدیث میں نکلا تو

سنین تذکرہ ص ۱۳۲ ج ۲ تو سات سال تک سفر ہی میں رہا

کہتے تھے کہ شروع میں کتنے میل چلا اس کا خیال رکھا تھا۔ تین ہزار میل تک تو میں گنتار
لیکن پھر گننا چھوڑ دیا۔ پیدل کتنی لمبی لمبی مسافتیں اس راہ میں انھوں نے طے کی تھیں
اس کا اندازہ اسی سے کیجئے خود ہی بیان کرتے تھے کہ

خرجت من البحرین الی مصر بحرین سے مصر پیدل گیا پھر رملہ سے طرطوس
ماشیاً ثم الی الرملۃ ماشیا کا سفر بھی پیدل ہی کیا، اس وقت میری عمر
ثم الی طرطوس ولی بیس سال کی تھی۔
عشرون سنۃ (۲)

اطلس اٹھا کر دیکھیے اور اندازہ کیجئے کہ بحرین (عرب) سے مصر، مصر سے رملہ (فلسطین
اور رملہ سے طرطوس کا فاصلہ کتنے ہزار میلوں کا ہے خدا ہی جانتا ہے کہ اس قسم کے
سنگ و میل والے سفر میں کن کن حالات سے لوگوں کو گذرنا پڑتا تھا۔ خصوصاً اس زما
میں جب مواصلات کے موجودہ ذرائع سے دنیا محروم تھی ان ہی ابوحاتم رازی نے ا
ایک سفر کا قصہ یہ بیان کیا ہے جسے ذہبی نے نقل کیا ہے، میں اسی سے ترجمہ کرتا ہوں
ابوحاتم کہتے ہیں۔

میں اور میرے چند رفقار جہاز سے اترے، خشکی پر پہونچنے کے بعد دیکھ
تو زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ کیا کرتے، ساحل سے پیادہ پا ہم لوگ روانہ ہوتے۔
دن تک چلتے رہے لا ناکل شیئاً (قطعاً اس عرصہ میں کچھ نہ کھایا) آخر ایک رفیق
زیادہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر تھے بے ہوش ہو کر گر پڑے، لاکھ ہم لوگوں نے ا
کو جھنجوڑا، ہلایا لیکن کسی قسم کی جنبش اور حرکت ان میں محسوس نہ ہوئی، مجبوراً

چارے کو اسی حال میں چھوڑ کر آگے بڑھے تھوڑی دیر چلنے کے بعد چکرا کر آخر میں بھی گر ہی گیا، اب ایک رفیق اکیلا رہ ہی گیا، ساحل سمندر کے کنارے کنارے یہ سفر ہو رہا تھا، مجھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھا، دور سے اس کو سمندر میں ایک جہاز نظر آیا۔ دریا کے کنارے جا کر اس نے رومال ہلانا شروع کیا۔ جہاز والے متوجہ ہوتے اور چند آدمی اس سے اُتر کر اس رفیق سے ملے، حال پوچھا پیاس سے اس کا برا حال تھا، پانی کی طرف اشارہ کیا جہاز والوں نے اس کو پانی پلایا جب کچھ اس کے ہوش بجا ہوتے، تب اس نے کہا کہ میرے اور دو رفیقوں کی خدا کے لئے خبر لیجئے۔ جہاز والے اس کی راہ نمائی میں اس جگہ پہنچے جہاں میں گرا پڑا ہوا تھا منہ پر چھینٹے دئیے گئے اس وقت مجھ کو ہوش آیا۔ مجھے پانی پلایا گیا پھر اس بیچارے ضعیف العمر آدمی کے پاس لوگ پہنچے ان کو بھی ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی"۔ ص ۱۲۳ ج ۲ تذکرۃ الحفاظ۔

رحلات اور اسفار طویلہ کے یہ قصے کیا کسی ایک دو آدمی تک محدود ہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ "رحلت" یعنی طلب حدیث میں سفر کرنا اس علم کے لوازم میں سے تھا جس کے بغیر کوئی محدث محدث بن نہیں سکتا تھا کسی بڑے ممتاز آدمی کا حال اٹھا کر دیکھئے ایک طویل فہرست ان کے رحلات کی آپ کو نظر آئے گی امام بخاری ہی ہیں یہ لکھنے کے بعد کہ بچپن ہی میں امام بخاری نے عبداللہ بن المبارک کی کتابیں زبانی یاد کر لی تھیں الذہبی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

رحل مع امہ واختہ سنۃ	اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ ۲۱۰ھ ہجری
عشر ومائتین بعد ان سمع	میں سفر کیا یہ سفر امام نے ان حدیثوں کے
مرویات بلدہ من محمد	سننے کے بعد کیا تھا جنہیں اپنے شہر (بخارا) کے

بن سلام والمسندی ومحمد بن یوسف البیکندی وسمع ببلخ من مکی بن ابراھیم وببغداد من عفان وبمکۃ من المقری، وبالبصرہ من ابی عاصم والانصاری وبالکوفۃ من عبداللہ وموسیٰ وبالشام من ابی المغیرۃ والفریابی وبعسقلان من آدم وبحمص من ابی الیمان، وبدمشق من ابی مسہر

عمار محمد بن سلام مسندی محمد بن یوسف بیکندی سے وہ روایت کرتے تھے امام نے بلخ میں مکی بن ابراہیم سے بغداد میں عفان سے مکہ میں مقری سے بصرہ میں ابو عاصم اور الانصاری سے کوفہ میں عبداللہ اور موسیٰ سے شام میں ابو المغیرہ و فریابی سے عسقلان میں آدم سے حمص میں ابو الیمان سے دمشق میں ابو مسہر سے حدیثیں سنیں۔

ص ۱۲۲ ج ۲ تذکرۃ الحفاظ ذہبی

حالانکہ یہ فہرست قطعاً غیر مکمل ہے اس میں نہ مدینہ کا نام ہے اور نہ یمن کا اور نہ بہت سے دوسرے شہروں کا جہاں امام بخاری حدیث ہی کی جستجو میں گئے، تاہم اس ناقص فہرست میں بھی آپ کو بخارا اور بیکند (جو امام بخاری کا وطن ہے) اس کے سوا بلخ، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، حمص، دمشق جیسے شہروں کے نام درج ہیں جن میں ہزار ہا ہزار میل کے فاصلے ہیں۔ الخطیب نے امام کے علمی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

رحل فی طلب العلم الی سائر

علم کی طلب میں تمام (اسلامی) شہروں کا امام

محمل فی الامصار ص ۱۲۲ ج ۲ بخاری نے سفر کیا۔

امام بخاری کے بعد اسی طرح حافظ ابوزرعہ کے تذکرے میں ذہبی ہی لکھتے ہیں کہ حرمین عراق شام جزیرہ خراسان مصر میں وہ گھومتے رہے جیسا کہ میں نے کہا کسی محدث وحافظ کا تذکرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے ان مقامات اور بلاد کی ایک طویل فہرست آپ کو مل جائے گی، جہاں ان کی علمی تشنگی ان کو لئے لئے پھرتی تھی۔ غریب الوطنی کی عام صعوبتوں کے سوا جن سے پردیسی مسافر کو بہرحال دوچار ہی ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کے لمبے لمبے سفر، اور سفر ہی نہیں بلکہ طلب علم کے لئے چونکہ سفر کیا جاتا تھا، اس لئے لازماً ایک ایک جگہ میں ان لوگوں کو مہینوں اور بسا اوقات برسوں بسر کرنے پڑتے تھے آج بھی تعلیمی سفر اختیار کرنے والے طلبہ جو امریکہ ویورپ جاتے ہیں، دو دو چار چار سال بعد وطن واپس ہوتے ہیں تو اندازہ کرنا چاہیئے، اس زمانہ کا اور طلب علم کے اس حال کا کسی موقعہ پر ذکر آچکا ہے کہ ایک ایک حدیث کے لئے مدینہ سے مصر کا لوگ سفر اختیار کرتے تھے، یا کسی شہر میں سال سال بھر اس لئے پڑے رہے کہ جن سے حدیث کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ خصوصاً حفاظ کا جو یہ عام دستور تھا کہ روزانہ دس پانچ حدیثوں سے زیادہ نہیں بیان کرتے تھے اسی سے اندازہ کیجئے کہ لوگوں کو ایک ایک استاد کے پاس کتنے دن ٹھہرنا پڑتا ہوگا علی الخصوص ذخیرۂ حدیث کے بڑے سرمایہ داروں کے پاس یحییٰ بن سعید القطان خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ صرف ایک استاد کے پاس ان کو دس سال گذارنے پڑے خطیب نے بجنسہ یہ الفاظ ان سے نقل کئے ہیں۔

لزمت شعبة عشر سنة ص ۱۳۶ ج ۱۴ تاریخ بغداد شعبہ کے پاس میں دس سال تک ٹھیرا رہا

موطا کے نسخۂ خاص کے راوی قعنبی امام مالک سے یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

کان الرجل یختلف الی الرجل ثلثین سنۃ فیتعلم منہ حلیۃ الاولیاء	آدمی کا قاعدہ تھا کہ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت رکھتا تھا جب علم سیکھتا تھا۔

بظاہر ان الفاظ سے امام مالک نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کا یہ عام حال ہو کہ لوگ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، خود امام مالک ہی کے متعلق نافع بن عبداللہ کے حوالہ سے حلیہ ہی میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ

جالست مالکا اربعین سنۃ او خمسا و ثلثین کل یوم ابکر و اھجر	میں امام مالک کے پاس چالیس یا پینتیس سال تک بیٹھتا رہا روزانہ صبح کو بھی حاضر ہوتا دوپہر کو بھی پچھلے پہر بھی۔

زہری کہا کرتے تھے

مسست رکبتی رکبۃ سعید بن المسیب ثمان سنین	سعید بن المسیب کے زانو سے زانو ملا کر میں نے آٹھ سال گذارے ہیں۔

اور اس پر بھی یہ حال تھا کہ بعض دفعہ جیسا کہ زہری سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ

تبعت سعید بن المسیب فی طلب حدیث ثلثۃ ایام	ایک حدیث کی تلاش میں سعید بن المسیب کا پیچھا میں نے تین دن تک کیا رغالباً تین دن کے فاصلہ پر کہیں سعید تھے۔

اللہ اکبر! ان لوگوں کے ذوق جستجو کا یہ حال تھا جیسا کہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس اپنے متعلق کہتے تھے کہ ایک قرآنی آیت کے شان نزول کی تلاش میں چودہ سال سرگرداں رہا آخر اس کا پتہ

چلا چھوڑا (فتح القدیر شوکانی ج ۱)

ایک عجیب واقعہ ذرا اس راہ کے وارستہ مزاجوں کے شوق بے پروا کو ملاحظہ فرمایئے حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ ایک صاحب جن کا نام غالب القطان تھا، بصرہ کے رہنے والے تھے، تجارت کا کاروبار کرتے تھے تجارت ہی کے سلسلہ میں ایک دفعہ کوفہ پہنچے۔ اگرچہ حدیث کے باضابطہ طالب العلم نہ تھے لیکن اس علم کا گونہ ذوق رکھتے تھے۔ خیال گذرا کہ جب تک کوفہ میں قیام ہے، محدث کوفہ اعمش کے حلقہ میں حدیثوں کے سننے کا اگر موقع مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہی سوچ کر اعمش کے حلقہ میں آمد و رفت کرتے رہے کہتے ہیں کہ کام جس کے لئے آیا تھا جب ختم ہو گیا تو جس دن کی صبح کو کوفہ سے روانگی کا ارادہ تھا، میں نے اس صبح کی رات اعمش ہی کے پاس گزاری۔ تہجد کے وقت میری بھی آنکھ کھل گئی، اس وقت اعمش قرآن کی ایک آیت[1] کا بار بار اعادہ کر رہے تھے، اور اس آیت کے متعلق کچھ کہتے بھی جارہے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس آیت کے سلسلے میں کوئی خاص علم (یعنی حدیث) ان کے پاس ہے صبح کو جب رخصت ہونے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت رات قرآن کی جس آیت کو بار بار دُہرا دُہرا کر آپ پڑھ رہے تھے اور اسی کے ساتھ کچھ فرماتے جاتے تھے کیا اس باب میں آپ تک کوئی حدیث پہنچی ہے؟ میں آپ کے پاس قریب قریب ایک سال سے آجا رہا ہوں، لیکن اس حدیث کا ذکر آپ نے نہیں فرمایا، مطلب

---

[1] یہ سورہ آل عمران کی آیت شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملئکۃ واولوا العلم قائما بالقسط لا الہ الا ھو العزیز الحکیم ان الدین عند اللہ الاسلام" ہے ۱۲

یہ تھا کہ اب جا رہا ہوں اس حدیث کو بھی سنا دیجئے، غالب کہتے ہیں کہ یہ سننے کے ساتھ ہی اعمش کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ خدا کی قسم ایک سال تک تو اس حدیث کو تم سے میں نہیں بیان کروں گا، بس یہی سننے کی بات ہے آتے ہوتے ہیں تجارتی اغراض سے طلب علم مقصود بھی نہیں ہے، لیکن ایک حدیث کے سننے کا شوق غالب میں پیدا ہوگیا، چوں کہ اعمش کی زبان سے قسم نکل گئی تھی اس لئے شوق کی تکمیل کی اس کے سوا اور کوئی دوسری شکل نہ تھی کہ اعمش کی قسم کی تکمیل کے انتظار میں کاروبار کے نفع ونقصان سے قطع نظر کر کے پورا سال کوفہ میں گذار دیں، یا پھر اس شوق ہی سے دست بردار ہو جائیں بات کوئی بڑی بھی نہ تھی، ایک حدیث کا معاملہ تھا، اور وہ بھی تفسیری حدیث کا، جس کی محدثین کی نگاہوں میں اتنی اہمیت بھی نہیں، مگر دنیا میں تاریخ کا یہ وہ دور تھا جس میں ایک ایک بات جو کسی نہ کسی حیثیت سے پیغمبر کی طرف منسوب ہو، اس کی قدر وقیمت کا یہ حال تھا کہ غالب القطان کہتے ہیں کہ

فاقمت وکتبت علی باب ذلك	میں ٹھیر گیا (وطن کی واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا)
الیوم	اور اعمش کے دروازے پر اس دن کی جو تاریخ تھی اسے لکھ دیا۔

اور ہفتہ دو ہفتہ مہینے دو مہینے نہیں کامل بارہ مہینے اس انتظار میں گذارتے رہے کہ سال کے پورا ہونے کی تاریخ کب آتی ہے وہی کہتے ہیں کہ

فلما مضت السنة قلت یا ابا محمد	جب سال گذر گیا تو میں نے عرض کیا کہ اے ابو محمد
قد مضت السنة ص۹۹ جامع	(اعمش کی کنیت تھی، سال گذر گیا اب وعدہ پورا کیجئے)

آخر اعمش سے اس حدیث کو سن لینے کے بعد وہ گھر واپس لوٹے۔ میں نہیں سمجھتا

کہ اس روایت پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت ہے حافظ ابو عمر بن عبد البر نے محض یونہی کسی عام معمولی تاریخی روایت کی حیثیت سے اس قصہ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے بلکہ باضابطہ مسلسل سند جو غالب قطان پر جاکر منتہی ہوتی ہے اس سند کے ساتھ اس واقعہ کو انھوں نے خود قطان کی زبانی نقل کیا ہے۔ جہاں تک سند کے رواۃ ہیں میرے خیال میں سب ہی معتبر اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔

اس عہد کے واقعات اس سلسلہ میں جو پیش آتے ہیں سب کا استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ چیدہ چیدہ چند روایتیں میں نے اس لئے درج کی ہیں کہ جس زمانے میں حدیث کے ساتھ قلوب کے تعلقات کی یہ نوعیت ہو، ایک ایک حدیث کے لئے مکانی ہوں یا زمانی ہر قسم کے فاصلے صفر کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے غور کرنا چاہئے کہ حفظِ حدیث کے متعلق جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں کیا کسی حیثیت سے بھی ان پر تعجب و تحیر درست ہو سکتا ہے جب حدیث کے مقابلہ میں اس علم کے حاصل کرنے والے کسی دوسرے کام کام اور کسی دوسری ضرورت کو ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے اور یہ حال تو ان کی جفاکشی اور وقتی قربانیوں کا تھا۔ اسی راہ میں قربانی کرنے والوں نے جو مالی قربانیاں پیش کی ہیں، وہ ان سے کیا کچھ کم تھیں۔ امام احمد بن حنبل کے ایک ساد نی الحدیث جن کا نام ہثیم بن جمیل تھا، اور بڑے بڑے حفاظ وقت سے شرف تلمذ رکھتے تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، عبداللہ بن المثنی الانصاری جیسے اکابر شریک ہیں بہرحال ان ہی ہثیم بن جمیل کے تذکرے میں خطیب نے لکھا ہے

افلس الهيثم بن جميل فی طلب الحديث ہثیم بن جمیل علم حدیث کے طلب میں دلو

مرتین   تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۵۶   دفعہ افلاس اور بے نوائی کے شکار ہو تے

(یعنی ایک پیسہ بھی گرہ میں نہ رہا سب خرچ کر ڈالا

ہیثم کا اصل وطن بغداد تھا، شائد مالی دقتوں کی وجہ سے یا واللہ اعلم کس وجہ سے شام کے شہر انطاکیہ میں آکر بعد کو مقیم ہو گئے تھے ۲۱۳ھ میں وفات ہوئی۔ امام مالک کے مشہور استاذ ربیعۃ الرائے کے متعلق امام مالک ہی کا قول حافظ ابو عمرو بن عبد البر نے نقل کیا ہے۔ یعنی امام مالک یہ فرماتے ہوئے کہ

"اس علم میں (حدیث میں) کمال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ آدمی ناداری اور فقر کا مزہ چکھے"

نظیر میں اپنے استاد ربیعہ کا حال بیان کرتے کہ

اسی علم کی تلاش و جستجو میں ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ آخر میں گھر کی چھت کی کڑیاں تک ان کو بیچنی پڑیں اور اس حال سے بھی گذرنا پڑا کہ مزبلہ (جہاں خس و خاشاک آبادی کی ڈالی جاتی ہے) سے منقے یا کھجوروں کے ٹکڑے چن چن کر کھاتے تھے۔ جامع بیان

گھر کی کڑیوں کے بیچنے کے سلسلے میں قصہ قاضی ابو یوسف کا یاد آتا ہے جس کا ذکر حنفی طبقات کی کتابوں میں کیا گیا ہے یعنی امام ابو یوسف پر ایک زمانہ وہ بھی گذرا تھا کہ کھانے کو جب کچھ نہ رہ گیا تو سسرال کے گھر کے چھپر کی کڑی نکال کر بازار بھیجی تاکہ جو پیسے اس سے ملیں ان سے خوراک کا سامان کیا جائے۔ بظاہر بی بی صاحبہ جو شاید گھر کی مالکہ تھیں انھوں نے تو اجازت دے دی تھی۔ لیکن قاضی صاحب کی ساس کو اپنے سعادتمند لائق کماؤ داماد کی اس حرکت کی جب خبر ہوئی تو کہتے ہیں کہ بڑی بی سے نہیں رہا گیا اور کچھ بول اٹھیں، لکھا ہے کہ قاضی صاحب کی غیرت میں اسی واقعہ سے حرکت پیدا ہوئی، پھر علم نے جہاں تک

ان کو پہنچایا اس سے کون ناواقف ہے حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے بھی قاضی صاحب کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے خود کہتے تھے کہ۔

"میرے ساتھ پڑھنے والوں کی یوں تو کافی جماعت تھی لیکن بھائی جس بیچارے کے دل کی دباغت دہی سے کی گئی تھی، نفع اُسی نے اُٹھایا"

پھر خود ہی دل کی اس دباغت کا مطلب یہ بیان کرتے کہ

ابوالعباس (سفاح) عباسی کے ہاتھ میں خلافت کی باگ جب آئی (اور کوفہ کے قریب ہی ہاشمیہ میں اس نے قیام اختیار کیا) تو اس نے مدینہ منورہ سے اہل علم وفضل کو وہیں طلب کیا (میں نے اس موقعہ کو غنیمت خیال کیا) اور ان لوگوں کے پاس استفادے کے لئے حاضر ہونے لگا میرے گھر کے لوگ میرے کھانے کا انتظام یہ کر دیتے تھے کہ چند روٹیاں ٹھوک لی جاتی تھیں اور دہی کے ساتھ بندہ کھا کر سویرے سے درس وافادے کے حلقوں میں حاضر ہو جاتا لیکن جو اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان کے لئے ہریسہ یا عصیدہ تیار ہولے تب اس کا ناشتہ کر کے جائیں گے ظاہر ہے کہ ان کے وقت کا کافی حصہ اسی کی تیاری میں صرف ہو جاتا تھا اسی لئے جو چیزیں مجھے معلوم ہو سکیں ان سے یہ عصیدہ اور ہریسہ والے حضرات محروم رہے۔ ص ۹۷ ج ۱ جامع

یہ تو ایک ذیلی قصہ تھا، میں ذکر ان محدثین کی مالی قربانیوں کا کر رہا تھا۔ فن رجال کے امام الائمہ یحییٰ بن معین کے حال میں لکھا ہے کہ ان کے والد نے جو اس زمانہ کے کسی والی کے سکریٹری تھے، کافی سرمایہ حاصل کیا تھا، جس وقت ان کی وفات ہوئی تو دس لاکھ پچاس ہزار درم صاحبزادے کے لئے چھوڑ کر مرے۔ بے چارے کا خیال ہوگا کہ اس روپے

سے بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرے گا، لیکن کسی قصبہ یا محلّہ کے رئیس بن کر رہ جاتے، خدا نے ان کو اتنا چھوٹا بنا کر پیدا نہیں کیا تھا، رہتی دنیا تک ان کا نام عظمت و احترام سے لیا جائیگا کہ اللہ کے آخری رسولؐ کی حدیثوں کو اغلاط اور آلودگیوں سے پاک و صاف کیا۔ قسمت میں تو ان کے یہ لکھا ہوا تھا۔ یہ سارا سرمایہ جو باپ سے ان کو ملا تھا، جانتے ہیں اس کا استعمال یحییٰ نے کیا کیا۔ الخطیب نے اپنی متصل سند سے روایت درج کی ہے کہ

فانفقه كله على الحديث حتى لم يبق له نعل يلبسه ص ۱۷۸ ج ۱۴

(ساڑھے دس لاکھ درم کی ساری رقم یحییٰ بن معین نے مسلم حدیث کے حاصل کرنے میں خرچ کر ڈالی نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخر میں ان کے پاس جپل تک باقی نہ رہا جسے وہ پہنتے یعنی ننگے پاؤں پھرنے لگے)

اور یہ قصہ کہ آخر میں اتنا بھی نہ رہا کہ چپل خرید کر پہن سکیں، ایک یحییٰ بن معین ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے، یہی امام بخاری کیا امام بخاری یوں ہی ہو گئے تھے ان کے ایک رفیق درس عمر بن حفص الاشقر کے حوالہ سے خطیب نے لکھا ہے کہ

بصرہ میں ہم محمد بن اسمٰعیل (یعنی امام بخاری) کے ساتھ حدیث لکھا کرتے تھے (یعنی استاذوں سے سن کر حدیث روایت کرتے تھے) چند دنوں کے بعد محسوس ہوا کہ بخاری کئی دن سے درس میں نہیں آ رہے ہیں، تلاش ہوئی کہ بیچارے کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ جہاں مقیم تھے ڈھونڈتے ہوئے ہم لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑے ہیں بدن پر لباس نہیں ہے (یعنی جس لباس کو پہن کر لوگ باہر نکلا کرتے تھے) دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ

تلا لغد ما عند کا ولم یبق معہ شیئ — جو کچھ ان کے پاس تھا سب ختم ہو چکا کچھ باقی نہ رہا جس سے لباس تیار کرتے۔

آخر ہم لوگوں نے مل کر رقم جمع کی اور رعز یہ کو کپڑا لاتے۔ تب پہن کر بیچارے ہم لوگوں کے ساتھ درس گاہ آنے جانے لگے صلہ ۱۲ تاریخ بغداد

یہی حادثہ امام احمد بن حنبل کے ساتھ پیش آیا، مکہ معظمہ میں سفیان بن عیینہ کے س جس زمانہ میں پڑھتے تھے، ان کے رفقاء کا بیان ہے کہ ایک دن دیکھا کہ خلاف معمول حمد بن حنبل درس سے غائب ہیں، حال دریافت کرنے کے لئے ان کی فرودگاہ پہنچے ر چھپے بیٹھے تھے، معلوم ہوا کہ سارا کپڑا ان کا چوری گیا۔ اور دام بھی گرہ میں نہیں ہیں۔ وایت کے بیان کرنے والے صاحب جن کا نام علی بن الجہم تھا، کہتے تھے کہ میں نے امام ا خدمت میں اشرفی پیش کی، عرض کیا کہ چاہے ہدیۃً قبول فرمائیے یا قرضاً لیجئے۔ لیکن انھوں نے لینے سے انکار کیا۔ تب میں نے کہا کہ معاوضہ ہے کہ میرے لئے کچھ کتابت ہی کر دیجئے سا پر راضی ہو گئے۔ علی بن جہم نے بطور تبرک امام کے دستِ مبارک کے اس مخطوطہ کو لہ چھوڑا تھا، لوگوں کو دکھاتے اور لکھنے کی شان نزول کو بھی اس کے ساتھ بیان کرتے

ابن عساکر صلہ ۳۷ ج ۲

امام احمد کے واقعات اس سلسلے میں اتنے ہیں کہ سب کے درج کرنے کی یہاں

جس گھر میں امام صاحب رہتے تھے ایک بڑھیا بھی وہاں رہتی تھی وہی یہ قصہ بیان کرتی تھی کہ امام احمد بن حنبل ا ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے کہ پیچھے کسی نے کپڑے ان کے چرا لئے، جب امام آئے تو ن کی خبر ہوئی بڑھیا کا بیان ہے کہ اس شخص نے کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا کہ ہیں یا نہیں صرف ان ردوں کو دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں؟ جو طاق پر بچ کر رہ گئے تھے۔ ۱۲

گنجائش نہیں ان کے ہی استاذ عبدالرزاق لوگوں کو یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ جب احمد بن حنبل میرے پاس (حدیث پڑھنے کے لئے) یہاں یمن آئے تو میں نے ان سے کہا کہ یمن کوئی کاروباری ملک نہیں ہے، پھر میں نے چند اشرفیاں پیش کیں لیکن لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے اسی زمانہ میں اسحاق بن راہویہ بھی عبدالرزاق ہی کے پاس امام احمدؒ کے ساتھ حدیث سنا کرتے تھے اسحاق نے ایک طویل قصہ کا ذکر کرتے ہوئے اسی میں بیان کیا ہے کہ ازار بند بن بن کر امام احمد یمن میں اپنی ضرورت ان ہی ازار بندوں کو بیچ کر پوری کیا کرتے تھے۔ دوسروں نے لاکھ کچھ قبول کر لینے پر اصرار کیا لیکن ہمیشہ انکار کر دیا کہتے ہیں کہ جب کام سے فارغ ہو کر یمن سے امام چلنے لگے تو نانبائی کے کچھ روپے حضرت پر رہ گئے۔ جوتا پاؤں میں تھا اسی کو روپے کی جگہ نانبائی کے حوالے فرما دیا خود پیدل روانہ ہوئے اونٹوں پر بار لادنے والے اور اتارنے والے مزدوروں میں شریک ہو گئے، جو مزدوری ملتی تھی وہی زاد راہ کا کام دیتی تھی (ان سارے واقعات کا ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے) (دیکھئے ج ۲)

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا واقعات میں گو حضرت امام کی سیر چشمی، بلند نظری کی شہادتوں کے عناصر زیادہ شریک ہیں لیکن اسی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس قسم کی زندگی سے اپنے آپ کو ان بزرگوں نے رضامند کر لیا تھا۔ ان کی طرف محنت و جفاکشی کے جو واقعات بھی منسوب کئے جائیں ان میں شک کرنے کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟ علم حدیث میں لوگ کہتے ہیں کہ شعبہ بن الحجاج امیر المومنین سمجھے جاتے تھے، ہم ان کی سوانح عمری میں پڑھتے ہیں کہ ستر بہتر کی عمر گزارنے کے باوجود اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاشی فکر میں الجھانا پسند نہ کیا، ذہبی نے لکھا ہے

ما اکل شعبۃ من کسبہ قط ص ۱۴۴ ج ۱ — اپنی کمائی سے شعبہ نے کبھی نہیں کھایا

ان کو یہ کرنا چاہیے تھا یا نہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ الگ سوال ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ ایک آدمی حدیث ہی نہیں بلکہ جس علم میں کچھ بنا چاہتا ہے امیر بن سکتا ہے۔ قلب کی اس فارغ البالی کا کوئی ٹھکانا ہے ان ہی شعبہ کے متعلق ابوقطن کے اس بیان سے ذہبی نے نقل کیا ہے کہ

ما رأيت شعبة قد ركع إلا قلت إنه نسي ولا سجد إلا قلت نسي ص ۱۸۲ ج ۱

میں نے شعبہ کو رکوع میں جب کبھی دیکھا تو یہی خیال گذرتا تھا کہ بھول گئے (یعنی رکوع میں ہیں، شاید اس کا خیال دماغ سے ان کے نکل گیا) اسی طرح جب کبھی سجدے میں دیکھا تو خیال کیا کہ بھول گئے۔

بظاہر اس حال کا تعلق نفلی نمازوں سے معلوم ہوتا ہے اسی کے ساتھ ان ہی محدثین کے اس عام نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھیے، جو ان میں سے کسی ایک کی طرف نہیں بلکہ متعدد بزرگوں کی طرف منسوب ہے۔ مثلاً حافظ ابن جزرہ معافی بن عمران الموصلی سفیان ثوری جنھیں "یاقوتۃ العلماء" کہا کرتے تھے، ان ہی معافی سے پوچھنے والے نے پوچھا کہ رات کو نمازوں میں مشغول رہنا یا حدیث کے لکھنے، یاد کرنے میں رات گذارنا۔ ان دونوں مشغلوں میں آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں؛ حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ جواب میں معافی نے کہا ہے کہ

۱؎ آخر عمر میں شعبہ اپنے طریقۂ کار کی خود مذمت کیا کرتے تھے شاگردوں سے کہتے کہ ہماری طرح نہ بن جانا کہ میں اپنے بھائیوں کے سینہ کا بوجھ بنا ہوا ہوں۔ لکھا ہے کہ حماد اور بشار نامی شعبہ کے دو بھائی تھے عراف کا کام کرتے تھے وہی ان کے اور ان کے اہل و عیال کے مصارف کے متکفل تھے شعبہ کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے کہ جو طلب حدیث میں مبتلا ہوا فقر و فاقہ میں مبتلا ہوا اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ خود اس کے شکار ہوتے اپنا حال بیان کرتے ہوئے کبھی شعبہ یہ بھی کہتے کہ اسی طلب حدیث کے قصہ میں اپنی والدہ کا طشت سات دینار میں مجھے بیچنا پڑا ص ۱۸۳ ج ۱ تذکرہ

حدیث تکتبہ احب الی من قیام لیلۃ — حدیث کا لکھنا میرے نزدیک اس سے زیادہ

من اول اللیل الی آخرہ ص۲۴ جامع — بہتر ہے کہ رات بھر اول سے آخر تک تم نمازیں

پڑھتے رہو۔

اور یا تو یہ العلماء کا جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کوئی ذاتی مذاق نہ تھا۔ امام احمد بن حنبل بھی لوگ

سے یہی فرماتے کہ

"علمی اشتغال میں رات کے کسی حصہ کو بسر کرنا میرے نزدیک احیاء شب (

نماز پڑھنے سے) زیادہ بہتر ہے"

سائل نے دریافت کیا کہ علم سے آپ کی مراد کیا ہے، فرمایا کہ اپنے دین کے معلو

کو بڑھانا، اس نے کہا کہ کیا اسی نماز روزہ حج نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق یہ معلومات

آپ علم کہتے ہیں۔ فرمایا کہ ہاں! یہی زہری تو اسی بنیاد پر کہتے تھے کہ دین میں سمجھ پیدا کر۔

کی کوشش اس سے زیادہ بہتر عبادت اور کیا ہو سکتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ جب خود نبوت

صحبت یافتوں کا فتویٰ تھا۔ ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ

"تھوڑی دیر بیٹھ کر دین کے سمجھنے میں (یعنی تفقہ) میں بسر کرنا میرے نزدیک

بھر (نمازوں) میں جاگنے سے بہتر ہے"

اس باب میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کا ایک ذخیرہ کتابو

میں پایا جاتا ہے، بلکہ خود قرآن میں اسی اصول کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔ اسی لئے امام

شافعی کا تو عام فتویٰ تھا کہ علم کا حاصل کرنا نفلی نمازوں سے بہتر ہے۔ مصر کے امام ابن وہ

امام مالک کے ارشد تلامذہ میں ہیں، وہی کہا کرتے تھے کہ امام مالک کے سامنے میں پڑ

رہا تھا اتنے میں ظہر یا عصر کا وقت آگیا کتاب بند کر کے میں (نفل کی) نیت سے اٹھا۔ اما

سمجھ گئے اور فرمانے لگے کہ

"تعجب ہے جس چیز میں تم مشغول تھے کیا اس سے بھی وہ کام زیادہ بہتر ہے جس کو اب کرنا چاہتے ہو"

پھر فرمایا کہ "نیت" درست ہو تو وہ بہتر ہے جس میں تم مشغول تھے"

حافظ ابن عبد البر نے اس قسم کے بیسیوں اقوال صحابہ تابعین اور ائمہ کے نقل کئے ہیں، میری غرض ان کے ذکر سے اس وقت یہ ہے کہ اب وہ غلط ہو یا صحیح، اس سے بحث نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ جن کے قلوب میں اس علم نے اپنی اتنی گہری جگہ بنالی تھی کہ دنیا تو خیر دنیا ہی ہے وہ فرائض کے سوا سارے دینی مشاغل پر بھی اس علم کی مشغولیت کو ترجیح دیتے تھے جب نوافل میں ان کے استغراق اور یکسوئی کا یہ حال تھا کہ سجدہ میں گئے تو سجدہ ہی میں پڑے ہوئے ہیں رکوع میں ہیں تو رکوع سے سر اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ حتیٰ کہ دیکھنے والا بے چارہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا کہ بھول گئے ان ہی لوگوں کے متعلق سوچئے کہ اس علم کی طلب و تلاش میں ان کی کوششوں کی کیا کیفیت ہو گی جو نفلی نمازوں کو اتنا وقت دے سکتا ہو، غور کرنا چاہئے کہ جو چیز ان کی نگاہوں میں ان نمازوں سے بھی بہتر تھی اس کے لئے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے کیا اس میں کوئی دقیقہ کوشش کا انھوں نے اٹھا رکھا ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دین ہی جس کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے اس کے نزدیک دینی معلومات کی ظاہر ہے کہ کیا وقعت ہوگی لیکن جو دین کو ایک واقعہ یقین کر چکا ہو اسی قسم کا واقعہ جیسے دین کے انکار کرنے والوں کی نگاہوں میں "دنیا" ایک واقعہ ہے پھر اس دنیا (یعنی زندگی کا وہ وقفہ جسے شکم مادر سے نکلنے اور شکم قبر میں جانے کے درمیان آدمی گذارتا ہے) اسی زندگی میں نفع پہنچانے والے معلومات کی جستجو اور تلاش میں جب وہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے

جس کا تماشا آج ہم ان ممالک میں کر رہے ہیں جہاں انسانی زندگی اسی وقفہ تک محدود سمجھی جاتی ہے تو آپ کو جد و جہد کے اس سلسلہ پر اور ان کے نتائج پر کیوں تعجب ہوتا ہے، جو دینی معلومات کے حاصل کرنے والے بزرگوں کی طرف کتابوں میں منسوب کئے گئے ہیں بزرگوں کی وہی جماعت جس میں اس یقین کے پیدا کرنے میں پیغمبروں نے کامیابی حاصل کی تھی کہ اسی دو شکمی وقفہ میں انسانی زندگی گھٹ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ آدمی جس زندگی کو چاہتا ہے کہ کبھی ختم نہ ہو انھوں نے یقین دلایا ہے کہ واقعی یہی ہے دین چوں کہ اسی ختم نہ ہونے والی لامحدود زندگی کے متعلقہ معلومات کا نام ہے اس لئے زندگی کو لامحدود یقین کرنے والوں میں اس زندگی کے متعلقہ معلومات کے جاننے کی تڑپ اگر پیدا ہوئی تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، جس حد تک اس لامحدود زندگی کے یقین کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی اسی نسبت سے ان معلومات کی تلاش و جستجو کے جذبہ میں شدت پیدا ہو رہی تھی جن سے اس زندگی کے نفع و ضرر کا تعلق تھا جن معلومات سے دو شکمی وقفہ والی زندگی کے مشکلات کے حل میں مدد ملتی ہو یا سہولتوں میں اضافہ ہوتا ہو، جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ ان کے لئے گھسنے والے سمندروں میں گھس رہے ہیں پہاڑوں کو کھود رہے ہیں۔ اور جو کچھ ان کے امکان میں ہے سب کچھ کر رہے ہیں تو لامحدود زندگی کو واقعہ یقین کرنے والوں کے متعلق جب یہ سنایا جاتا ہے کہ الدین کے یقین و اعتماد کا جو اصلی سرچشمہ تھا اور جس کی زندگی کا ہر پہلو الدین کے لئے نئے انکشافات کی حیثیت رکھتا تھا، ان ہی انکشافات کی راہوں میں انھوں نے وہ سب کچھ لگا دیا جسے وہ لگا سکتے تھے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی توقع کے قائم کرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی یہی امیر المومنین فی الحدیث شعبہ جن کے سجدوں اور رکوع کی کیفیت آپ سن چکے۔ ان ہی کے متعلق اگر یہ بھی سنایا جاتا ہے کہ

كان لا يرضى الا ان يسمع الحديث عشرين مرة
جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کو شعبہ بیس مرتبہ نہیں سن لیتے تھے انھیں چین نہیں آتا تھا۔

جس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یعنی ایک ہی استاذ کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو اسی استاذ سے بیس دفعہ جب تک نہیں سن لیتے تھے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی، اور محدثین یہ بھی کرتے تھے ہشیم کے حالات میں خطیب نے لکھا ہے کہ ان کے شاگرد ابراہیم بن عبداللہ الہروی کہا کرتے تھے

ما من حديث هشيم الا وسمعته منه ما بين عشرين مرة الى ثلثين مرة (ص ۸۵ ج ۱۴ تاریخ بغداد)
ہشیم سے جو حدیثیں میں روایت کرتا ہوں ان سے ان حدیثوں کو کم و بیش بیس سے تیس مرتبہ تک میں نے سنا ہے۔

اسی طرح معن بن عیسیٰ کا بھی دعویٰ تھا کہ امام مالک سے جتنی حدیثیں وہ روایت کرتے تھے ان کے متعلق کہتے تھے کہ

قل سمعته منه نحوا او اكثر من ثلثين مرة (ص ۱۲۳ ج ۱ طبقات الاولياء)
میں نے امام مالک سے یہ حدیثیں تیس مرتبہ سنی ہیں، یا اسی کے قریب قریب

اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی حدیث کو شعبہ جب تک کم از کم بیس استاذوں سے نہیں سن لیتے تھے ان کو اطمینان نہیں ہوتا تھا جیسا کہ معلوم ہے یہ بھی محدثین کا عام مذاق تھا، یحییٰ بن معین کو تو اس پر اتنا اصرار تھا کہ لوگوں سے وہ کہا کرتے تھے۔

لولم نكتب الحديث من ثلاثين وجها ما عقلناه (ص ۱۷۹)
جب تک کسی حدیث کو تیس ذریعوں سے ہم لوگ نہیں لکھتے اس وقت تک اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

اس زمانے کے حساب سے ٹھیک اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک ہی واقعہ ہوتا ہے مختلف نیوز ایجنسیاں اپنے اپنے الفاظ اور اپنی اپنی تعبیر میں اس واقعہ کی خبر اخباروں کو بھیجتی ہیں۔ جو لوگ سیاسی کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں یا تحقیقی اخبار نویسی کا کام کرتے ہیں، یا صحیح واقعات کے علم کا جن لوگوں کو ذوق ہوتا ہے وہ بجنسہ ایک ہی واقعہ کی خبر کو مختلف اخباروں میں پڑھتے ہیں اور نیوز ایجنسی کی تعبیروں کو ملانے کے بعد واقعہ کی اصل نوعیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں یہ لوگ اخباروں کا مطالعہ ان ہی التزامات کے ساتھ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے علم اور ان کے فیصلوں کی نوعیت عام اخبار بینوں سے کیا کوئی نسبت رکھتی ہے[1]

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ حدیثوں کی تعداد بتاتے ہوئے عام کتابوں میں لاکھوں تک ان کے شمار کو پہنچا دیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] مثلاً بہت سی باتیں کسی ایجنسی کی خبر میں مجمل رہ جاتی ہیں۔ دوسری نیوز ایجنسی کی خبر میں اسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے بعض دفعہ نامہ نگار میں سلیقہ اس کا نہیں ہوتا کہ گُر کی بات اور عام باتوں میں تمیز کر سکے لیکن ہوشیار نامہ نگار بھیجی ہوئی خبروں میں اسی کا انتخاب کرتا ہے یا اسی پر زیادہ زور اپنے بیان میں خرچ کر دیتا ہے بعض دفعہ خبر کی نوعیت کا اظہار ایک ایجنسی کا نامہ نگار کرتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے جن کی نظر سب پر ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس حد تک خبر قابل اعتماد ہو سکتی ہے بلکہ مختلف اخباروں کے پڑھنے سے ان لوگوں کو اس کا بھی فائدہ ہوتا ہے کہ بعض بالکل بے بنیاد جھوٹی خبریں اخباروں میں کسی خاص غرض سے جو شائع ہو جاتی ہیں محتاط اخبار یا ایجنسیاں ان کے ذکر سے پرہیز کرتی ہیں لیکن بعض اخباروں یا ایجنسیوں کو اسی میں مزہ آتا ہے ۱۲

ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی

از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی

محمد اکبر شاہ شاہ عالم کے منجھلے بیٹے تھے بدھ کے دن ۷ رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ کو نکن پور زاہدان میں "مبارک محل" کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

"مبارک محل" خاندان سادات سے تھی۔ ذی الحجہ سنہ ۱۱۷۱ھ میں شاہ عالم نواب نجیب الدولہ کے پاس قیام پذیر تھے وہیں ان سے عقد کیا تھا[1]۔

واقعات | شاہ عالم کو ان سے بہت محبت ہوگئی تھی جہاں دار شاہ کو بڑا بنانا چاہا نواب اودھ اور انگریزوں نے ازراہ مصلحت ان کو نہ آنے دیا۔ سندھیا مرہٹوں نے اکبر شاہ ثانی کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ نواب غلام قادر خاں دلی سے جب میرٹھ بھاگا تو ان کو بھی ساتھ لیتا گیا اور بیدار بخت کے بجائے بادشاہ بنایا۔ مرہٹوں نے غلام قادر کو شہید کیا تو شاہ عالم پھر کامیاب ہوئے جہاں دار شاہ کے انتقال کے بعد ہی ولی عہد قرار دئے گئے۔

شادی | ۱۱۹۵ھ میں شاہ عالم نے ان کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی [illegible] نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیر نے دولہا دلھن کو سینچنے میں لاکھوں روپیہ کا سامان پیش کیا تھا ان کی اولاد میں بڑے ابوظفر بہادر شاہ تھے جو ایک راجپوت خاتون کے بطن سے دوسرے

---

[1] شاہ عالم نامہ ص ۶۳ و دیباچہ نادرات شاہی ص ۵۳

مرزا جہانگیر جو ممتاز محل کے بطن سے ۱۸۰۵ء؁ ۱۲۲۱ھ؁ میں پیدا ہوئے تھے۔

جلوس | "شاہ عالم" ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء؁ ۱۲۲۲ھ؁ میں انتقال کر گئے تو محمد اکبر شاہ ثانی کی اس وقت ۴۶ سال کی عمر تھی

پہلا دربار اکبر شاہ ثانی | غرضیکہ ۱۸۰۶ء میں محمد اکبر شاہ ثانی زیب افروز تخت سلطنت ہوئے پھر تو ہر روز بادشاہ دربار کرتے رزیڈنٹ و دیگر حکام کمپنی اور امرائے سلطنت باریاب ہوتے لال پردہ سے باہر روبروئے تخت تین جگہ مجرا ہوتا تھا عملہ و حبشی و چوبدار دعصا بہ لفظ نگاہ روبرو مہابلی بادشاہ یا حضرت جہاں پناہ سلامت مجرا کرایا کرتے تھے جب بادشاہ سے کچھ کلام کرتے تھے۔ اراکین خلافت بادشاہ کو بہ لفظ کرامت پیر و مرشد قبلہ عالم جہاں پناہ سے مخاطب کرتے۔

سواری | عیدین پر بادشاہ فیل پر سوار ہو کر عازم عیدگاہ ہوتے ہاتھی رنگارنگ اور زرّیں جھول سے سجا ہوتا لالہ موہن لال ملک الشعرا متخلص بہ منعم نے صفت فیلانِ شاہی میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

فیل مستش چو قلہ الوند زدہ پہلو بہ آسمان بلند
خط شنجرف بر جبین خوشرنگ چوں شفق جانب قلم و زنگ

جس امیر کے دروازہ سے سواری گذرتی حاضر ہو کر نذر پیش کرتا باشارۂ چشم قبول ہوتی فیلبان اٹھا لیتا مسٹر اجیلڈ سٹیٹن صاحب بہادر جن کو ناظم الدولہ سیف الملک خطاب تھا اور سر چارلس مٹکف صاحب مخاطب بہ منتظم الدولہ مختار الملک ساتھ سواری کے ہوتے واپسی پر بادشاہ خلعت فاخرہ سے ہر ایک کو حسب مراتب نوازتے۔

دعوئے تخت نشینی | رسم تخت نشینی کے بعد ہی بادشاہ مرحوم کے بڑے لڑکے مرزا جوان بخت

ی بیوہ شہزادی قُطلق سلطان بیگم (جنیا بیگم) نے گورنمنٹ میں درخواست دی جس میں
پنے بیٹے خرم بخت کے لئے تخت کا دعویٰ کیا۔ محروم الارث ہونے کی بنا پر خارج
ر دیا گیا۔

واقف اکبر شاہ کی تخت نشینی پر گورنر جنرل نے جو تہنیت نامہ بھیجا اُس میں بادشاہ کو یقین
لایا کہ آپ کی خدمت واقتدار اور امن واطمینان کی حکومت برطانیہ ضمانت کرتی ہے۔

"بادشاہ نے گورنر جنرل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ خواہش کی مرحوم
شاہ عالم اور لارڈ ولزلی کے درمیان جو عہد وپیمان ہو چکا ہے۔ اس کی رو سے
شاہی وظیفہ میں اضافہ کیا جائے۔ اس یاددہانی کی ضرورت اس لئے پیش آئی
کہ سلطنت کے اخراجات بڑھ گئے ہیں"[1]

قضیہ ولی عہدی اکبر شاہ ثانی کی منظور نظر بیگم "ممتاز محل" کی یہ سعی تھی کہ بادشاہ کا تیسرا بیٹا
مرزا جہانگیر ولی عہدی کے منصب پر فائز ہو مگر گورنمنٹ نے فیصلہ کر دیا کہ شہزادہ ابوظفر
لمت اکبر ہیں لہذا وہی ولی عہد قرار دے دیئے گئے۔ اکبر شاہ نے جہانگیر کے لئے
وئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر اُن کی چلی چلائی کچھ نہیں۔

دشاہ کی ولی عہدی پر خفگی بادشاہ سلامت شاہزادہ ابوظفر سے بے حد خفا اور ناراض رہتے
ر یہ جب حاضر ہوتے مؤدب گھنٹوں باپ کے سامنے کھڑے رہتے مگر "ممتاز محل" کا
بادو اکبر شاہ پر ایسا تھا کہ وہ جہانگیر پر مٹا ہوا تھا گورنمنٹ نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ

"بادشاہ کے دلائل جہانگیر کی ولی عہدی کے معاملہ میں خاطر خواہ اثر نہ ڈال
سکے بادشاہ کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ یہ ضد ہماری کا وشوں اور محنتوں کا ثمرہ ہے کہ

---

[1] دیباچہ راجہ رام موہن رائے از ڈاکٹر مجمدار

کمال اطمینان و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہو مناسب ہے کہ بغیر چون و چرا کے
گورنمنٹ کے مشورہ پر عمل کرو جو کہ ہمیشہ تمہاری خیرخواہی میں ہوتے ہیں وظیفہ
شاہی کے اضافہ کی درخواست درخور اعتنا نہ سمجھی گئی۔[1]

کیونکہ گورنمنٹ جو رقم ادا کرتی تھی وہ حقیقتاً اس رقم سے زیادہ ہی نہ تھی جو بادشاہ کو مرہٹوں کے زوال سے پہلے ملتی رہی تھی لیکن موجودہ حالات کے تقاضہ سے یہ رقم ان کے آرام اور شاہانہ طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھی۔

خطرہ | گورنمنٹ برطانیہ کو خطرہ لاحق تھا کہ بہت ممکن ہے کہ وظیفوں کا اضافہ بادشاہ کے لئے ایسے ذرائع مہیا کر دے جو ان کے مفاد اور بقا کے لئے مضر رساں ہوں بادشاہ سے بار بار درخواست کی گئی کہ وہ گورنمنٹ کے حکام کے مشورہ پر عمل پیرا ہوں اور جیسا وہ کہتے ہیں کرے۔

خط و کتابت | گورنمنٹ کی خط و کتابت ریذیڈنٹ کے توسط کے بغیر ناپسند کی گئی اور ریذیڈنٹ کو ہدایت کر دی گئی کہ بادشاہ کے خطوط جو گورنمنٹ کو بھیجے جائیں وہ ان کی دیکھ بھال جانچ کر لیا کرے ریذیڈنٹ کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ اگر ان باتوں سے سبب دلخراہ نتیجہ نکلے تو وہ اشارۃً بادشاہ کو متنبہ کر دے۔

پالیسی کی تبدیلی | سر چارلس مٹکاف نے جو اس وقت دہلی میں نائب ریذیڈنٹ تھا گورنمنٹ کے نرم طریقۂ عمل کو ناپسند کیا۔ اس کے خیال میں اس سے بادشاہ دہلی کو غلط طرز عمل اختیار کرنے کا بہانہ ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ اپنے نام نہاد اختیارات پر پھولا بیٹھا ہے۔

---

[1] راجہ رام موہن رائے از مجلہ دار

مسٹر سیٹھن جیسے مزاج کا آدمی جس رکھ رکھاؤ اور فیاضی کے ساتھ اس عزیب کٹھ پتلی سے پیش آتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کے زعم باطل میں ترقی کی لہر اُٹھے ریزیڈنٹ کے طرزِ عمل کے متعلق سر چارلس مٹکاف اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے۔

"میں سیٹھن صاحب کی خاندان شاہی کے ساتھ پالیسی سے زیادہ متفق نہیں ہوں یہ اخلاق کی پستی اور طرزِ عمل کی کمزوری کی وجہ سے ہے کہ ایک نامور گرے ہوئے خاندان کا اتنا لحاظ اور پاس کیا جائے جو نہ ظاہر دارانہ طور پر درست ہے اور نہ جس کو مروت چاہتی ہے اس سے برطانوی گورنمنٹ کے نمائندے کا اقتدار مٹا جاتا ہے" حالانکہ حقیقتاً دہلی پر اسی کی حکومت ہونی چاہئے علاوہ ازیں اس سے شاہی عظمت اور حکومت کے جذبات قوی ہورہے ہیں۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ یہ جذبات دائمی طور پر محوِ خواب ہوجائیں یہ نتیجہ میری آنکھوں کے سامنے بسرعت مرتب ہو رہا ہے یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ ہماری نیت نہیں ہے کہ بادشاہ کو کل شاہی اختیارات از سر نو مل جائیں لہذا ہم کو ایسے طرزِ عمل پر گام زن نہیں ہونا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بادشاہ حکومت کا پھر خواب دیکھنے لگے"...... ہمیں بادشاہ کے شاہی اقتدار کی کوششوں کو فوراً روک دینا چاہئے اور وہ حد بھی بتا دینی چاہئے جس سے نام نہاد بادشاہ کے ساتھ ادب اور اطاعت کے معاملے میں ہم آگے نہیں بڑھیں گے"[1]

اگر اس مقصد کے لئے شاہ کے خالی نام کو بھی مٹا دینا ضروری ہو تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اس نام کو سردست اس کے پاس چھوڑ دیا جائے"[1]

---

[1] دیباچہ راجہ رام موہن رائے صفحہ ۹۷

مقبرہ شاہ عالم کی تعمیر کا مسئلہ | بادشاہ نے ریذیڈنٹ کو اپنی مالی دشواریوں کے متعلق لکھا اور گورنمنٹ سے استدعا کی کہ اس کے والد مرحوم کی قبر پر ایک یادگار نصب کی جائے اور مزید گذارش کی کہ اس یادگار کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ جائیداد اور روپیہ اس نیک مقصد کے لئے وقف کر دیا جائے۔"

ریذیڈنٹ نے گورنمنٹ کو اپنے نجی نوٹ میں لکھا کہ بادشاہ کی مندرجہ بالا مشکلات روپیہ کی کمی کی وجہ سے اتنی نہیں جتنی کہ اس کی بدنظمیوں سے ہیں اور بادشاہ کی آخری درخواست بھی قابل منظوری نہیں ہے۔"

ریذیڈنٹ کو ہدایت کی گئی . . . . . بادشاہ کے کل ناجائز مطالبات کا انسداد کرے خواہ وہ بادشاہ کی دماغی پیداوار ہوں یا دوسروں کے مشورہ کا نتیجہ۔"

وفد شاہ جی | مگر اکبر شاہ نچلے نہ بیٹھے وفد بھیجنے کی سوجھی پہلے گورنمنٹ نے انکار کیا پھر رضامندی دے دی اس پر شاہ جی اور راجہ شیر لعل بادشاہ کی طرف سے پریسیڈنسی بھیجے گئے یہ وفد شاہ جی کے نام سے موسوم ہے۔"

گورنمنٹ کے ایرانی سفیر نے وفد سے ایک ملاقات کی جس کے نتائج سے ایک سال بعد ۸ر مارچ ۱۸۱۰ء کو ریذیڈنٹ متعینہ دہلی کو مطلع کیا گیا ایرانی سفیر نے تجویز کیا تھا۔

"کہ یہ ضروری ہے کہ وفد شاہ جی ناکام ہو کیونکہ بادشاہ کے نجی نمائندہ کی بات تسلیم کر لینے کی صورت میں ریذیڈنٹ کا اقتدار ختم ہو جائے گا جو کہ ناپسندیدہ ہے۔"

چونکہ بادشاہ کی درخواستوں کو کئی بار ٹھکرایا جا چکا تھا اس لئے گورنمنٹ کے خیالات ریذیڈنٹ کے پاس روانہ کر دیئے گئے تاکہ بادشاہ کو ان سے آگاہ کیا جا سکے

ایرانی ناظم نے تحریر کیا ہے کہ شاہ جی کا پہلا عمل اس شرط کی خلاف ورزی تھی

جو گورنمنٹ نے عاید کی تھی یعنی وہ گورنر جنرل کے لئے ایک اعزازی خلعت لے گیا جس کی بادشاہ سے ممانعت کر دی گئی تھی کیونکہ گورنر جنرل کو خلعت دینے کے یہ معنی ہوتے تھے کہ گورنمنٹ برطانیہ ظاہری رسوم کی پابند ہے اور اطاعت گذار ہے شاہ جی نے اس امر کے اعلان کرنے میں بھی کچھ پس و پیش نہیں کیا کہ یہ تجاویز نہ صرف خاص سرداروں اور شاہزادوں کے لئے اس قسم کے اعزاز عطا کرنے کی تمہید ہیں بلکہ برطانوی گورنمنٹ کی اطاعت کے بعد اگر کوئی انکار کر دے تو مجرم اور مستوجب سزا ہوگا۔ لیکن ان تمام بیجا تجاویز کو گورنمنٹ نے رد کر دیا

آگے چل کر حکام نے یہ فیصلہ کیا کہ خط اور خلعت اور وہ تمام خطوط و تحائف جو بادشاہ کی ماں اور بیگم نے شاہ جی کے معرفت گورنر جنرل کو بھیجے تھے ایرانی دفتر کے توسط سے وصول کئے جائیں اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ ریزیڈنٹ کو ہدایت کی گئی کہ اگر شاہ جی بادشاہ سلامت سے گورنمنٹ کے بارے میں کوئی شکایت کرے تو اس کی تردید کرے تاکہ بادشاہ کے دل میں حکومت کے خلاف کوئی میل نہ آئے۔

غرضیکہ اسی طرح شاہ دہلی کی شہنشاہیت کے ادعاء کو روک دیا گیا۔ دیگر عرضداشتیں مختلف فوائد کے لئے دی گئی تھیں مثلاً اضافہ وظیفہ شاہی کا پُرانا مطالبہ کہ وہ ایک لاکھ تیس ہزار ماہوار تک بڑھا دیا جائے حق انتخاب ولیعہد ساز و سامان، لوازمات شاہی کا مہیا کرنا، ولیعہد کے وظیفہ کا اجراء۔ امراء و شہزادگان کی نذریں گزراننے کی پُرانی رسموں کی بحالی۔ آگرے کی ضبط شدہ اراضی کی واگذاری اور ان انتظامی شرائط کی پابندی جو لارڈ ولزلی نے ۱۸۰۵ء میں کی تھی ان مطالبات سے اکثر کی منظوری سے حکومت نے انکار کر دیا گورنمنٹ کو امید تھی کہ مذکورۂ بالا وفد کے ناکامیاب نتائج بادشاہ کو اس کے ناجائز مطالبات ترک کرنے کی ترغیب دینے

میں معاون ہوں گے اور بادشاہ کو ایسی راہ پر لگا دیں گے جو شاہی خاندان کی مجبوریوں کے حسب حال ہو بہرکیف شاہ صاحب کے وفد کی ناکامیابی بادشاہ کے دل پر خاطرخواہ اثر پیدا نہ کرسکی وہ مایوس نہ ہوئے اور دوبارہ گورنمنٹ سے بلاتعین مقدار وظیفہ بڑھانے کی درخواست کی اولاً ریزیڈنٹ نے قناعت کرنے کے لئے کہا مگر وہ کوشش میں ناکام رہا اور آخرش بادشاہ کے شدید اصرار پر اس نے درخواست آگے بڑھا دی۔

اس عرضداشت میں اول تو شاہ جی کے وفد کا تذکرہ تھا پھر گورنمنٹ برطانیہ کی ان خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا جو انھوں نے خاندان شاہی کے ساتھ کیا تھا اور بعد میں یہ تشریح تھی کہ مرحوم بادشاہ کے لوازمات برقرار رکھنے اور دوسرے امور کے باعث میں سخت مالی الجھن میں مبتلا ہوں اس لئے حکومت برطانیہ کو ازراہ عنایت میرے آڑے وقت کام آنا چاہئے۔ بادشاہ کے مراسلہ کی بنیاد جنرل لیک کے مراسلہ پر تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ شاہی خاندان کی کفالت کے انتظام محض عارضی ہیں آئندہ جنگ کے اثرات زائل ہوتے ہی اطمینان بخش انتظام کر دیا جائے گا۔

ریزیڈنٹ نے ان دلائل کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس کا فیصلہ گورنمنٹ پر چھوڑا اور یہ فیصلہ کیا کہ گورنمنٹ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ یہ شرط لگا دے کہ کسی شہزادے کو بھی مسلح آدمی رکھنے کی اجازت نہیں اس شرط کا اشارہ بالخصوص شاہزادہ جہانگیر کی طرف تھا جس کے شکوہ کے سامنے خود ولیعہد کی شان ماند پڑ گئی تھی جبکہ اس کے دماغ میں ولیعہدی کا سودا سمایا ہوا تھا۔

زمانہ نے بادشاہ کے ساتھ سازگاری کی لارڈ منٹو کو بادشاہ پر رحم آیا اور اس نے تمام مراسلات کا جائزہ لیا مندرجہ بالا جانچ پڑتال کا ایک خاکہ یادداشت کی شکل میں بورڈ

کو بتاریخ ۳۰ جون ۱۸۵۰ء روانہ کر دیا گیا جس میں شاہی وظیفہ کو ۱۲ لاکھ سالانہ بڑھا دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ گورنمنٹ کے وزیر نے ریزیڈنٹ متعینہ دہلی کو ان جملہ شرائط سے مطلع کر دیا جس پر وہ فوراً کاربند ہونا چاہتی تھی اس فیصلہ کی ابتدا اسی طرح کی گئی کہ تمام خط و کتابت کے صحیح معاینہ اور واقعات حاضرہ کے جائزہ نے ان دلائل کو جواب تک بادشاہ کے وظیفہ کی زیادتی کے مطالبات کو ناجائز سمجھتے رہے بدل دیا ہے گورنمنٹ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر بادشاہ کو صحیح راستہ پر لگانا چاہا تاکہ وہ اپنی حالت اور حکومت برطانیہ سے اپنے تعلقات کا بہتر اندازہ کر سکے انھوں نے اس سلسلہ میں اپنا یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ گورنمنٹ نے ولیعہد کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہی اس کا مشاہرہ دینا منظور کر لیا ہے لیکن ولیعہد بادشاہ کے بڑے بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا شہزادہ جہانگیر کے محافظ رسالہ کی برطرفی کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔

گورنمنٹ نے احتیاطاً ریزیڈنٹ کو ہدایت کی کہ وہ بادشاہ پر یہ واضح کر دے کہ اگرچہ گورنمنٹ نے شاہی وظیفہ میں اضافہ اولیں یادداشتوں کے وقت سے کیا ہے مگر بایں ہمہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل یہ مناسب سمجھتا ہے کہ بادشاہ ان شرائط کی تعمیل وظیفہ میں ترقی کے وقت سے کرے۔ انھوں نے یہ بھی ریزیڈنٹ کو تبلایا کہ شاہی وظیفہ کے ازدیاد پر شاہ حاجی کے وفد کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ ریزیڈنٹ مذکورہ بالا فیصلہ پاتے ہی بوجوہ چند بادشاہ کو اس سے مطلع نہ کر سکا ایک وجہ یہ تھی کہ اس خبر کی وصول یابی کے ایک ہفتہ قبل محل میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا بادشاہ نے محل کے پھاٹکوں پر قبضہ کا حکم دے دیا مرزا جہانگیر نے جارحانہ اقدام کیا اس کشمکش میں شہزادے کی محافظ فوجوں کی کچھ جانیں بھی ضائع ہوئیں نتیجہ کے طور پر بادشاہ کا دل اس سے بہت مشوش ہوا اور اس خیال سے کہ مبادا عوام کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ بادشاہ کے لئے یہ فیصلہ ایک

قسم کی مفاہمت بلکہ یہ کہ شاہزادہ جہانگیر کو الہ آباد جلاوطن کردے لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ یہ فیصلہ ملتوی رکھا جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہ حاجی اور راجہ شیر مل کچھ دنوں پہلے دہلی میں وارد ہوئے تھے اگر اس کا اعلان کیا جاتا تو ممکن تھا کہ یہ لوگ اپنی قابلیت پر محمول کرتے مگر کچھ دنوں بعد جبکہ بادشاہ کا دل مشکل پذیر ہوگیا اور بادشاہ نے اپنے لڑکے کو ولی عہد کے عہدے پر مفتخر کردیا تو اُس وقت ریذیڈنٹ نے مناسب سمجھا کہ گورنمنٹ کے اس فیصلے سے بادشاہ کو مطلع کرے جس پر اظہار اطمینان و مسرت کیا گیا۔ گورنر جنرل کے خط کے جواب میں بادشاہ نے زوردار الفاظ میں اس فیصلہ پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور گورنر جنرل کے ساتھ وابستگی اور کامل عقیدہ کا یقین دلایا بادشاہ نے اس کی تمنا کی کہ اس کے بیٹے مرزا جہانگیر کو الہ آباد سے واپس بلا لیا جائے اور ریذیڈنٹ نے بھی اس کی سفارش کی چنانچہ گورنمنٹ نے چند شرائط کے ساتھ شہزادے کی واپسی کو منظور کرلیا۔ بادشاہ نے بھی اسے تسلیم کرلیا۔ شاہی معاملات کے متعلق مذکورہ فیصلے سے جو امیدیں وابستہ تھیں ان پر بالکل ہی پانی پھر گیا اور بادشاہ دیرینہ مقاصد کو حاصل کرنے کی تمنا میں ایک ایسے فتنہ سے دوچار ہو گئیں جس سے اس کے وقار کو زبردست ٹھیس لگی یہ پران کشن وفد کے نام سے مشہور ہے

پران کشن مرشد آباد واقع بنگال کا رہنے والا تھا جو دولت و اقبال کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد دہلی میں سکونت پذیر ہوا یہاں کسی درباری کے توسل سے وہ بادشاہ دہلی کا گماشتہ بن گیا اس نے یہ ہوا باندھی کہ بادشاہ کی تمنائیں ضرور بار آور ثابت ہوں گی ان کے مطالبات کو منوانے کی کوشش کی جائے گی اگر وہاں نہیں تو دربار انگلستان میں تو ضرور ہی کامیابی ہوگی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اسے راجہ کے خطاب سے نوازدیا اور اپنا نمائندہ بنا کر انگلستان

بھیجدیا۔ اس وفد کی دلچسپ روئداد سر جے۔ ٹی ملبورن کے الفاظ میں یہ ہے

اس وفد کی خفیہ تحریک بے حد دلچسپ ہے وہ مکار ہندوستانیوں میں جس میں ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان جن کا سرغنہ ایک مسلمان عالم تھا بادشاہ کو ورغلایا کہ وہ اس کے لئے کلکتہ میں بڑے فرائض انجام دے سکتے ہیں خصوصاً شہزادہ جہانگیر کی جانشینی کے متعلق سرہنری رسل جیسے شخص کے ذریعہ سے جس کا لکھا ہوا ایک خط خود بادشاہ کے نام بھی پیش کیا گیا بادشاہ اپنی سادہ لوحی سے ان کے دام فریب میں آگیا۔

یہ عیار بحیثیت وکیل کلکتہ چلے گئے اور ان کا سرغنہ فریب دینے کے لئے دہلی میں ہی مقیم رہا انھوں نے اپنا کام نہایت ہوشیاری سے کیا کوئی جھوٹ اور جعل ایسا نہ تھا جس کو ان دھوکے بازوں نے کہنے یا کرنے سے پس و پیش کیا ہو لارڈ ولسلی کے ہاتھوں اپنے استقبال کی خوب خوب داستانیں گڑھیں اور اس عالم کے نام سے خوب جعلی خطوط بھیجے انھوں نے بتایا کہ کلکتہ پہنچتے ہی وہ پہلے لارڈ ولسلی سے ملے اور جس وقت اسے حالات کا علم ہوا وہ کف افسوس ملنے لگا بادشاہ کا خط پڑھکر وہ انگشت بدنداں رہ گیا اور سنفیر کو یقین دلایا کہ اس نے مسٹر مٹکاف گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک خط لکھوایا جس میں اسے بادشاہ کے ساتھ خراب سلوک پر کوسا گیا تھا۔

اس طرح کے جعلی اور جھوٹے خطوط تحریر کر کے انھوں نے اعلیٰ حضرت کو کامل یقین دلایا کہ ان کی عرضداشتیں خاطر خواہ توجہ حاصل کر رہی ہیں انھوں نے بعد کے مراسلہ میں لکھا کہ وہ گورنر جنرل بہادر اور سابق ریزیڈنٹ دہلی کے ہمراہ لندن جا رہے ہیں اور بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کی تنخواہ ان کے بدلے ایک دوست کو جس کا نام انھوں نے تبلا دیا تھا دے دیا کریں۔ جھوٹے ملا نے تائید کی کہ یہ بیان صحیح ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ وکلار شاہی بھی جہاز

سے روانہ ہو چکے ہیں۔ بالآخر ان فریب کاریوں کا پردہ چاک ہو گیا۔

کلکتہ سے جو خط موصول ہوئے تھے۔ مٹکاف کے حوالے کر دئے گئے بادشاہ نے انتہائی تاسف و پریشانی کا اظہار کیا۔ مٹکاف نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ ناقابل عمل تبدیلیوں کی تکلیف دہ خواہش کو عمل میں لانے کے خواب کو جو کہ اس کی زندگی کے واسطے سوہان روح ہو گئی ہے ترک کر دے

پران کشن کی بھی تذلیل ہوئی اسے خطاب سے محروم کیا گیا۔ مٹکاف کو امید تھی کہ ان کوششوں کے بعد اس کی نصیحت بادشاہ کو آئندہ کیلئے باز رکھے گی لیکن اس کی یہ امید پوری نہ ہوئی کہا جاتا ہے کہ کلکتہ کی ناکامیوں کے بعد اس نے لکھنؤ میں نواب وزیر سے دوسری سازش شروع کر دی یہ سازش اس کے بیٹے جہانگیر کے ذریعہ عمل میں آئی جو الہ آباد سے ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے بہانے لکھنؤ گیا تھا تاکہ نواب کی خدمت میں ملتمس ہو کہ برطانوی گورنمنٹ سے وظیفہ میں اضافہ کرادے۔ مسٹر کے ای۔ لکھتے ہیں۔ در حقیقت خفیہ سازشوں کا ایک سیلاب تھا جو محل سے مسلسل امنڈ آیا تھا حالانکہ وہ اپنے اثرات میں مشکل سے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا تاہم تکلیف دہ ضرور تھا اس لئے اس کے روکنے کی ضرورت تھی وہ خط جو بادشاہ نے نواب وزیر اودھ کو لکھا لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کے ہاتھ لگ گیا اور اس سازش کے انکشاف کے نتیجہ میں شہزادے پر پابندی عاید کرنے کی سفارش کی گئی۔ گورنمنٹ نے ایسے طرز عمل پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے بادشاہ کے زائد وظیفہ کو بند کر دینے کی ہدایت کی جو ۱۸۰۹ء میں منظور ہوا تھا۔ تاکہ بادشاہ کو افسوس ہو۔ یہ طریقہ کار مؤثر ثابت ہوا بادشاہ نے تاسف کیا اور وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ شہزادہ کو بھی اس فعل پر ندامت ہوئی۔ اور وعدہ کیا کہ آئندہ گورنمنٹ کی خواہش کے مطابق عمل کرے گا

گورنمنٹ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور شہزادے کے خانگی اخراجات میں کمی کر کے ۱۴۳۱۵ سے ۱۵۰۰ روپیہ ماہانہ کر دیئے اس کے بعد ہی لارڈ منٹو نے گورنر جنرلی کا چارج لیا لارڈ منٹو نے اپنی ۱۸۰۹ء کی روئداد میں اور باتوں کے ماسوا یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ اپنے ناممکن الحصول مقصد پر اڑا ہوا ہے لیکن طاقت کی محتاجی کی بدولت کھلے بندوں کوشش نہیں کر سکتا اور اتنا بے بس ہے کہ اپنی خواہشات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیئے وہ ادنیٰ چالوں اور نازیبا سازشوں کے جال میں پھنس جاتا ہے جو محل کی بیگمات اور ادنیٰ ذہنیت کے مشیروں کی فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ سر چارلس مٹکاف جب دہلی میں نائب ریزیڈنٹ تھا تو اس نے ارباب حل وعقد کی توجہ ان آنے والے خطرات کی طرف مبذول کرائی جو کہ وہ کمزور مغل بادشاہ کے مطالبات کو نہ دبا کر اپنے واسطے اکٹھی کر رہے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور انگریز ہندوستان میں اپنے مقبوضات کو محفوظ سمجھ کر بیرونی دشمنی سے خوفزدہ نہ تھے کیونکہ ان کو اپنی طاقت پر اعتماد تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں ایک عظیم الشان منصوبہ ناتمام رہا تھا لیکن دس سال بعد لارڈ ہیسٹنگز کے زمانہ میں اس منصوبہ کے پریشان اجزاء رنگ لائے اور اس نے حالات کو اتنا سازگار پایا کہ حملہ والیانِ ملک پر حکومت برطانیہ کی بالادستی ایک حقیقت نظر آنے لگی۔ ہندوستان اور انگلستان میں انقلاب عظیم ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ ہمارے خیالات میں بھی لارڈ ہیسٹنگز کو شہنشاہ دہلی کے خلاف رویہ کی کارفرمائی کا موقعہ مل گیا یہ کوئی غیر فطری امر نہ تھا کہ ایک نئے گورنر جنرل کے تقرر سے مغل بادشاہ کو اپنی امیدیں سرسبز ہوتے معلوم ہوئیں اور اس نے چاہا کہ وہ سرکار برطانیہ کے نئے افسر سے میل جول پیدا کر کے اپنی دیرینہ آرزوئیں پوری کرے جب بادشاہ کے علم میں آیا کہ گورنر جنرل مغربی صوبہ جات کا دورہ کرنے والا ہے تو

بادشاہ نے ریذیڈنٹ مٹکاف سے ایک حد تک تکلیف دہ سلسلہ نام و پیام شروع کر دیا تاکہ اس کی ملاقات گورنر جنرل سے ہو جائے۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز کا قول ہے کہ بادشاہ نے کمپنی کی حکومت برسراقتدار کو مرجح ثابت کرنے کے مخصوص طریقے میں متعدد ترمیمات کی کوشش کی لیکن آخرکار جب مسٹر مٹکاف نے شہنشاہ کو اس کا یقین دلایا کہ خواہ وہ میرے اعزاز میں کتنی ہی کمی کیوں نہ کریں میں کسی اجنبی حکومت کی برتری اپنی حکومت میں تسلیم کرنے کا مخالف رہوں گا تو بادشاہ نے ملاقات کا خیال ترک کر دیا۔ میرا یہ طرز عمل پارلیمنٹ کے اس عالیہ قانون کی وجہ سے نہ تھا جس کی رو سے کمپنی کے محروسہ علاقہ پر صرف برطانوی تاج کی حکومت تسلیم کی گئی ہے بلکہ ہماری اس غلط پالیسی کے قوی احساس کا نتیجہ یہ تھا کہ شہنشاہ دہلی کے اقتدار کو بہر نوع تسلیم کر لیا جائے۔

سرکار برطانیہ کی اس بے باکانہ پالیسی پر عمل بطور انتظام شروع کر دیا گیا اس جذبہ کے ماتحت جو واقعات بعد کو پیش آئے ان کی چند مثالیں یہ ہیں۔

ایک پرائیویٹ روزنامچہ میں گورنر کا یہ بیان ہے

خاندان تیموریہ کو اس درجہ نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ بات بات میں اس کی رجوع کرنے کی عادت بسرعت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شاہی خاندان کے مراسم و آداب جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر لئے تھے اور جن میں ہماری ماتحتی اور وفاداری کی جھلک تھی۔ ختم ہوتے جا رہے ہیں میں نے بھی اس بات کو اس لئے صحیح تصور کر لیا کہ اس کی نمائش و تصنع کو ختم کر دیا جائے خواہ اس کا تعلق ہم سے ہو خواہ دیسی ریاستوں سے۔

لارڈ ولزلی کے عہد تک سرکار برطانیہ کی حکومت ممالک محروسہ پر غیر مکمل تھی لیکن لارڈ ہیسٹنگز کے زمانہ میں ہر طرح باضابطہ مکمل ہو گئی۔ اور جیسا کہ خود لارڈ ہیسٹنگز کے

مندرجہ بالا اقوال سے ظاہر ہے گورنر جنرل نے اس تبدیلی کے اظہار سے کسی موقع پر دریغ نہیں کیا۔ ایک دفعہ جبکہ گورنر جنرل لکھنؤ گیا تو اس نے دیکھا کہ نواب وزیر کی عملداری میں بادشاہ دہلی کے دو بھائی سلیمان شکوہ اور سپہر شکوہ جو کہ نواب وزیر کی فیاضی پر اپنی گذر اوقات کرتے تھے ان کے سامنے نواب نے ایک مرتبہ راستہ میں جبکہ ان کو یہ دونوں شہزادے ملے کسی طرح اپنے ہاتھی کو جھکا کر بادشاہ دہلی سے اظہار عقیدت کیا گورنر جنرل نے فوراً ہی نواب وزیر کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ اظہار فدویت آپ ہی کا حصہ ہے سرکار برطانیہ تو ان غلامانہ آداب کو اب خیرباد کہہ چکی ہے۔ ریزیڈنٹ کو اس بات کی ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ موقعہ کی تاک میں رہے اور نواب وزیر کو ان آداب کے ترک کرنے کی ترغیب دیتا رہے۔ ان آداب شاہی م
سے متعلق طریقے ترک کر کے نواب وزیر اودھ بادشاہ بن بیٹھے۔

گورنر جنرل کی یہ امید بارآور ہونے میں کچھ دیر نہیں لگی نواب زادہ کے شاہی لقب اختیار کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ دہلی کے دربار نے برملا غیظ و غضب کا اظہار کیا اور دونوں حکومتوں میں ناقابلِ عبور خلیجِ منافرت پیدا ہو گئی اس جدید حکمت عملی کا ایک رخ یہ تھا کہ والیٔ کنوند (Kamona) کے لڑکے اور جانشین فیض محمد خان نے گورنمنٹ سے یہ درخواست کی کہ اسے خلعت عطا ہو۔

ہسٹنگز کی سرکار نے ممکن الوجود اعتراضات پر غور کیا جو اب تک اس طرز عمل کے مانع تھے اور بالآخر فیصلہ کر لیا کہ شاہی اختیارات خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور اس کو خلعت عطا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ احتیاط کی گئی کہ یہ فیصلہ باقاعدہ اعلان کے ذریعہ مشتہر نہیں کیا گیا۔

ریزیڈنٹ دہلی کو یہ ہدایت کردی گئی کہ اگر بادشاہ کوئی اعتراض کرے تو اس کو جواب نہ دیا جائے بلکہ صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ سرکار کی یہی مرضی ہے ایک اور مثال

بطور نظیر پیش کی جاتی ہے کہ جے پور کے نئے راجہ نے اپنی گدی نشینی کے موقع پر دہلی سے ٹیکہ کی رسم کے لئے درخواست کی ہسٹنگز نے اجازت نہ دی کیونکہ اس نے خیال کیا یہ باتیں بادشاہ اور دیسی ریاستوں میں رسم وراہ کے دیرینہ رواج کو ختم کرنے کے اصول کے منافی ہیں کیونکہ اگر ان رسوم کو ختم نہ کیا جائے تو بادشاہ کا مٹتا ہوا اقتدار برقرار رہے گا۔

مخصوص جشن شاہی کے موقع پر برطانوی کمانڈر انچیف شاہ دہلی کے سامنے نذر پیش کیا کرتا تھا اس رسم کو موصوف نے یکلخت اڑا دیا کیونکہ اس سے کمپنی کے محروسہ علاقوں پر تاج دہلی کا تفوق نمایاں ہوتا تھا۔

اس وقت برٹش گورنمنٹ کی وابستگی اور ادعائے اقتدار شاہی کے درمیان جو تفاوت تھا اس کو بھی مراسلوں کے مقررہ القاب وآداب میں تصنیف کر کے ختم کر دینے کی کوشش کی گئی۔ سرجے۔ ای کول بروک کو جب دہلی میں ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا الدین کے محکمہ کے ناظم سررشتہ مفتی انعام اللہ خاں بہادر گویا موی تھے (تاریخ خصائل گویا مو مصنفہ مفتی محمد حسن) تو اس تقرر کی اطلاع شہنشاہ کی خدمت میں حکومت برطانیہ کے ہندوستان کے نمائندے کی طرف سے ایک نئے انداز کے مراسلے سے دی گئی۔ گورنمنٹ کا ایرانی وزیر اس سلسلے میں لکھتا ہے

سنہ ۱۸۱۹-۲۰ء تک گورنر جنرل ایک بڑی مہر جس پر لقب وفادار اکبر شاہ یا سلقہ بگوش اکبر شاہ کندہ تھا استعمال کرتا تھا اور خط جو بادشاہ کو لکھتا تھا وہ عرضداشت یا درخواست کی شکل میں ہوتے تھے۔

اس وقت یہ ارادہ کر لیا گیا کہ کوئی باقاعدہ رزولیوشن اس مضمون پر پہنچایا

کہ مہر کو جس پر عبارت مذکور کندہ تھی متروک قرار دیا جائے اور اس کے بجائے وہ مہر جو اس سے پہلے گورنر جنرل کے لئے غیر ملکی مغربی ایشیا کے شہزادوں سے خط وکتابت کے لئے تیار کی گئی تھی استعمال کی جائے اور اسی تاریخ سے برطانوی گورنمنٹ کے افسر اعلیٰ نے بادشاہ سے مراسلت بند کردی۔ جب نئے ریزیڈنٹ کے دہلی میں تقرر اور گورنر جنرل کی آمد ورفت کے مواقع پر مراسلت اور تحریری ثنا خوانی یک لخت رک گئی تو بادشاہ نے یہ سمجھا کہ میری دانستہ توہین کی گئی ہے اور اس سے اس کو سخت کوفت ہوئی۔

لگے ہاتھوں اور واقعہ بھی سنئے ۲۹ رجنوری ۱۸۲۰ء کو شاہ انگلستان کی وفات اور اس کے لڑکے کے تخت نشین ہونے کی خبر شاہ دہلی کو پہنچائی گئی۔

اس خبر کو سن کر شاہ دہلی نے گورنر جنرل کی معرفت پیغام تعزیت اور نئے بادشاہ کے لئے تہنیت بھیجنا چاہا مگر لارڈ ہیسٹنگز نے شہنشاہ کی اس خواہش کی تعمیل سے انکار کردیا۔

اس کے بعد سے رسمی آداب مراتب کے خلاف برطانوی مزاحمت نمایاں ہونے لگی۔ جس سے بادشاہ اور ارکین شاہی بہت آزردہ ہوئے یہ سچ ہے کہ لارڈ ہیسٹنگز کے رویہ اور طریقہ کار نے بادشاہ کے مفاد میں بہت روڑے اٹکائے لیکن اس طرح نئے گورنر جنرل لارڈ امرہسٹ کی نیا صنیوں سے پھر بھی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں اگست ۱۸۲۶ء میں لارڈ امرہسٹ نے حسب دستور مغربی صوبوں کا دورہ شروع کیا۔

جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو قدرتاً وہ اس سے ملنے کا خواہشمند ہوا۔ کچھ روز تک محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے بعد بادشاہ کو امیدوں کی جھلک نظر آنے لگی۔ جب گورنر جنرل متھرا پہنچا تو شہنشاہ نے اپنے بیٹے مرزا سلیم کو اس کے پاس بھیجا تاکہ وہ مطلع کردے

کہ بادشاہ آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ اس ملاقات کی رسمی ترتیب طے ہو
کے بعد گورنر جنرل دہلی پہنچا اور بادشاہ سے محل میں ملا۔ بادشاہ نے ریزیڈنٹ کو لکھا کہ خدا
کے فضل سے آخرکار لارڈ امہرسٹ میرے یہاں آئے اور میں نے رازدارانہ طریقہ اور مسر
کے تاثرات سے جو تمناؤں کے بر کرنے کے لئے خوش آمدید کہا۔ حتی الوسع میں نے ان
کی خاطرمدارات کی اور جو معاہدات ہمارے اور گورنمنٹ برطانیہ کے درمیان ہوتے تھے وہ
بیان کئے اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنی خواہشات بھی ظاہر کر دیں۔

یہ مراسلہ ایک عرضداشت کی شکل میں تھا جس کو اسی وقت گورنر جنرل کے سکرٹر
کو دے دیا ولیعہد نے بھی ایک علیحدہ عرضداشت اپنے معاملات کے متعلق پیش کی اپ
عرضداشت میں بادشاہ نے خواہش کی تھی کہ گورنمنٹ ان شرائط کو جن کے متعلق اس
کا خیال تھا کہ گورنمنٹ نے اس کے مرحوم باپ سے کئے تھے پورا کرے۔

علاوہ ازیں شہنشاہ نے اپنے وظیفہ اور وقار کے متعلق جو مدت ہوئی ختم ہ
تھے کچھ اور باتیں بھی پیش کیں، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دوران گفتگو میں ایرانی سکرٹری افضل
بیگ وکیل بادشاہ متعینہ ریذیڈنسی سے کہا کہ وہ مضامین جن کا کہ بادشاہ کی عرضداش
میں حوالہ ہے کسی صورت سے بھی سرکاری معاہدے نہیں قرار دیتے جا سکتے اس کا تح
جواب افضل بیگ نے ۱۴ راگست ۱۸۲۷ء کو دیا اور سکرٹری کے دعویٰ کی یوں تردید کی
(۱) جب ریذیڈنٹ نے دستخط کے بعد محولہ کاغذات شاہ مرحوم کے حوالے ک
تو اس فعل سے یہ ثابت ہوگیا کہ فریقین کے مابین معاہدہ ہے۔
(۲) ان کاغذات میں ایک تحریر موجود تھی جس کی رو سے ستر ہزار روپیہ باد
کو سات مذہبی تقریبوں پر دے جا رہے تھے۔

(۳) منجملہ اور دفعات کے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سزائے موت کے کاغذات شاہ مرحوم
ے سامنے حکم ناطق کے لئے پیش کئے جایا کریں۔

(۴) ۱۸۰۵ء کے ضابطہ ۸ میں صریح طور پر تاکید ہے کہ شہر دہلی و مضافات جو
ناہی خاندان کی کفالت کے لئے مخصوص ہے کمپنی کی حدود سے باہر ہے۔

بادشاہ نے ۱۸۰۹ء میں اس بات پر زور نہیں دیا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ریذیڈنٹ
ر حکام بالا کے سامنے اس معاملہ کو پیش کر دے۔ بادشاہ سلامت اپنی عرضداشت
ررنمنٹ کو بھیجنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ان کو خبر ملی کہ لاٹ صاحب دورہ کرنے
الے ہیں اس لئے انھوں نے سوچا کہ اس سے ملاقات کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اصل
عاہدہ پر عمل کیوں نہیں ہو رہا ہے بادشاہ کے دعوے اس معاہدہ پر مبنی تھے اور وہ ان سے
ست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔

بہرنوع گورنمنٹ نے بادشاہ کی مذکورہ بالا عرضداشتوں کی ایک نقل ریذیڈنٹ
متعینہ دہلی کو اس کی رائے معلوم کرنے کو بھیج دی سر چارلس مٹکاف اس وقت دہلی کا
ریذیڈنٹ تھا اس نے طویل نوٹ میں اپنے خیالات لکھ کر گورنمنٹ کو واپس کر دی
بتدا ہی سے ریذیڈنٹ موصوف بادشاہ کے مطالبات کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا
تھا۔ بلکہ بعض اوقات شدید مخالفت بھی کرتا تھا۔ اس نوٹ میں اس نے یہ فرض کر لیا تھا
کہ بادشاہ کی عرضداشت کا مقصد محض وظیفہ کی رقم کو بڑھانا تھا۔ اس لئے اس نے یہ
ثابت کیا کہ وہ دستاویز جو مرحوم بادشاہ کو ۱۸۰۵ء میں ارسال کی گئی تھی وہ ہرگز گورنمنٹ
کی مستقبل کے طرز عمل پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کرتی تھی بلکہ اس میں صرف گورنمنٹ
کے ارادوں کا ذکر تھا حکومت برطانیہ کی نیت کبھی یہ نہ تھی کہ بادشاہ کے ساتھ کوئی معاہدہ کرے

مٹکاف کے دوسرے خیالات مختصراً اسی کے الفاظ میں یہ ہیں۔

"یہ تحقیق نہیں ہے کہ ۱۸۰۵ء کے معاہدہ کا کیا منشا ہے آیا بادشاہ کے لیئے وظیفہ کی کوئی خاص رقم منظور کرنا ہے یا اسے کسی خاص علاقہ کی خالص آمدنی دینا ہے"

لیکن یہ یقین کرنے کے لئے کافی وجہ موجود ہے کہ بہر نوع یہی نیت ہو سکتی تھی کہ اس وقت زیادہ سے زیادہ کیا وظیفہ مقرر کیا جائے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کسی مخصوص علاقہ کی بچت کی آمدنی سے یہ مراد ہو کہ وظیفہ کی رقم کا تعین نہ ہو تو یہ امر بھی مبہم رہ جاتا ہے حالانکہ یہ واضح ہے کہ ۱۸۰۵ء میں علاقہ کے اخراجات میں فوجی اخراجات بھی شامل ہیں لیکن مئی ۱۸۰۵ء کا منشاء کچھ بھی ہو اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ یا وہ مخصوص علاقہ جو بادشاہ کو دیئے جانے کی تجویز تھی دوسرے سرداروں کو دے دیا گیا تھا اور جو اس سے محفوظ رکھا گیا وہ بادشاہ سلامت کے بار کو اٹھانے کے لئے قطعاً ناکافی تھا لہذا شاہی وظیفہ برابر بلا لحاظ آمدنی ادا ہوتا رہا اور قطعی انتظام ۱۸۰۹ء میں کر دیا گیا۔ جس کی رو سے وظیفہ بڑھا دیا گیا حکومت ہند اور آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی ان وعدوں پر غور کیا جو بادشاہ کے ساتھ پہلے کئے گئے تھے۔

اگر ۱۸۰۵ء کے ارادے کا اطلاق علاقہ دہلی کی آمدنی میں ظاہری اضافہ پر ہو سکتا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت کے فیصلہ میں دہلی کا جنوبی حصہ نہیں شامل تھا اور دوسرے اضلاع شامل تھے جو اب علاقہ دہلی سے خارج ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۰۹ء میں جو فیاضانہ رقم وظیفہ کی طے ہوئی تھی وہ تقریباً اس رقم کے برابر تھی جو موجودہ علاقہ دہلی کی کل آمدنی میں سے اخراجات حکومت وضع کرنے کے بعد بچ رہتی تھی۔

یعنی تیس لاکھ روپیہ اور اس میں سے فوجی اخراجات بھی ادا کرنے تھے اور اگر اس طریقہ پر عمل کیا جائے تو پھر اس آمدنی میں شاہی وظیفہ نہیں بڑھایا جا سکتا۔

حاصل کلام اس کی معقول وجہ نہیں نظر آتی کہ برٹش گورنمنٹ جو مقررہ رقم بطور وظیفہ بادشاہ سلامت کو دے رہی ہے اور جو بادشاہ سلامت کی مفروضہ ضروریات اور ہماری حیثیت کے مطابق ہے اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔"

سر چارلس مٹکاف نے ان خیالات کے اظہار کے بعد یہ لکھا کہ وظیفہ کا بڑھانا دشوار ہے البتہ شاہی خاندان کے دور کے عزیزوں کی پرورش میں یقیناً اضافہ کی ضرورت ہے۔

شہنشاہ کی عرضداشت کے جواب میں گورنمنٹ نے وہی رویہ اختیار کیا جو مٹکاف کی تجاویز تھیں۔ بادشاہ قدرتاً بہت مایوس ہوئے چنانچہ انھوں نے ریذیڈنٹ کو ایک تحریر بھیجی جس میں لکھا کہ "گورنر جنرل نے ان معاہدوں اور وعدوں کے ایفاء میں دوسروں کی طرح کوئی دلچسپی نہیں لی حالانکہ یہ معاہدے گورنمنٹ کے آئین میں داخل تھے۔

مکتوبی رسم وراہ جس کو کچھ عرصہ پہلے بند کر دیا گیا تھا اور جس سے بادشاہ شکوک میں مبتلا تھے وہ بادشاہ کے خیال میں لارڈ امہرسٹ سے ملاقات کے بعد از سر نو جاری ہو جاتے:

کول برک کا تقرر جب بحیثیت ریذیڈنٹ دہلی عمل میں آیا تو تجدید مراسلت تو ضرور ہو گئی لیکن ان سے وہ جملے محو کر دئے گئے جن سے برٹش گورنمنٹ کی سیاسی وابستگی کا اظہار ہوتا تھا۔

(باقی آئندہ)

ایک گمنام شاعر

(جناب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور)

اردو ہی پر موقوف نہیں، ہر زبان کے مشہور شاعروں کی تعداد، گمناموں کے مقابلے میں کم ہوا کرتی ہے۔ آپ نے یہ شعر بار بار سنے ہوں گے:-

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے، نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

مگر کتنے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ نظام کون تھے، کہاں کے تھے اور کیا کہتے تھے۔

لوگ کہتے ہیں گمنامی کی وجہ شاعر کی بدنصیبی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں، مگر بدنصیبی کا باعث اپنے کلام کی خوبیوں پر بیجا اعتماد ہوا کرتا ہے پہلے زمانے میں مشک خود بو دیتا ہو تو دیتا ہو۔ اب تو عطار کو بتانا پڑتا ہے کہ یہ کیا ہے اور اس کی بو کیسی ہے

رامپور کے شاعر اسی بدنصیبی کی بدولت بیرونی حلقۂ ادب میں کم مشہور ہیں حالانکہ ان میں ایسے بھی ہو گزرے ہیں جو ہندوستان کے بڑے بڑے استادوں کی ٹکر کے تھے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے، دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

رامپور کے ایک شاعر نے بھی یہی مضمون باندھا ہے۔ مگر اُس نے نہ منصور کو گھٹایا اور نہ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہتا ہے:-

اے نوا سنج انا الحق ترا دعویٰ حق ہے　　لیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا

غالب ہی کا ایک اور مشہور شعر ہے :-

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بات بڑے مزے کی کہی ہے۔ مگر یہاں بھی چھپا ہوا طنز موجود ہے۔ رام پور ہی کے دوسرے شاعر نے اس قافیے میں طبع آزمائی کی ہے کہتا ہے :-

لاکھ جانیں ہوں تو قربان ہیں اس رونے پر　　آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے

یہ اور اسی قسم کے بہت سے بلند پایہ شعر جب کبھی میں نے کسی خوش ذوق دوست کو سنائے تو سننے والے نے کہنے والے کے متعلق اکثر لاعلمی کا اظہار کیا۔ اوروں کا ذکر چھوڑیئے مجھے یقین ہے کہ آپ نے بھی اساتذۂ رام پور کا کلام بہت کم پڑھا اور سنا ہوگا ایک قصیدے کے چند ابتدائی شعر ملاحظہ فرمائیے :-

شکستِ رونقِ بازارِ ناکامی کا ہے ساماں　　جہاں سے دودِ شمع کشتہ بن کر اڑ گیا حرماں

بہارِ شادمانی کا ستارہ آج یہ چمکا　　زحل ! گلدستۂ انجم میں ہے اک نو گلِ خنداں

خوشی بالیدہ یوں ہوتی ہے جیسے نشۂ صہبا　　مسرت اس طرح بڑھتی ہے جیسے وصل کا ارماں

رگِ جاں میں ہے یوں ریشہ دواں کیفیتِ شادی　　کہ جیسے تاک کی رگ رگ میں موجِ بادہ ہو پنہاں

دوسرے قصیدے کے چند مدحیہ شعر سنیئے :-

اے ترے قول و عمل میں صفتِ معنی و لفظ　　اے ترے عہد وفا میں اثرِ نقش ونگیں

تیرے رہوار کا از بس کہ ہے بارِ احساں　　دب گئی ایسی کہ اب اٹھ نہیں سکتی ہے زمیں

ہے ترے ناخنِ احساں کا تصرف ایسا　　روئی عالم پہ نہیں ہے گرہ چینِ جبیں

تیسرے قصیدے کی دعا ملاحظہ ہو :-

رہے جب تک جہاں میں بزم حسن و عشق کی گرمی — رہے جب تک نیاز عاشقاں و ناز معشوقاں
ترے بخت ہمایوں پر رہے، فیض ازل مفتوں — تری تقدیر کی نسبت سے چرخ مشتری نازاں
وفا بھی ہو سخن سنج و دعاگوی و ثنا گستر — ترا بذل کرم ہو قدر افزائے دعاگویاں
ہمیشہ روز افزوں ہو، ہمایوں ہو مبارک ہو — تجھے سرمایۂ دولت تجھے مداحی شایاں

ان شعروں کو سن کر آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ شاعر قصیدہ گوئی میں کیا درجہ رکھتا ہے اب ایک غزل پیش کرتا ہوں:-

اب دل میں ہے تصور جاناں نہ کیجئے — وہ لاکھ بار آئے تو مہماں نہ کیجئے
مر جائیے طبیب کی صورت نہ دیکھئے — سو زخم تیغ کھائیے درماں نہ کیجئے
رگ رگ میں ایک تیز سا نشتر چبھوئیے — لیکن خیال ناوک مژگاں نہ کیجئے
طول شب فراق کا افسانہ چھیڑئیے — لیکن بیان زلف پریشاں نہ کیجئے
در پردہ دل پہ آہ سے بجلی گرائیے — لیکن تلاش جلوۂ پنہاں نہ کیجئے
توفیق ہو، تو دونوں جہاں بھی نہ لیجئے — ہمت پڑے، تو چارۂ ہجراں نہ کیجئے
ناخن کو دل میں توڑ کے بس چھوڑ دیجئے — یاد جگر خراشئ پیکاں نہ کیجئے
خنجر سے بات کرنے کی حسرت نہ کھینچئے — دشنے سے منہ لگانے کا ارماں نہ کیجئے
ناچار اپنا ہاتھ ہی رکھ لیجے زیر سر — لیکن خیال زانوئے جاناں نہ کیجئے
لب ہائے زخم دیکھئے اور خوب روئیے — امیدواری لب خنداں نہ کیجئے
دل بستگی کو عقدۂ امید سونپئے — مجموعۂ خیال پریشاں نہ کیجئے

گھر لوٹ لیں، وفا، جو نہیں ہے، نہیں سہی
سر کاٹ لیں زباں کے عوض ہاں نہ کیجئے

دوسری غزل کے دو چار شعر عرض ہیں:۔

یارب وہ داغ دے کہ تمنا کہیں جسے
رشکِ ہزار نقش سویدا کہیں جسے

کس کی نگاہ مست کا جلوہ ہے دیکھنا
سرجوشِ گرمیٔ خمِ صہبا کہیں جسے

کس سے کہوں کہ لاکھ امیدیں مٹا گئی
وہ ایک بات رنجشِ بیجا کہیں جسے

اس دل شکستگی پہ عنایت ہوا مجھے
اک عالمِ ہوس غمِ دنیا کہیں جسے

باقی ہے آنکھ میں ابھی اک پرتوِ خیال
وہمِ نگاہِ دیدہ عنقا کہیں جسے

کام آپڑا ہے اُس بت عیار سے وفا
خود بین و خود فروش و خود آرا کہیں جسے

تیسری غزل کے چند اشعار سنیئے:۔

ہر تری بات میں امید کے سو سو پہلو
اک خموشی سے تری لاکھ حکایت ہم کو

اک بگڑنے میں ترے لاکھ درستی اپنی
اک عداوت سے تری لاکھ محبت ہم کو

کٹ گیا عقدہ دل کشمکشِ ناخن میں
یاس کو مژدہ کہ حاصل ہے فراغت ہم کو

سادگی دیکھ کہ اس قطع تعلق پہ بھی ہے
تجھ سے بے رحم سے اک گونہ شکایت ہم کو

چوتھی غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

عذرِ جفا کے پردہ میں فکرِ جفا ہے کیا
ظالم یہ امتحانِ امیدِ وفا ہے کیا؟

پہلے کسی کے ناخنِ تدبیر توڑنا
پھر پوچھنا کہ عقدۂ بندِ قبا ہے کیا؟

افسونِ شوق گوششِ دو عالم میں پھونکنا
پھر مانگنا کہیں دلِ بے مدعا ہے کیا؟

مجبور ہو کے غیر کو اپنا بنا لیا
ظالم کی دشمنی بھی محبت فزا ہے کیا؟

در پردہ پھر یہ رنجش طاقت گسل ہے کیوں؟
بے پردہ پھر یہ نازشِ صبر آزما ہے کیا؟

جادو طرازیٔ سخنِ دل نشیں ہے کیوں؟
نیرنگِ وعدہ ہائے تسلی فزا ہے کیا؟

اک رباعی بھی سنتے چلیے۔ کہتا ہے:-

حسرت نے کہا کہ دردِ پنہاں میں ہوا — قسمت نے کہا کہ رنجِ حرماں میں ہوا
اک اک نے تسلیاں دلِ زار کو دیں — بول اٹھی قضا کہ سب کا درماں میں ہوا

مجھے یقین ہے، آپ نے پہلی بار یہ کلام سنا ہے اور تعجب کر رہے ہوں گے کہ ایسے پاکیزہ گو شاعر کے حالات اور اشعار سے اردو ادبی دنیا کیوں غفلت روا رکھ رہی ہے۔

میں آپ کے اس جذبہ سے فائدہ اٹھا کر عرض کرتا ہوں کہ یہ شاعر جس کا کلام آپ نے سنا وفاؔ تخلص کرتا تھا۔ نام عبدالہادی خاں قوم علیزئی پٹھان، اور وطن رام پور تھا۔ وفاؔ کے دادا مولوی ہزار میر خاں تازہ ولایت اور بہت بڑے عالم تھے۔ والد محمد یعقوب خاں فوج اور پولیس کے معزز عہدوں پر ملازم رہے۔ وفاؔ نے ہوش سنبھالا، تو گھر میں علم دولت اور عزت سب کچھ دیکھا، ماں باپ نے ناز ونعم کے ساتھ پالا پوسا اور فارسی و عربی کی مکمل تعلیم دلائی۔ وفاؔ نے مولوی عبدالحق خیرآبادی سے منطق و فلسفہ کی اور اپنے ماموں حکیم محمد حسین خاں رام پوری سے طب کی تکمیل کی۔

والد کے انتقال کے بعد کھیل بگڑا اور طلب معاش کی خاطر گھر سے نکلنا پڑا۔ تو وفاؔ بھوپال پہنچے۔ وہاں نائب تحصیلداری کے عہدے پر کچھ دن کام کیا تھا کہ کسی بات پر ناراض ہو کر واپس چلے آئے اور علی گڑھ میں مطب شروع کر دیا۔

شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ "فارسی کلام میں کسی سے اصلاح لینے کا حال معلوم نہیں ہوا۔ البتہ اردو کی دو ایک غزلیں ابتدا میں مرزا داغ کو دکھائی تھیں اور اس کے بعد

کچھ کلام امیر مینائی مرحوم کی نظر سے گزرا تھا مگر حق یہ ہے کہ مرحوم خود اپنی طبیعتِ خدا داد کے شاگرد تھے، اور ان دونوں استادوں سے شاگردی کا تعلق برائے نام اور محض اک رسمِ قدیم کی تقلید تھی، ورنہ اُن کے رنگ سخن کو داغ و امیر کے رنگ سے کچھ واسطہ نہیں"

خود وفا نے ایک مقطع میں لکھا ہے کہ

اے وفا شیفتۂ مومن و غالب ہوں میں
میں نے کچھ رنگ اُڑا یا ہے غزل خوانی کا

لیکن میری رائے میں مزاج کی آزادی، طبیعت کی مشکل پسندی۔ احساس کی نزاکت اور نظر کی بلندی میں وفا کو غالب سے زیادہ مشابہت ہے، یہ اتفاق تھا کہ جو کچھ غالب پر گذرا تھا ویسا ہی وفا کو بھی پیش آیا نتیجہ یہ نکلا کہ روشِ فکر اور طرزِ ادا دونوں میں مومن سے زیادہ غالب کا اثر وفا کے کلام میں نمودار ہو گیا۔ فارسی ترکیبوں کی بناوٹ نادر تشبیہوں اور استعاروں کی سجاوٹ، تخیل کی شگوفہ کاری اور اس پردے میں حسرت ویاس اور ناکامی و محرومی کا بیان سراسر غالب کی زبان اور قلم سے نکلا معلوم ہوتا ہے

غالب کے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا کہ انھیں مرگ محبوب پر سوگوار ہونا پڑا۔ وفا کو بھی ایسا ہی سانحہ پیش آیا تھا جس پر انھوں نے دو مسلسل غزلیں لکھی ہیں۔ پہلی یہ ہے:-

مل گئی خاک میں وہ انجمن آرا ہے ہے!
قالبِ گور میں ہے جانِ تماشا ہے ہے!

سینکڑوں انجمن ناز کا مٹنا، صد حیف!
ایک محبوبۂ طناز کا مرنا، ہے ہے!

حسن ہے، ماتمِ حسن خدا خیر کرے!
بزمِ خوباں میں جواں مرگ کا رونا ہے ہے!

کھلنے پایا بھی نہ تھا رنگ جوانی اب تک
ٹوٹ کر رہ گئی شاخِ گلِ رعنا ہے ہے!

غیر کیا اپنی ادائیں بھی گراں تھیں جس کو
ایسے نازک پہ اجل کا یہ تقاضا ہے ہے!

بے نیازی ہی سہی پر اسے کیا کہتے ہیں
کھچ گئے اتنے کہ بس رہ گئے تنہا ہے ہے!

اے وفا وہ بھی اُٹھائے تو نہیں اُٹھ سکتا — حسنِ نوخیز نے چھوڑا ہے وہ پردا ہے ہے

دوسری غزل غالب ہی کی زمین میں صرف قافیہ بدل کر لکھی ہے:۔

یاد آتا ہے وہ لطفِ زندگانی ہائے ہائے! — ہم بغل اک حاصلِ عمرِ جوانی ہائے ہائے
شاہدِ رنگیں قبا، جس کا نمونہ شاخِ گل — وہ خرامِ ناز اس کی گل فشانی ہائے ہائے
عشقِ ممنونِ نوازشہائے پیہم واہ واہ! — حسن مصروفِ کرمہائے نہانی ہائے ہائے
ہر سخن اک وعدہ، ہر وعدہ طلسمِ ناز تھا — دل فریبی، دل ربائی، دل ستانی ہائے ہائے
نازشِ پنہاں کے بدلے میں ہزاروں التفات — رنجشِ ظاہر سے پیدا مہربانی ہائے ہائے
دل نہ جانے جس کو، وہ اک خاص اندازِ وفا — میں نہ سمجھوں جس کو، وہ لطفِ نہانی ہائے ہائے
اب وہی میں ہوں وفا اور ماتمِ صد آرزو — اب وہی دل اور وہی پچھلی کہانی ہائے ہائے
پردۂ فرقت پڑا ایسا کہ اُٹھ سکتا نہیں — کاش اُٹھ جاتے حجابِ زندگانی ہائے ہائے

غالب نے منہ بولے بیٹے کی جواں مرگی کا داغ اُٹھا کر کہا تھا:۔ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور۔ وفا کا دس بارہ برس کا پھول سا بیٹا چراغ سے جل کر دنیا سے سدھارا، تو انھوں نے یہ مرثیہ لکھا:۔

پھر تازہ امتحانِ وفا ہے، دفا کے بعد — کیا رہ گیا تغافلِ صبر آزما کے بعد
عادت سے ہے اضطراب کی عادت کو کیا کروں — روتا ہوں درد کو، دلِ درد آشنا کے بعد
تو جل گیا کہ خانۂ امید جل گیا — دل بجھ گیا ترے سخنِ دل کشا کے بعد
ہے ہے، قضا نے تجھ کو دیا آتشیں کفن — کیا داغ تازہ لے کے چلا ہوں قضا کے بعد
ہے ہے بہار آبلہ و سوختہ بدن — ہاں، صبر، جاں گدازی برقِ فنا کے بعد

ان اشعار سے اندازہ ہو سکے گا کہ غالب و وفا کی سرشت میں کتنی یکسانی تھی۔

فرماتے ہیں:۔

در عالم اس طرف ہیں، اس طرف محرومیٔ قسمت
چلو، اب امتحانِ ہمت مردانہ ہو جائے

بتا اے یاس تو کیا ہے تری ہمت کہاں تک ہے
کہ پرواز پر امید، مرگ ناگہاں کب تک

میں سکھاؤں ہمت عنقا کو بال افشانیاں
سر اٹھانے دے اگر ذوقِ گرفتاری مجھے

نزع میں بے کسیٔ نزع کا ماتم ہے ہے
اے وفا، پرسشِ احباب کا رونا ہے مجھے

جان و سرمایہ حرماں، دل و بے حوصلگی
وا دریغا، پر امید ہو، پرواز نہ ہو!

جو سبک سیر ہیں، آزاد رہا کرتے ہیں
دیکھ لو نکہتِ گل، بستۂ زنجیر نہیں

نواب جنت مکاں کے عہد کا واقعہ ہے۔

صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں بہادر شرر ہوم سکریٹری نے توپ خانہ کے میدان میں مشاعرہ کیا وفاؔ اور ان میں پُرخلوص ربط تھا۔ علی گڑھ سے یہ بھی با اصرار بلائے گئے۔ طرح کے مصرع دو دے گئے تھے، وفاؔ نے پہلے جو غزل پڑھی اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

عرصۂ محشر کی رونق اک تمہارے دم سے ہے
ہاں طلوعِ مہر سے ہے گرمیٔ بازارِ صبح

آپ کے جلوے سے اونچا آپ کا عالی دماغ
آپ کے منظر کے نیچے، دیدۂ بیدارِ صبح

تیرے ہوتے اک دھواں بزمِ چراغانِ نجوم
تیرے آتے شبستاں ہے تجلی زارِ صبح

دوسری غزل کے سنانے کی باری آئی تو وفاؔ نے مطلع پڑھا:۔

شوخیٔ ناز کی تصویر ہے تصویر کے ساتھ
موجۂ خندہ ہے، جوشِ مے تقدیر کے ساتھ

پہلی ہی غزل سے محفل میں رنگ جم چکا تھا اس مطلع کے بعد یہ شعر پڑھے:۔

رشتۂ عمر میں اک اور گرہ ڈال گئے
دل کو بھی توڑ گئے، ناخنِ تدبیر کے ساتھ

جم گئے پہلوی دل میں غمِ دل کے نقشے
بن گئے سیکڑوں گھر، حسرتِ تعمیر کے ساتھ

جاؤ تم عالم فرصت کے تماشے دیکھو چھوڑ دو گردشِ تقدیر کو تقدیر کے ساتھ

تحسین و آفریں کی بارش ہو رہی تھی کہ وفاؔ نے یہ شعر پڑھا اور اسی پر گویا بزم مشاعرہ کی ہماہمی ختم ہو گئی :-

روحِ پروانۂ ناشاد کی رخصت ہے ہے! کچھ دھواں سا نظر آیا لبِ گلگیر کے ساتھ

سرکار جنت مکان نے قدردانی فرمائی، اور بزمرۂ اطبائے خاص سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا وفاؔ کی نازک مزاجی نے وطن میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور یہ کسی نہ کسی بہانے ترک ملازمت کرکے علی گڑھ چلے گئے۔ ضلع علی گڑھ کے تمام رؤسا ان کی قوتِ حذاقت و مہارت کے قائل ہوتے گئے اور جب وقت آیا کہ اپنی خداداد لیاقت کے جوہر دکھا کر اپنے اہل و عیال کی زندگی کو زیادہ پرسکون بنائیں کہ اچانک حدتِ فکر تپ دق بن کر نمودار ہوئی اور رامپور کا یہ بے بدل شاعر ۴۷ سال کی عمر میں ۲۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا منشی احمد علی شوقؔ قدوائی نے یہ مصرعِ تاریخ کہا :-

عبدالہادی خاں وفاؔ نے راہ عدم کی لی ہے آج

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

جو ۱۹۴۶ء کی مطبوعات میں سے ہے طبع ہو کر پریس سے آگئی ہے۔ قیمت غیر مجلد للعہ ۱۹۴۶ء کی دوسری اہم کتاب "ترجمان السنہ" ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ بھی طبع ہو کر پریس سے آگیا ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ ، مجلد عسے

ادبیات

پیغمبرِ اسلام کی زندگی

(جناب بسمل شاہجہان پوری)

جناب بسمل شاہجہانپوری ایک کہنہ مشق، پختہ کلام اور نغز گو ادیب و شاعر ہی نہیں بلکہ پُرجوش مبلغ بھی ہیں اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اصلاح و خدمتِ خلق میں صرف کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں جا بجا کردار و عمل کے قابلِ تقلید نمونے ملتے ہیں۔

جب سمجھ نہ سکیں گے جز اہلِ حق بسمل　　وہ اختیار کیا طرزِ زندگی میں نے

یہ نظم ہم آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ شریک اشاعت کر رہے ہیں

(مدیر)

اے کہ سر ردزِ مشیت ہے نظر میں تیری　　سر بزانو ہے فلک راہ گذر میں تیری

نغمۂ زیست کچھ اس لے میں سنایا تو نے　　مردوں کو زندۂ جاوید بنایا تو نے

تو نے سکھلائے ہر اک دل کو رموزِ نبوی　　تیرے قربان میں مکی مدنی العربی

کانپ اُٹھی تھی تیری آواز سے دنیا کی زمیں　　تیرے قدموں پہ جھکی قیصر و کسریٰ کی جبیں

تیرے اخلاق نے طائف کی گذر گاہوں میں　　کچھ عجب شان سے تبلیغ کی گمراہوں میں

ظلم کو رحم کا آئین سکھایا تو نے
اپنے دشمن کو بھی سینے سے لگایا تو نے

تو ہدایت کا علم لے کے یتیمی میں اٹھا
تیرے صدقے ترے قربان امیر الغرباء

رقص کرتے ہیں فضاؤں میں شرارے ابتک
مرتعش ہیں تری آواز سے تارے ابتک

عرش تک صاف عیاں نقشِ قدم ہیں تیرے
مہ و خورشید یہ سب خیل و خدم ہیں تیرے

یاد آتے ہیں ترے عہد کے ایام بلند
علم افرازِ دو گیتی ہے ترا نام بلند

تو نے دنیا سے جہالت کو مٹایا یکسر
صرف تائیدِ الٰہی کا سہارا لے کر

کتنا شائستہ ہے ہر ایک قرینہ تیرا
غیرتِ خلد ابھی تک ہے مدینہ تیرا

علماء حق

حصہ اول اس حصہ میں ان تمام علماء امت کے مفصل حالات زندگی اور کارنامے درج ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے لے کر تحریک دارالعلوم دیوبند تک وطن و ملت کی آزادی کے لئے جد و جہد کی اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

یہ حصہ ۱۶۵ عنوانات اور ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

حصہ دوم اس حصہ میں دوسری جنگ عظیم سے لے کر مہاتما گاندھی کی قربانی تک کے تمام سیاسی حالات اور اس دوران میں جن علماء حق نے آزادئ وطن اور اس کے بعد ملک میں قیام امن و اتحاد کے لئے انتھک کوششیں کی ہیں ان کا مفصل تذکرہ درج ہے۔

قیمت حصہ اول ۳۰۴ صفحات مع خوبصورت گرد پوش ہے، قیمت حصہ دوم ۲۷۶ صفحات مع خوبصورت گرد پوش

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد بست و دوم شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۴۹ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۶۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

خدا کا شکر ہے ندوۃ المصنفین کی کتابوں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ا
کتابوں کے چند سال میں ہی کئی کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں اور متعدد کتابیں ایسی ہیں جن کی ہ
پاکستان دونوں میں مانگ ہے لیکن سرمایہ نہ ہونے کے باعث ان کا نیا اڈیشن شائع کرنے
سامان اب تک نہیں ہو سکا کتابوں کے عام قدر دانوں کے علاوہ ادارہ کی متعدد کتابیں کئی ی
اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہیں اور طلباء ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ار
میں مولانا مفتی عمیم الاحسان صاحب کے ایک گرامی نامہ سے ابھی حال ہی میں معلوم ہوا کہ خاکسا
الحروف کی کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" مدرسہ عالیہ ڈھاکہ اور اس سے متعلقہ مشرقی
کے جملہ مدارس عربیہ کے اعلیٰ امتحان "ٹائٹل" کے نصاب میں شامل کر لی گئی ہے اس طرح گ
ایک صوبہ میں یہ کتاب ہر سال تقریباً سات سو طلباء کی نظر سے گذرے گی" فالحمد للہ علیٰ

میں خود اپنی اس کتاب کی نسبت کیا رائے رکھتا ہوں۔ یہ ایک صفحہ کے اس
سے ظاہر ہے جو کتاب کے شروع میں خود میرے قلم کا لکھا ہوا ہے لیکن اب اس کتاب کی
مقبولیت اور شہرت دیکھکر جی چاہتا ہے کہ خدا توفیق اور فرصت و سکون عطا فرمائے تو میں
کی کتاب "عروج و زوال روما" کے طرز پر اس کو از سر نو جی لگا کر مرتب کروں اور متعدد جلد
میں یہ داستان نیم خوش و نیم ناخوش سناؤں دوسرا اڈیشن ابھی چھپا تھا اور اب ختم ہونے
قریب ہے امید یہ ہے کہ تیسرا اڈیشن میری خواہش کے مطابق مکمل نہیں تو بھی ہوا تو دوسرے
سے زیادہ ضخیم ہوگا اور اس کے شروع میں ایک نہایت مفصل مقدمہ ہوگا جس میں قرآن مج

یات کی روشنی میں قوموں کی زندگی اور موت کے اسباب پر گفتگو ہو گی اِدبیدہ التوفیق
یب۔ا لتکلان۔

ہر ملک کا قاعدہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد اس کی دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آتی ہیں
ان کو قومی روایات وعظمت کے مطابق نشو و نما پانے اور ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی ملک کے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کے معنی صرف یہ
یں ہیں کہ یہ ملک صنعت و حرفت میں ترقی پذیر ہو فوجی قوت میں بڑھا ہوا ہو اور ملک
ذرائع پیداوار کو صحیح طور پر کام میں لانے کے باعث اقتصادی اور معاشی اعتبار
ے خوشحال ہو بلکہ ایک ملک کی تہذیبی اور ثقافتی عظمت کا دار و مدار بڑی حد تک اس
ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ اپنے آباء و اجداد کے علمی و ادبی متروکات کی حفاظت کرے
دوسری جانب جدید علوم و فنون اور عصری ادبیات میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کرکے
پنے ملکی ذخیرۂ ادب کو ترقی یافتہ بنائے اور اسے وسیع سے وسیع تر کرے۔ آج یورپ کی مثال
رے سامنے ہے اس نے صنعت و حرفت سے ایشیا کو سیاسی طور پر اپنا دست نگر ضرور
یا۔ لیکن تمام دنیا کے افکار و خیالات اور دل و دماغ پر اس کا جو بے پناہ تسلط ہے اس کا واحد
سبب یورپ کے علوم و فنون اور اس کے لٹریچر کا حیرت انگیز سیلاب و طوفان ہے کیونکہ
اں صحیح معنی میں علمی اور ادبی مذاق عام ہے اس بنا پر یہ لوگ صرف علوم جدیدہ کے دلدادہ
ہیں بلکہ ان کو خود اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے علوم و فنون، شعر و ادب اور تاریخ و روایات
ے اس قدر دلچسپی اور گرویدگی ہے کہ ان کی تحصیل و تکمیل میں عمریں صرف کر دیتے ہیں "اساطیر
لین" کے ایک ایک نقش کی حفاظت کرتے ہیں اور اقوام عالم کے آثار کہن کا کھوج لگانے میں
نی زندگیاں تج دیتے ہیں یہی وہ سب چیزیں ہیں جنہوں نے مل ملا کر مغربی تہذیب کو آج دنیا
سب سے بڑی تہذیب بنا دیا ہے اور یہی وہ حربہ ہے جس سے یورپ اور امریکہ نے ایشیا
کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے"

ہندوستان تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے ممالکِ عالم میں ایک نہایت اہمیت وعظمت کا مالک ہے۔ کیونکہ سنسکرت علوم وفنون اور فلسفہ ویدانت کے حاملین کے علاوہ اس ملک کو ایک ایسی قوم کے وطن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے جس نے اپنے علوم وفنون۔ اپنی تہذ وتمدن، اور اپنے کلچر کی روشنی سے قرونِ وسطیٰ کے یورپ کو جگمگایا ہے اور آج بھی ممالک غرب کے بام ودر اُس کے کارناموں کی صدائے بازگشت سے گونج رہے ہیں۔ یہ آواز مادی کے ہنگامہ زاروں میں دھیمی ضرور پڑگئی ہے لیکن فنا بالکل نہیں ہوئی اور علوم وفنون کی تاریخ کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ہے جس کے کان اس آواز سے ناآشنا ہوں۔

اس بناء پر ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ملک کے آزاد ہوتے ہی ملک کے مختلف طبقات وعناصر کی یہ صلاحیتیں یک بیک اُبھر آتیں اور یہاں ایک شائستہ وترقی یافتہ ملک کی طرح علمی وادبی سرگرمیوں کا بازار گرم ہو جاتا لیکن نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ موجودہ صورت حال ان توقعات کے بالکل برعکس ہے۔ یہ علمی وادبی مذاق کا انحطاط یوں تو ملک کے ہر طبقہ میں عام ہے یونیورسٹیوں میں سائنس کے یا ان علوم کے طلباء کی تعداد جو معاشی فوائد رکھتے ہیں روز بروز حیرت انگیز طریقہ پر بڑھ رہی ہے اور فنون (Arts) کی طرف سے بے توجہی وبے رغبتی عام ہوتی جارہی ہے لیکن جہانتک عربی۔ فارسی اور اردو زبان وادب کا تعلق ہے ان کی حالت تو ناگفتہ بہ ہوگئی ہے اس سلسلہ میں اب صورت حال یہ ہے کہ پرانی کتابیں بازار سے نابید ہوتی جارہی ہیں ان کی ازسرِ نو طباعت واشاعت کا کوئی اہتمام وانتظام نہیں ہے اور دوسری طرف نئی کتابوں کی تصنیف وتالیف کا کام بالکل رکا ہوا ہے۔ حیدر آباد کے دار الترجمہ اور ادارہ معارف اسلامیہ اور دائرۃ المعارف اب ختم ہی سمجھئے۔ دہلی کی انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ یہ دونوں بھی حوادث کا شکار ہو کر خاموش ہوگئے۔ الہ آباد کی ہندوستانی اکاڈمی کو اب ہندی اکاڈمی بننے کا شوق چرا رہا ہے۔ پورے ملک میں صرف مصنفین برادر یعنی دار المصنفین اعظم گڈھ اور ندوۃ المصنفین دہلی رہ گئے یہ ہی دو ایسے ادارے نظر آتے ہیں جو جمود وتعطل کی مخالف ہواؤں میں بھی اپنی کشتی کو لئے چلے جارہے ہیں اور بس! اللہ اللہ خیر صلا۔"

یہ صورت حال انتہا درجہ افسوسناک بھی ہے اور شرمناک بھی! ہمیں اگر ایک زندہ قوم بن کر رہنا ہے تو لامحالہ ہمیں اپنے پرانے سرمایۂ علوم وفنون کی حفاظت بھی کرنی ہوگی اور آگے بھی بڑھانا ہوگا یہ کس طرح ہو سکتا ہے اور کیونکر؟ اس پر آئندہ اشاعت میں گفتگو ہوگی!

تدوین حدیث

تدوین حدیث کا ماحول

(۳)

از حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات
(جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

جو نہیں جانتے ہیں وہ شائد باور کر لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن اقوال وافعال کو یا تقریرات کو منسوب کیا گیا ہے ان کی تعداد لاکھوں لاکھ تک پہنچی ہے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے[1]، میں بتا چکا ہوں الحاکم صاحب مستدرک کی یہ شہادت پیش کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد

---

[1] ابن جوزی سے بڑھ کر شاید اس باب میں خود خیال کیجئے کس کا بیان قابل اعتماد ہو سکتا ہے انھوں نے اپنی کتاب صید الخواطر فصل ۱۰۵ میں حدیثوں کے متعلق اسی عددی مغالطہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہ لو جمع الصحیح والمحال الموضوع وکل منقول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بلغ خمسین الفاً (یعنی صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچ سکتی ہیں) انھوں نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے سارے اسلامی ممالک کا دو دو دفعہ دورہ ان ہی حدیثوں کے جمع کرنے کے لئے کیا لیکن ان کی مسند میں بھی چالیس ہزار حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں دس ہزار مکرر ہیں ملکہ ابن عساکر نے تو ان کا یہ قول نقل کیا کہ

(باقی برصفحہ آئندہ)

لا یبلغ عدد ھا عشرۃ دس ہزار تک نہیں پہنچی

الاف حدایث مدخل ص

اور قوی وضعیف، صحیح وحسن، معیاری، غیر معیاری حدیثوں کی تعداد مکررات کو الگ کر لینے کے بعد میرے خیال میں تیس بتیس ہزار سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر ایک ایک حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا دستور، اور یہ کہ جتنے راویوں سے حدیث

(بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ) کہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد مسند احمد کی قوی وضعیف حدیثوں کی تعداد تیس ہزار تک بمشکل تمام پہنچ سکتی ہے (دیکھو الکتانی ج ۲ صفحہ ۲) دراصل معنوی اور لفظی تکرار کے لحاظ سے شاید گننے میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے معناً یا ما آں جن دو حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے ابن عساکر نے ان کو بھی مکررات میں غالباً شمار کر لیا ہے اور ابن جوزی نے ان ہی حدیثوں کو مکرر خیال کیا ہے جن کے الفاظ بھی ایک ہی ہیں اور ابن جوزی کا شمار تو خیر تشدد پسندوں میں ہے، لیکن ان کے مقابلے میں جلال الدین سیوطی جیسے سہولت پسند بزرگ نے جمع الجوامع کے نام سے حدیثوں کے جمع کرنے کا جو آخری کام کیا ہے اور اسی کتاب کی فقہی ترتیب مشہور ہندی محدث علی متقی نے کنز العمال میں کی ہے دیباچہ میں شیخ علی متقی نے لکھا ہے کہ اس کتاب (یعنی کنز العمال) کے پڑھنے والوں کے سامنے نہ صرف جمع الجوامع ہی کی کل حدیثیں آجائیں گی بلکہ ایک حصہ ان حدیثوں کا بھی ان کو ملے گا جو جمع الجوامع میں نہیں پائی جاتیں اب دیکھیے کنز العمال کی حدیثوں کے گننے والوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب (۴۶۰۹۰) حدیثوں پر مشتمل ہے میں کہتا ہوں کہ کنز العمال کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے ان کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس میں اب بھی کتنی حدیثیں مکرر ہیں میرا تو خیال ہے کہ ان مکررات کو اگر حذف کر دیا جائے تو چالیس ہزار کی یہ تعداد گھٹ کر قریب قریب تیس ہزار تک پہنچ جائے تو تعجب نہ کرنا چاہیے کنز العمال کا خلاصہ بحذف مکررات خود علی متقی نے کیا ہے جو مسند احمد کے حاشیہ پر چھپ بھی چکا ہے شمار کرنے سے ثابت ہوا ہے کہ اس میں کل تیس ہزار اور دو حدیثیں درج ہوئی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ حدیث کے ان مجامیع یا دارۃ المعارف میں رطب و یابس ہر طرح کی حدیثیں لے لی گئی ہیں اسی لئے میرا خیال ہے کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف وحسن صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس بتیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے۔ ۱۲

سنی جاتی تھی، ایک اصطلاح بنالی گئی تھی کہ حدیث کی تعداد بھی دہی قرار پاتی تھی یعنی دس راویوں سے اگر سُنی گئی ہے تو وہی ایک حدیث دس حدیث بن جاتی تھی، الذہبی وغیرہ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ ابراہیم بن سعید الجوہری کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ ایک صاحب جن کا نام جعفر بن خاقان تھا انھوں نے ابراہیم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث کے متعلق کچھ دریافت کیا۔ ابراہیم نے اپنی لونڈی (جاریہ) کو بلایا اور کہا کہ

اخرجی لی الجزء الثالث والعشرین	حضرت ابوبکرؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی
من مسند ابی بکرؓ	تیرہویں جلد نکال کر لا،

جعفر نے ابراہیم کے ان الفاظ کو سن کر حیرت سے کہا کہ ابوبکر صدیقؓ سے تو پچاس حدیثوں کا صحیح ثابت ہونا بھی مشکل ہے یہ آپ نے ان کی حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ کہاں سے جمع کر لیا جس کی اتنی جلدیں ہیں، یہ سُن کر ابراہیم نے حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ

کل حدیث لا یکون عندی	ایک ایک حدیث جب تک سَو سَو طریقوں
من مائة وجه فانا فیه یتیم	سے مجھے نہیں ملتی، تو اس حدیث کے متعلق
تذکرہ ص۹۵ ج۲	میں اپنے آپ کو یتیم خیال کرتا ہوں

مطلب ابراہیم کا یہی تھا کہ ایک ایک حدیث سَو سَو طریقوں سے جب تک مجھے نہیں ملتی اس وقت تک تو اپنے آپ کو اس حدیث کے متعلق لاوارث یتیم آدمی خیال کرتا ہوں، اور یوں ایک حدیث کو بجائے ایک کے وہ سَو حدیث بنا لیتے تھے ظاہر ہے کہ اس طریقے سے ابوبکر صدیقؓ کی حدیثوں سے مجلدات ابراہیم نے اگر بنا لئے تھے تو اس

میں تعجب کی کیا بات ہے، میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات والی حدیث واقع میں ظاہر ہے کہ ایک ہی حدیث ہے، لیکن راویوں کے تعدد کی بنیاد پر محدثین نے بجائے ایک کے اس کی تعداد پانسو تک پہنچا دی ہے۔ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ "محدثین" کا یہ خاص کارنامہ ہے، حدیثوں کی صحت و سقم کا پتہ چلانے کا یہ بہترین طریقہ تھا، جسے انھوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس زمانے میں پروپاگنڈے کے لئے یا صرف اس لئے کہ خبر میں سنسنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے بے بنیاد جھوٹی خبروں کے پھیلانے کا جو عام رواج ہے، ان خبروں کے متعلق بھی صحیح رائے وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جو مختلف نیوز ایجنسیوں کی خبروں اور مختلف اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعوں سے باخبر رہتے ہیں، وہی جانتے ہیں اور اُن ہی کو یہ جاننے کا موقع ہے کہ کن کن ایجنسیوں کی روش محتاط ہے، ان میں کس کس کی کیا کیا خصوصیت ہے ان میں بھروسہ اور اعتماد کے قابل خبریں کون مہیا کرتا ہے کچھ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ اس زمانہ کے محدثین کا حال تھا سفیان ثوری کا ایک قول حاکم نے معرفۃ الحدیث میں نقل کیا ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ حدیثوں کے سننے کی غرض ایک ہی نہیں ہوتی، کہا کرتے تھے کہ

"ہم بعضوں سے اس لئے حدیث سُنتے ہیں کہ اس کو اپنے دین میں شریک کریں اور کبھی کسی حدیث کی صحت اور عدم صحت کے متعلق فیصلہ کو ملتوی کرنے کے لئے بھی ہم بعضوں سے اس حدیث کو سُنتے ہیں بعضوں کی بیان کی ہوئی حدیث کو ہم جانتے ہیں کہ مستحق توجہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بیان کرنے والے کی روش اور مذہب کا پتہ چلانے کے لئے ہم اس سے حدیث سُنتے ہیں۔"

معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۳۵

حاکم نے احمد بن حنبل کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہم جس زمانے میں صنعاء (یمن) میں حدیث پڑھنے کے لئے مقیم تھے، اور میرے ساتھ علاوہ دوسرے رفقاء کے یحییٰ بن معین بھی تھے، ایک دن میں نے یحییٰ کو دیکھا کہ گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، اور کوئی آدمی جب سامنے آجاتا ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت انس کے نام جعلی حدیثوں کا ایک مجموعہ ابان کی روایت سے جو پایا جاتا ہے، اسی کو یحییٰ نقل کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم ان غلط اور جھوٹی روائتوں کو نقل کر رہے ہو، اس وقت یحییٰ بن معین نے کہا کہ

بھائی! اسی لئے تو اس کو لکھ رہا ہوں کہ ان ساری روایتوں کو لکھنے کے بعد زبانی یاد کر لوں میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ساری روایتیں جعلی ہیں، غرض میری یہ ہے کہ ابان کی جگہ کسی معتبر راوی کا نام داخل کر کے غلط فہمی میں لوگوں کو اگر کوئی مبتلا کرنا چاہے گا، تو میں اس غلط فہمی کا ازالہ اصل واقعہ کو ظاہر کر کے کر سکوں گا، یعنی بتا سکوں گا کہ جس جگہ پر ثقہ راوی کا نام رکھا گیا ہے یہ غلط ہے درحقیقت ان روائتوں کا بنانے والا ابان ہے " صنہ معرفۃ علوم الحدیث

یحییٰ بن معین نے اسی غرض سے موضوع حدیثوں کا بھی ایک طومار نقل کیا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ دروغ بافوں سے میں نے بڑا ذخیرہ روائتوں کا لکھا جس سے بعد کو میں نے اپنے تنور کو گرم کیا اور نہایت عمدہ پکی ہوئی روٹیاں اس سے تیار ہوئیں۔ صنہ "

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح واقعات سے واقفیت کے لئے جیسے اس زمانے میں ہر قسم کی نیوز ایجنسیوں اور ہر طرح کے اخباروں کا مطالعہ ناگزیر ہے، محدثین بھی یہی سمجھتے

تھے کہ یہی روائتوں کو جھوٹی روائتوں سے جدا کرنے کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے راویوں سے حدیثوں کو سُننے کی کوشش کی جائے حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے ایوب سختیانی کے حوالہ سے یہ تجربہ کی بات نقل کی ہے، کہا کرتے تھے،

۱۰ اپنے استاد کی غلطیوں سے تم اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسروں کے پاس بھی جاکر نہ بیٹھو۔ ص۹۹ جامع

بہرحال حدیثوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ بھی، اور ایک ایک محدث کے یہاں سیکڑوں اساتذہ کا نام جو کتابوں میں لیا جاتا ہے، اس کی وجہ بھی محدثین کا یہی مذاق تھا یعنی جب تک ستر ستر طریقوں سے حدیث ان تک نہ پہنچی ہو۔ اس وقت تک اس حدیث میں اپنے آپ کو یتیم قرار دیتے ان کے اساتذہ کی کثرت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ شعبہ جو اپنی تسلی کے لئے ہر حدیث کا بیس دفعہ سُننا ضروری قرار دیتے تھے، ان کے کل اسا نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابہ کے صحبت یافتہ بزرگوں یعنی تابعین میں ان کے اُستادوں کی تعداد جیسا کہ ذہبی نے لکھا ہے کہ

سمع من اربع مائة من التابعین — تابعین میں سے جن جن استاذوں سے شعبہ نے حدیث سُنی تھی ان کی تعداد چار سَو ہے — تذکرہ ص۱۸۲ ج۱

مقصود اس طول طویل گفتگو سے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے تن من دھن سب کو دین کے لئے مختص کر دیا تھا، یہی شعبہ نماز میں جن کے سجدوں اور رکوع کی وہ کیفیت تھی ذہبی ہی نے لکھا ہے کہ باوجود اس جفاکشی کے صائم الدہر رہتے تھے یعنی ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ دیکھ کر لوگوں کو رحم آتا۔ جلد بدن کی خشک نظر آتی تھی بھلا سوچیئے تو جن

لوگوں کا حال یہ ہو کہ پوچھنے والوں نے پوچھا اب پیرانہ سالی میں آپ کے مشاغل کی نوعیت کیا رہ گئی ہے تو جواب میں بولے کہ بھائی! صرف ایک رکعت میں سورہ بقرہ پڑھ لیتا ہوں اور مہینے میں اب تین روزوں یعنی ایام بیض کے روزوں سے زیادہ رکھا نہیں جاتا۔

ابو اسحاق السبیعی کے حال میں ذہبی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کے اساتذہ میں (۳۸) تو صرف صحابی ہیں (ص ج ۱) آخر اسی عہد کے محدثین میں جب ایسے لوگ بھی تھے مثلاً ثابت البنانی کے متعلق لکھا ہے کہ

دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے اندر معمول تھا کہ قرآن ختم کر لیتے تھے اور ہمیشہ صائم الدہر رہتے (ص ج ۱)

سلیمان تیمی بھی صائم الدہر تھے عموماً صبح کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھتے رہے نفل کی نمازوں میں ان کا حال بھی یہی تھا کہ ستر دفعہ سے کم سجدے میں تسبیح نہ پڑھتے (ص ۱۴۲ ج تذکرہ)

اس عہد کے بزرگوں کے عبادات و ریاضات کی تفصیل کے لیے حلیۃ الاولیاء اور صفوۃ الصفوۃ وغیرہ پڑھنی چاہئے نسبتاً ان میں جن لوگوں کو عافیت پسند اور آسائش و آرام زراعت و رفاہیت کی زندگی بسر کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ بڑے خوش خوراک خوش پوشاک تھے جب ان کا حال یہ تھا، مثلاً امام نسائی کے متعلق ذہبی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ بڑے وجیہ و شکیل آدمی تھے، برد و نوبیہ (ایک قسم کی قیمتی چادر تھی) اور سبز دوشالے کو پسند کرتے تھے لکھا ہے کہ

کھانے میں نسائی زیادہ تر بڑے قد والے مرغ کو پسند کرتے تھے جو خاص کر ان کے لئے خریدے جاتے تھے، اور ان کو خصی کر کے خوب فربہ کر لیا جاتا تھا (ص ۲۴۱)

لیکن باوجود ان تمام باتوں کے محمد بن مظفر بیان کرتے تھے کہ

میں نے مصر (جہاں امام نسائیؒ نے قیام اختیار کر لیا تھا) وہاں کے سارے علماء اور مشائخ کو پایا کہ وہ امام نسائیؒ کی عبادت و ریاضت کی، جس کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا، تعریف کرتے تھے" ص ۲۴۲

ان کے دینی تصلب کے لئے یہی کیا کم ہے کہ محض حق گوئی کی وجہ سے گویا ان کو شہید ہونا پڑا۔ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن بصریؒ بھی لطیف غذاؤں کا خاص ذوق رکھتے تھے ابن سعد نے حمید کا قول نقل کیا ہے کہتے تھے کہ

ما شممت مرقۃ قط اطیب من مرقۃ الحسن ابن سعد ج ۷ ص ۱۲۱	حسن بصریؒ کے شوربے سے زیادہ خوشگوار خوشبو میں نے کسی دوسرے آدمی کے شوربے میں نہیں سونگھی

یہ بھی اسی میں ہے کہ گوشت کا روزانہ آپ کے دسترخوان پر رہنا ضروری تھا لیکن زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت مجاہدہ میں جو ان کا حال تھا ان سے کون ناواقف

۱؎ یعنی لکھا ہے کہ مصر سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے امام دمشق میں ٹھہرے، عام طور پر خوارج کا اس زمانہ میں شام کے علاقوں میں زور تھا، جامع مسجد میں کسی نے پوچھ لیا کہ آپ بڑے محدث ہیں۔ امیر معاویہ کی تعریف میں بھی تو کچھ حدیثیں بیان کیجئے۔ باوجودیکہ شام والوں کے عقائد سے امام نسائیؒ واقف تھے اس باب میں ان کا جو علم تھا اس کو چھپانا راستبازی اور تدین کے خلاف معلوم ہوا۔ بھری مجلس میں کہہ دیا کہ امیر معاویہؓ کے فضائل کیا پوچھتے ہو معاملہ ان کا برابر سرابر بھی ہو جائے تو کیا تمہارے خوش ہونے کے لئے یہی کافی نہیں ہے۔ نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہ ہوا کہ خوارج جن سے مسجد بھری پڑی تھی ان پر ٹوٹ پڑے اور بے تحاشا مارنا شروع کیا، لکھا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ مغر مثانہ اور اندرونی حصوں کو لاتوں سے لوگوں نے اتنا کچلا کہ اس کی تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے دمشق سے کسی طرح مکہ تو ان کو پہونچا یا گیا لیکن مکہ پہنچ کر وفات ہو گئی۔ ج ۲ ص ۲۴۳ ذہبی ۱۲

ہے ابن جوزی نے بیس جزوں میں ان کے حالات لکھے ہیں اسی سے اندازہ کیجئے، یوسف بن اسباط جیسے آدمی کا بیان ہے کہ

تیس سال سے یہ شخص ہنسا نہیں ہے اور چالیس سال اس حال میں گذارا کہ اس عرصہ میں کسی سے مذاق نہ کر سکے" صفوہ ج ۳ ص۱۵۶

روتے رہتے تھے، لوگ پوچھتے تو کہتے کہ معاملہ ایسے سے آپڑا ہے جسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے کون جانے کہ کل میں آگ میں نہ جھونکا جاؤں گا

ص۱۵۶ صفوہ ج ۳

حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے خوف کو دیکھ کر یزید بن حوشب کہا کرتے تھے کہ

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے لئے حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے"

یا امام مالک ہی ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے میں ان کا نقطۂ نظر عام طور پر مشہور ہے کہ ہمیشہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے عطر اور خوشبو میں ڈوبے رہتے ان کے دربار کے رعب اور وقار کو دیکھ کر لوگ کہا کرتے تھے کا نہ باب امیر (کسی بڑے امیر کی ڈیوڑھی ہے) آپ کا یہی معمول تھا کہ گوشت کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ اور اس ذوق پر اتنا اصرار تھا کہ کسی دن اگر گوشت کے لئے پیسے نہ ہوتے اور اس کے لئے گھر کی کوئی چیز بیچنی پڑتی تو لکھا ہے کہ بفعل (وہ چیز بیچ کر گوشت خریدتے)

ص۱۹ الدیباج المذہب

ہر جمعہ کو دستور تھا۔

کان یامر خبازہ سلمۃ ان	سلمہ نامی باورچی جو آپ کا تھا اس کو حکم دے
یعمل لہ ولعیالہ طعاماً کثیراً	رکھا تھا کہ امام اور امام کے گھر والوں کے لیے
	بہت زیادہ کھانا تیار کرے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان کے علم و عمل، تقویٰ و دیانت کے جو گہرے نقوش امت کے قلوب پر قایم ہیں۔ کیا وہ قیامت تک مٹ سکتے ہیں۔ اللہ اللہ بارگاہِ رسالتؐ پناہی کے ساتھ جس کی نیازمندیوں اور ادب شناسیوں کا یہ حال ہو، عبداللہ بن مبارک کی یہ چشم دید شہادت ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"امام مالک ہم لوگوں کو حدیث پڑھا رہے تھے، بچھو (جو ان کے کپڑوں میں کسی طرح گھس گیا تھا) نے سولہ دفعہ ڈنک مارے۔ امام مالک کا چہرہ ہر نیش پر متغیر ہو کر زرد پڑ جاتا تھا لیکن حدیث جس طرح بیان کر رہے تھے، بیان کرتے رہے، درمیان میں اس کے سلسلہ کو نہ توڑا جب درس ختم ہو گیا اور لوگ ادھر اُدھر ہو گئے تب میں نے عرض کیا کہ آج آپ کا یہ کیا حال ہو رہا تھا تب وجہ بیان کی اور فرمایا کہ انما صبرت اجلالاً لحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام کی وجہ سے میں صبر کیے بیٹھا رہا) ص۲۲ دیباج

دوسری کتابوں میں ہے کہ درس سے فارغ ہونے کے بعد اندر تشریف لے گئے، کپڑے اتارے تب بچھو نکالا گیا۔ باہر آ کر ابن مبارک سے چہرے کے تغیر کی وجہ بیان کی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ اس طبقہ کے متعلق کیا جاتا ہے جو حدیثوں کے حفاظت و اشاعت کا صحابہ کے بعد ذمہ دار بن گیا تھا، کیا یہ صرف

گذر جانے کی بات ہے پیغمبرؐ اور پیغمبرؐ کی حدیثوں کا جس کے دل میں اتنا احترام ہو کہ بچھو ڈنک پر ڈنک مارتا چلا رہا ہے۔ لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سُنا رہا تھا ہلنا تو الگ سُنانے والا صرف اس خیال سے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔

حفاظِ حدیث کے اس گروہ میں جنھیں وسعت عطا کی گئی تھی، خود امام بخاریؒ بھی ہیں بخارا میں ان کی کافی جائداد تھی اور متعدد پن چکیاں ان کی چلتی تھیں۔ وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے جس میں ایک ایک دفعہ دس دس ہزار کا نفع ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ صرف رمضان میں ان کے مجاہدے کا یہ حال تھا کہ علاوہ تراویح کے پچھلی رات کو نصف یا ایک تہائی قرآن تہجد میں ختم کرتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے دن قرآن ختم ہو جاتا تھا۔ اور یہ اس تلاوت کے سوا تھا جو دن کو روزہ کی حالت میں کرتے تھے۔ دستور تھا کہ دن کو قرآن شروع کرتے اور افطار کے وقت تک ختم ہو جاتا تھا۔ امام بخاری کے ساتھ بھی کہتے ہیں امام مالک ہی کے قریب قریب حادثہ پیش آیا امام مالک تو حدیث پڑھا رہے تھے اس وقت بچھو نے کاٹا تھا۔ امام بخاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے باغ میں حضرت کی دعوت کی تھی۔ اتنے میں ظہر کا وقت آگیا فرض سے فارغ ہو کر نفل میں مشغول ہوئے کہ عین نماز میں بھڑ نے کاٹنا شروع کیا لیکن نماز نہ توڑی جب سلام پھیرا تو لوگوں سے کہا کہ دیکھو میرے کرتے میں کوئی چیز تو نہیں ہے دیکھا گیا تو بھڑ برآمد ہوئی کئی جگہ اس کے کاٹنے کی وجہ سے ورم ہو گیا تھا پوچھا گیا کہ نماز آپ نے توڑی کیوں نہیں فرمایا کہ

کنت فی سورۃ فاحببت ان اتمھا — تاریخ بغداد ج ۱۲ — میں ایک سورۃ کی تلاوت میں مشغول تھا جی چاہا کہ اس کو ختم کر لوں۔

اور میں ان قصوں کو کہاں تک بیان کروں۔ ان کی کوئی حد و انتہا بھی ہو، میرا

تو خیال ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا گیا ہے کہ وہ کچھ غیر معمولی طور پر خوش خوراک و خوش پوشاک تھے ان کی غرض بھی یہی تھی کہ اس ذریعہ سے کام زیادہ قوت اور زیادہ بشاشت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے خیال تو کیجئے کہ راتیں جن لوگوں کی اس طرح گذرتی تھیں جیسا کہ امام بخاری ہی کے متعلق ان کے وراق (مسودہ نویس) محمد بن ابی حاتم کا بیان ہے کہ

"سفر میں امام بخاری کے ساتھ میرا قیام اسی کمرے میں عموماً ہوتا تھا جس میں امام آرام فرماتے تھے میں دیکھا کرتا تھا کہ رات کو جب ہم لوگ سو رہتے تو امام بخاری بار بار اٹھ اٹھ کر چقماق سے چراغ جلاتے اور لکھی ہوئی حدیثوں پر کچھ علامت بناتے پھر سو رہتے۔ ایک ایک رات میں پندرہ سے بیس دفعہ تک میں نے دیکھا ہے کہ اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، میں عرض کرتا کہ جس وقت آپ اٹھتے ہیں، مجھے بھی اٹھا لیا کیجئے تو فرماتے کہ میاں تم جوان آدمی ہو، تمہاری نیند کو میں خراب کرنا نہیں چاہتا۔" ص۱۴

اس قسم کی محنت اور جفاکشی کے لئے خود ہی سوچنا چاہئے کہ کتنی غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے ایک دلچسپ لیکن غیر معمولی نتائج کا حامل اسی سلسلے کے بزرگوں میں وکیع بن الجراح کا وہ وقت نامہ ہے جسے خطیب نے وکیع کے صاحبزادے سفیان بن وکیع کے حوالہ سے نقل کیا ہے، یہ وکیع صرف حدیث ہی کے نہیں بلکہ فقہ کے بھی ہیں، حنفیوں کو اس پر فخر ہے کہ وکیع زیادہ تر امام ابوحنیفہؒ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا کرتے تھے سفیان ثوری کے تلمیذ خاص سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن مبارک احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی وغیرہم اکابر کے وکیع استاد ہیں، امیر گھرانے

وتر شرب منها حتى ينفدها — دو دو رکعتوں، یا ان سے زیادہ رکعتوں کے بعد

ثم ينام تاریخ بغداد ص۴۹۹ ج۱۳ — خواہ طاق ہوتیں یا جفت (سلام پھیر کر) اسی

قرابہ سے پیتے رہتے تاآنکہ ختم ہو جاتا پھر سو رہتے

ظاہر ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے جو ضعف پیدا ہو جاتا تھا، اسی کی تلافی
ت کو نبیذ سے فرماتے تھے، کیونکہ نبیذ کو نشہ آور عرق قرار دینا، تو تجربہ سے پہلے خواہ
زاہ بدگمانی میں مبتلا ہو کر ایک دعویٰ کر بیٹھنا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ کھجور اور
لور سے جو عرق نبیذ کی شکل میں حاصل کیا جاتا تھا اس سے کافی قوت پیدا ہوتی تھی
سی لئے تو وکیع نبیذ کے قرابے کو سامنے رکھ کر رات کی نماز پڑھا کرتے تھے جہاں
چھ سستی محسوس ہوتی ایک پیالہ چڑھا لیتے تھے جب وہ ختم ہو جاتا تو سو رہتے تھے

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ وکیع ہی کے متعلق الذہبی نے جس واقعہ کا ذکر بطور
یک ظریفانہ لطیفہ کے کیا ہے مجھے تو ظرافت سے زیادہ اس میں حقیقت کی جھلک
ظر آتی ہے لکھا یہ ہے کہ وکیع ذرا لحیم شحیم بھاری بدن کے آدمی تھے، جب مکہ پہونچے
اور سرخیل صوفیہ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی تو ان کی فربہی کو دیکھ کر فضیل نے
کہا کہ میں نے تو سنا ہے کہ تم راہب العراق ہو، پھر یہ فربہی کیسی؟ جواب میں وکیع نے فرمایا

ھذا من فرحی بالاسلام — اسلام کی وجہ سے نشاط کی جس کیفیت میں

تذکرہ ص۲۸۳ ج۱ — رہتا ہوں یہ اس کا نتیجہ ہے،

واللہ اعلم کہ ان کا واقعی مطلب کیا تھا لیکن میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آدمی
اپنے جسم کی بھی اگر نگرانی سے غفلت اختیار نہ کرے اور محنت و مشقت کا جو بار اس پر
ڈالا جائے اس کی تلافی عمدہ اور لطیف غذاؤں سے کرتا رہے تو جن ذہنی بے چینیوں

اور دماغی الجھنوں سے اسلام آدمی کو نجات عطا کر کے روحانی سکون بخشتا ہے ان
باتوں کا مجموعی اثر وہی ہونا چاہیئے جس کا دکیع کے وجود میں مشاہدہ کیا گیا تھا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں نے جیسا کہ عرض کیا، وکیع کے وقت نا
سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے
کی ساری زندگی مقررہ اوقات کے ساتھ بندھی ہوئی تھی، یہ ان کے ضبط اوقات
نتیجہ تھا کہ ان علمی مشاغل اور مجاہدات کے ساتھ جو بجائے خود حیرت انگیز ہیں وہ علم
اور کیا کام؟ انجام دے سکتے تھے بعض لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں
متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنی نمازیں پڑھتے تھے اور اتنی مختصر مدت میں قرآن ختم کرتے
آخر ان ہی کو ہزار ہا ہزار حدیثوں کے یاد کرنے کا موقع کیسے مل جاتا تھا۔ لیکن سمجھا
گیا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اپنے اوقات عزیز کو لایعنی مشاغل میں جو صرف کرنے کے
عادی ہیں وہ ان لوگوں کے اوقات کی برکتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جو اپنی ایک
ایک سانس کی قیمت حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں آخر عام لوگوں کا کیا حال۔
تھوڑا وقت معاشی کاروبار میں وہ ضرور لگاتے ہیں، لیکن اس کے بعد کھیل تماشا
سینما بینی، تاش بازی، اور اسی قسم کی مختلف بازیوں میں جتنا وقت بے کار وہ خر
کر دیتے ہیں، اگر اسی میں وہ کام کرنے کا تجربہ کریں تو خود ان پر ظاہر ہو جائیگا کہ جو
ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آ
ماسوا اس کے محدثین کی زندگی کے دو مستقل دور تھے۔ ایک زمانہ ان کا طلب حدیث
کا ہوتا تھا، گذر چکا کہ اس زمانہ میں عہد صحابہ اور اس کے بعد بھی سمجھا جاتا تھا کہ نفلی عبا
پر علمی اشتغال کو ترجیح دینا چاہیئے اس سلسلے میں متعدد شہادتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں

آدمی تھے۔ صرف والدہ سے لکھا ہے کہ دس لاکھ درم وراثت میں ان کو ملے تھے
حال جو بیس گھنٹہ کا نظام اوقات آخر زمانے میں ان کا کیا تھا وہ سُنیے ان کے
احبزادے کہتے تھے۔

"میرے والد صائم الدہر تھے، قاعدہ ان کا یہ تھا کہ صبح سویرے (نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد) درسِ حدیث کے حلقہ میں تشریف لاتے حدیث کے طلباء کو پڑھاتے رہتے تا اینکہ دن کافی چڑھ جاتا حلقہ سے اُٹھ کر گھر تشریف لاتے، اور سو جاتے ظہر کے وقت تک سوکے اس کے بعد ظہر کی نماز کے لئے اُٹھتے، نماز سے فارغ ہو کر اس سڑک کی طرف چلے جاتے جدھر سے پانی بھرنے والے بہشتی پکھالیں بھر بھر کر شہر کی طرف لاتے تھے اور ہر ایک سے دریافت کرتے کہ قرآن اس کو کتنا یاد ہے جسے یاد نہ ہوتا اُسے قرآن کی اتنی سورتیں یاد کراتے جو نماز پڑھنے کے لئے کافی ہو یہ کام عصر کے وقت تک کرتے عصر کی نماز اپنی مسجد میں ادا فرماتے، اور نماز کے بعد وہیں بیٹھ کر قرآن کا درس دیتے کچھ وقت بچتا اسے اللہ کی یاد میں گذارتے مغرب کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لاتے، تب افطار کا کھانا آپ کے آگے رکھا جاتا، قریب دس رطل (گویا پانچ سیر) سے کم مقدار مجموعی طور پر کھانے کی نہ ہوتی کھانے کے بعد آپ کے سامنے نبیذ کا قرابہ پیش ہوتا، دس رطل کے قریب نبیذ[1] جس میں ہوتی کھانے کے بعد اس قرابے سے جتنا ان کا جی چاہتا پیتے رہتے، اور جو بچ جاتا اس کو سامنے رکھ لیتے"

---

[1] نبیذ کیا چیز ہے، جو نہیں جانتے ہیں یا نہیں جاننا چاہتے ہیں انھوں نے طرح طرح کی باتیں اس کے متعلق

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

اس کے بعد کیا کرتے تھے، اسی کو میں پیش کرنا چاہتا تھا، سفیان بن وکیع کہتے ہیں کہ

ولقوم فیصلی ورده من اللیل وکلما	پھر کھڑے ہو جاتے اور رات میں نمازوں کا
صلی رکعتین او اکثر من شفع او	جو ورد ان کا تھا اسے پورا کرتے، اور ورد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مشہور کر رکھی ہیں حالانکہ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ اطباء جس دوا کو خیساندہ کہتے ہیں یا رات کو پانی میں عناب، گاؤزبان، سپستان وغیرہا اسی قسم کی نباتی دوائیں ڈال دی جاتی ہیں اور صبح کو بقول ان اطباء "تالیدہ صاف نمودہ بنوشند" نبیذ بھی بالکل یہی چیز تھی فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے نباتاتی دواؤں عناب سپستان وغیرہ کے کھجور یا کشمش، منقی کو پانی میں رات کو ڈال دیتے تھے جیسے "مالیدہ صاف نمودہ" صبح پیتے تھے۔ اور صبح کو ڈالی ہوئی نبیذ رات کو استعمال کرتے تھے میں پوچھتا ہوں کہ دوائی خیساندہ کا استعمال کر کسے نہ ملا ہوگا۔ پھر کیا اس میں نشہ یا سکر پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ نباتاتی اشیاء ہونے کی وجہ سے اس میں بھی الکحل پیدا ہو سکتا ہے جیسے کھجور، کشمش، منقے کے خیساندہ کو دھوپ میں اگر رکھ دیجیے تو یقیناً اس عمل کے بعد ان میں جوش پیدا ہونے کف پھینک دینے کے بعد نشہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن نبیذ اس کے بعد تو شراب بن جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نبیذ کے نام سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے بعض لوگوں نے شراب کو بنام نبیذ استعمال کیا ہو۔ لیکن ائمہ کوفہ نے نبیذ کی حلت کا جو فتویٰ دیا ہے میرے خیال میں اس کی حرمت پر اصرار کرنا ہی ہے کہ کسی حلال چیز کو خواہ مخواہ حرام ثابت کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ دوائی خیساندے کو بعض دفعہ آگ پر جوش دے کر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں بھی نشہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح کھجور یا کشمش کے خیساندہ کو آگ پر اگر جوش دے دیا جائے تو گاڑھا ضرور ہو جائے گا۔ لیکن نشہ اس میں پیدا ہوگا قطعاً یہ تجربہ کے خلاف ہے اگر اس میں نشہ کا پیدا ہونا ضرور ہے تو چاہئے کہ سارے دوائی خیساندے میں نشہ پیدا ہو جائے۔ الغرض کو لوگوں نے اس معاملہ میں بہت بدنام کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا وکیع امام ہی کے مسلک کی اتباع نقہ میں کرتے تھے اس لئے وہ خود بھی پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پینے کا حکم دیتے تھے ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ حضور میں نے نبیذ پی تو رات کو خواب میں دیکھا کہنے والا کہتا ہے کہ تو نے شراب پی وکیع نے ... کر فرمایا کہ شیطان ہوگا جس نے تجھ سے کہا کہتے تھے کہ فرات کے پانی اور نبیذ میں میرے نزدیک ... نہیں ہے ۱۲ خطیب ص۴۷۷ ج ۱۳

صاحبزادے ابراہیم کا بیان ہے۔

میرے والد تہجد کی نماز کے لئے جس وقت اٹھتے تھے تو ان کے ساتھ سارا گھر اس نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا، حتیٰ کہ گھر میں حبشن چھوکری ایک تہجد پڑھتی تھی" خطیب ج ۱۲ ص ۱۱۰

بہر حال ان چیزوں کو کہاں تک لکھوں غرض یہ تھی کہ صحاح ستہ کے مصنفین سے پہلے اور عہد صحابہ کے بعد حدیث کی حفاظت و اشاعت کا کام سوڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ میں جن لوگوں کے سپرد رہا خود ان کا اور جس ماحول میں وہ تھے صحیح واقعات کی روشنی میں اس ماحول کا ایک سرسری اجمالی خاکہ بقدر ضرورت لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اس وقت تک پیش کیا جاچکا ہے انشاء اللہ اس مقصد کے لئے وہ کافی ہے، اب اسی کے ساتھ اور بھی چند چیزوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اگرچہ ضمناً ان کی طرف بھی اشارہ کرتا چلا آیا ہوں گا

(۱) یاد رکھنا چاہئے کہ واقعات کا یاد رکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ اقوال و ملفوظات کا، واقعات کی حالت تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی آدمی ہوگا جس کے حافظہ میں ہزارہا واقعات کی یاد تازہ نہ ہو، کم از کم وہی واقعات جو اس شخص کے ساتھ گذرے ہوں، ہوش سنبھالنے کے بعد صبح و شام لوگوں کے سامنے واقعات گذرتے رہتے ہیں، اور وہ یاد رہتے ہیں، ان کے یاد کرنے کے لئے حافظہ پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس فطری عام قاعدے کے ساتھ اس کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے جیسا کہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ حدیث صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات طیبہ ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ آپ کو کرتے ہوئے جو کچھ دیکھا

گیا، یا آپ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا، اور آپ نے اس سے منع نہیں کیا، اصطلاحًا جس کا نام محدثین نے تقریر رکھا ہے حدیث کا لفظ ان واقعات کو بھی حاوی ہے، اسی لئے جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنی حدیثیں یاد تھیں تو اس کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ملفوظات اتنی تعداد میں ان کو یاد تھے بلکہ ملفوظات کے ساتھ بڑا حصہ ان حدیثوں میں افعال و تقریرات کا بھی ہوتا ہے۔

(۲)، خود صحابہ میں بھی بجز معدودے چند حضرات کے جنہیں مکثرین کہتے ہیں زیادہ تر اسی قسم کے حضرات ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد کا سو سے متجاوز ہونا بھی مشکل ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ سو یا سو سے کچھ اوپر حدیثوں کے روایت کرنے والے حضرات صحابہ میں بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہیں، ورنہ ان کی عمومیت "اصحاب العشرات" (یعنی سو سے کم، نوے، اسی، ستر، ساٹھ، پچاس دس تک) میں شمار ہوتے ہیں، تاہم صحابۂ کرام کے عہد تک حدیثوں میں سند کا سوال چونکہ پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ بات فقط متن تک محدود تھی نیز جن چیزوں کو وہ بیان کرتے تھے ان کے وہ خود ذاتی تجربہ کار اور دیکھنے والے تھے اس لئے چند صحابی مثلاً ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، ابن عمر وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیثوں کی تعداد کافی ہے۔ لیکن صحابہ کے بعد چونکہ سند کا یاد رکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا اور جیسے جیسے دن گذرتے جاتے تھے کڑی پر کڑی کا اضافہ سند میں ہوتا چلا جا رہا تھا، حافظہ پر اس کی وجہ سے زیادہ ذمہ داری عاید ہوئی غالبًا یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے بعد والوں میں زمانہ تک ہمیں اسی قسم کے حضرات ملتے ہیں جن کی حدیثوں کی تعداد محدود تھی، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن شہاب زہری جیسے آدمی کی روایتوں کی مجموعی تعداد کو بتاتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ

اسی کا نتیجہ تھا کہ جن سے نفلی عبادات کا ترک بالکلیہ ممکن نہ ہو سکتا تھا وہ اپنے اوقات حضوصاً اپنی راتوں کو چند حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے، عمرو بن دینار جو سفیان وشعبہ وغیرہ کے استاذ اور ابن عباس وابن عمر کے شاگرد ہیں ان کے حال میں لکھا ہے کہ

رات کو انھوں نے چند حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک ثلث تو نیند کے لیے تھا، دوسرے ثلث میں وہ حدیثیں یاد کرتے تھے اور تیسرے ثلث میں نمازیں پڑھتے تھے صکا جامع

اور طلب حدیث کا دور جب گذر جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ حدیث کے ان حافظوں کو اب حدیث کے یاد کرنے کے لیے وقت دینے کی ضرورت نہیں رہتی تھی رات ان کی فارغ ہو جاتی تھی، البتہ دن کو شاگردوں کے سامنے اپنی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے تھے اور اسی سے انکی یاد تازہ رہتی تھی، بڑے بڑے حفاظ کا تو یہ حال تھا کہ ان کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر قوی تھا، اسی لئے اس قسم کے حضرات درس حدیث کے وقت اپنے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں رکھتے کتابوں میں پڑھیئے اس قسم کے فقرے مثلاً

لم یُرَ فی ید سفیان بن عیینۃ والثوری وشعبۃ ووکیع کتاب قط	سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری وشعبہ ووکیع کے ہاتھوں میں کتاب کبھی نہیں دیکھی گئی
ما رُئی لوکیع کتاب قط ولا لھشیم ولا لحماد ولا لمعمر خطیب صفحہ ج ۱۳	نہ وکیع ہی کے ہاتھ میں کتاب دیکھی گئی اور نہ ہشیم کے ہاتھ میں نہ حماد کے ہاتھ میں اور نہ معمر کے ہاتھ میں

یہ تو غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں کی عام عادت تھی، باقی جن لوگوں

کی قوت یادداشت ایسی نہ تھی پڑھانے کے وقت اپنے ہاتھوں میں وہ کتاب بار رکھتے تھے، اور جن بے چاروں کو درس کا موقعہ میسر نہ آتا تو گذر چکا کہ مکتب خانوں کے بچوں کے سامنے یا عام غرباء کے مجمع میں جاکر اپنی حدیثوں کو دہراتے تھے، بہرحال وکیع کے نظام الاوقات کا سب سے زیادہ عبرت انگیز جزء وہ ہے کہ سقوں کی گذرگاہ میں بیٹھکر اُن کو قرآنی سورتیں یاد کراتے تھے۔ آج کسی مولوی کو کسی قصبہ یا شہر میں معمولی سا امتیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے تو وہ بے چارہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستباز خادموں کو آپ دیکھ رہے ہیں یہ وکیع ہیں وہی وکیع امام فن رجال یحیٰی بن معین جن کے متعلق کہتے تھے کہ میری آنکھوں نے ان سے بڑا آدمی نہیں دیکھا۔ یہی دعویٰ امام احمد بن حنبل کا بھی تھا کہ علم میں وکیع جیسا آدمی میری نظر سے نہیں گذرا۔ امام احمدؒ کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے۔

ما رأت عيني مثل وكيع قط يحفظ	وکیع جیسے آدمی کو میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا
الحديث جيدا ويذاكر بالفقه	حدیثیں بھی ان کو خوب یاد تھیں اور فقہی مسائل پر
فيحسن مع ورع واجتهاد	خوبی کے ساتھ بحث کرتے تھے (ان علمی فضائل
ولا يتكلم في احد خطيب	کے ساتھ) ان میں پارسائی، اور عبادت میں
	جد وجہد کی خصوصیت بھی پائی جاتی تھی، وہ
	کسی پر اعتراض اور نکتہ چینی بھی نہیں کرتے تھے

لیکن جو اپنے وقت کا سب سے بڑا امام فقہ میں بھی تھا اور حدیث میں بھی وہ بہشتیوں کو قرآن کی ابتدائی سورتوں کے سکھانے کو بھی اپنی زندگی کا ایک فرض قرار دئے ہوئے تھا، ایسے ہی آدمی کے گھر میں یہ ہو سکتا تھا جیسا کہ ان کے

قال ابو داؤد حدیثہ الفان وماثتان النصف منہا مسند ص۱۰۱ تذکرہ

ابو داؤد کا بیان ہے کہ زہری کی روایتوں کی تعداد (۲۲۰۰) ہے جس میں سند (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل سند کے ساتھ جو روایتیں منسوب ہیں) ان کی تعداد کل نصف ہے۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان کی مسند حدیثوں کی تعداد ایک ہزار ایک سو سے زیادہ نہ تھی اور یہ حال جب زہری کی روایتوں کا ہے تو دوسروں کی روایتوں کو اسی پر قیاس کیجئے، زہری سے پہلے قاسم بن محمد جلیل القدر تابعی ہیں۔ لیکن ذہبی ہی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ

قال ابن عیینۃ کان القاسم اعلم اھل زمانہ وقال علی بن المدینی لہ مائتا حدیث

ابن عیینہ کہتے تھے کہ قاسم اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے اور ابن مدینی کا بیان ہے کہ قاسم کی روایتوں کی تعداد کل دو سو ہے

ص۹۱/ج۱ تذکرہ

اسی طرح بصرہ کے امام حدیث ثابت البنانی کی حدیثوں کی تعداد ذہبی نے لکھا ہے کہ دو سو پچاس تھی، ص۱۱۶/ج۱ سلیمان تیمی کی روایتوں کی تعداد کل دو سو بتائی گئی ہے ص۱۴۲/ج۱ ذہبی عمرو بن مرہ بھی کل دو سو ہی حدیثوں کے راوی تھے ص۱۱۸ یحییٰ بن سعید الانصاری کے پاس بھی صرف تین سو حدیثوں کا ذخیرہ تھا ص۱۲۸/ج۱ ذہبی۔ ایوب سختیانی کل آٹھ سو روایتوں کے راوی تھے ص۱۲۲/ج۱

میں نے تذکرہ الحفاظ سے یہ چند مثالیں چن لی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعد شروع میں لوگوں کے پاس حدیثوں کی محدود تعداد تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتے گئے کی

طرف بڑھتا گیا اس منتشر اور بکھرے ہوئے سرمایہ کو لوگوں نے سمیٹنا اور جمع کرنا شروع کیا۔ بعض لوگوں نے خاص قسم کی حدیثوں کو جمع کیا۔ مثلاً احکام یعنی فقہی مسائل جن حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق امام شافعی کا بیان ہے کہ

وجدت احادیث الاحکام کلها	(احکام جن سے اسلامی قوانین پیدا ہوتے ہیں
عند مالك سوى ثلاثين حديثاً	ان کی متعلقہ حدیثوں کا سارا ذخیرہ میں نے امام
ووجدتها كلها عند ابن عيينة	مالک کے پاس پایا بجز تیس حدیثوں کے بغیر
سوى ستة احاديث تذكرة الحفاظ	ایسا ذخیرہ جس میں یہ تیس حدیثیں بھی شریک تھیں
ص ۲۴۲ ج ۱	میں نے ابن عیینہ کے پاس پایا بجز چھ حدیثوں
	کے کہ وہ ابن عیینہ کے پاس بھی نہ تھیں)

اسی طرح بعض حضرات نے کسی خاص علاقے کے راویوں کی حدیثیں جمع کیں ذہبی نے علی بن مدینی کے حوالہ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

دار علم الثقات على الزهرى	معتبر راویوں کا علم ان چند بزرگوں پر گردش کرتا
وعمرو بن دينار بالحجاز	ہے یعنی حجاز کا علم زہری عمرو بن دینار پر اور
وقتادة ويحيى بن ابى كثير	بصرہ کا علم قتادہ و یحییٰ بن کثیر پر، کوفہ کا ابو اسحق
بالبصرة وابى اسحاق والاعمش	و اعمش پر گردش کرتا ہے، جس کا مطلب یہ
بالكوفة يعنى ان غالب الاحاديث	ہے کہ صحیح حدیثیں عموماً ان بزرگوں کے دائرہ
الصحاح لا تخرج عن هولاء	علم سے باہر نہیں ہیں،
السنة ص ۱۰ ج ۱	

اسی طرح ابو داؤد طیالسی کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کہ

وجدنا الحدیث عند اربعة	میں نے حدیث کا ذخیرہ چار آدمیوں کے پاس
الزهری وقتادة وابی اسحٰق	پایا یعنی زہری، قتادہ اور ابو اسحاق و
والاعمش	اعمش

ذہبی نے طیالسی کا یہ تخمینہ نقل کیا ہے کہ

ولم یکن عند واحد من هؤلاء	اور ان میں سے ہر ایک کے پاس دو دو ہزار سے
الا الفین الفین مثلاً	زیادہ حدیثوں کا سرمایہ نہ تھا۔

مگر جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا گیا، لوگوں میں ایک ہی حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا شوق بڑھتا چلا گیا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ میں واقعات کی تہ تک پہونچنے کے لئے کسی ایک اخبار میں کسی نیوز ایجنسی کی دی ہوئی خبر کا پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا کچھ اسی قسم کا حال حدیث کے باب میں ان بزرگوں کا ہو گیا تھا، اس میں لوگوں کی اولوالعزمیاں ترقی کر کے اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ بعض لوگ سو سو طریقوں سے جب تک کسی روایت کو سن نہیں لیتے، اپنے آپ کو اس روایت میں یتیم خیال کرتے تھے اور قاعدہ یہ بن گیا تھا کہ مختلف طریقوں سے جو حدیثیں سنی جاتی تھیں محض سند میں کسی ایک راوی کے بڑھ جانے یا متن میں کسی لفظ کے اضافے کے ساتھ ہی بجائے ایک حدیث کے وہی ایک حدیث دو حدیثیں بن جاتی تھیں میں کہہ چکا ہوں کہ اس طریقہ سے حدیثوں کی تعداد بڑھتے ہوئے لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ نیز حدیث کے لفظ کے نیچے صحابہ اور تابعین کے اقوال و فتاوی کو بھی آخر میں لوگ درج کرنے لگے۔ حدیثوں کے عددی اضافہ میں کچھ اس کو بھی دخل ہے ورنہ عرض کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہونچتی اور صحیح حدیثوں کے ساتھ ضعیف وحسن وغیرہ کو ملا لیا

جائے تو بہ مشکل تیس بتیس ہزار وہ ثابت ہوتی ہیں، بلکہ ابن جوزی کا قول نقل کر چکا ہوں کہ جعلی اور موضوع حدیثوں کو ملا لینے کے بعد حدیثوں کے سارے سرمایہ کو پچاس ہزار تک پہنچانا مشکل ہے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ جن لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ لاکھ یا لاکھ سے اوپر ان کو حدیثیں یاد تھیں۔ مثلاً امام بخاری۔ امام مسلم، یا ابوزرعہ احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین وغیرہ سو ظاہر ہے کہ ان میں یا تو خود صحاح ستہ کی کتابوں کے مصنف ہیں، یا ان کے معاصرین ہیں، جیسے ابوزرعہ امام بخاری کے معاصر ہیں یا صحاح کے مصنفین کے بعد کے لوگ ہیں، جیسے احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین وغیرہ اور اس وقت میری گفتگو کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مصنفین صحاح ستہ سے پہلے اور صحابہ کے بعد درمیانی عہد میں حدیث کی خدمت کرنے والے تھے، کم از کم اس عہد میں میں نہیں جانتا کہ کسی کے متعلق لاکھ دو لاکھ کی حدیثوں کا دعویٰ کیا گیا ہو۔

(۲)، حدیثوں کے ان حفاظ کے متعلق عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں ہر ایک کی حالت یہی تھی کہ سن لینے کے بعد اس کو حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ یہ تفصیل بتا چکا ہوں کہ یہ واقعہ کی قطعاً غلط تصویر ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بعضوں کا حافظہ یقیناً غیر معمولی تھا، اور حافظہ ہی کیا، سارے انسانی کمالات کے متعلق آپ کو غیر معمولی مثالیں ہر زمانہ میں تلاش سے مل سکتی ہیں۔ ان کی بلندی کی بھی، اور پستی کی بھی، یہی حال حافظہ کی قوت کا بھی ہے رومیوں کی تاریخ میں مشہور رواقی حکیم سینیکا کے باپ مارکس رینالس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"دو ہزار الفاظ سننے کے بعد بالترتیب ان کا اعادہ بلا تکان کر دیا کرتا تھا"
صفٹ سکرس آف مارڈ (ترجمہ)

یہ قوت یادداشت کا ایک نقطہ تھا، اسی کے مقابلہ میں رومیوں کی اسی تاریخ میں ہم رومی بادشاہ کلاڈیوس کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ

"اس کے حافظہ کی حالت یہ تھی کہ ان اشخاص کو شطرنج کھیلنے کے لئے مدعو کرتا جو اس روز سے قبل اس کے حکم سے ملکِ عدم کو روانہ ہو چکے تھے اس نے ایک دفعہ اپنے مصاحبوں سے اپنی ملکہ کی عدم موجودگی کی وجہ پوچھی، حالانکہ کئی دن پہلے بدنصیب ملکہ اسی بادشاہ کے قہر کا لقمہ بن چکی تھی (یعنی قتل کرائی جا چکی تھی)، کتاب مذکور ص۲۹"

گویا اس رومی بادشاہ کے حافظہ کی حالت قریب قریب وہی تھی جو عربی کے افسانوی قصوں میں ھبنقاء نامی شخص کے متعلق لوگ ذکر کرتے ہیں کہ گلے میں ٹوٹے جوتوں کا ہار اس لئے ڈالے رہتا تھا کہ اپنے آپ کو پہچان سکے اور یاد رکھ سکے کہتے ہیں کہ اس ہار کے بغیر اپنے آپ کو بھی وہ بھول جاتا تھا۔

بہرحال بعض محدثین کی غیر معمولی قوت یادداشت اب خواہ اس عام قانون کا نتیجہ ہو۔ اور اسلام کو ان سے کام لینے کا موقعہ مل گیا، یا یہ سمجھا جائے کہ آخری نبوت کے متعلقہ معلومات کی حفاظت کے لئے قدرت نے جہاں دوسری چیزیں پیدا کی تھیں ان ہی میں غیر معمولی حافظہ رکھنے والے حضرات بھی پیدا کئے گئے تھے۔ کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کی تعداد محدثین میں بھی بہت تھوڑی تھی ورنہ عام طور ان کے حافظوں کا بھی وہی تھا جس کا ذکر ایک محدث نے وکیع کی قوت یادداشت کو سن کر کہا تھا، یعنی کہا کہ

ان حفظ وکیع کان طبعیًا   وکیع کا حافظہ ان کی ایک طبعی خصوصیت

وحفظنا تکلف خطیب مبیّن ... تھی اور ہم لوگ جو یاد کرتے ہیں تکلف کی یاد ہے

اوسط درجہ کی قوتِ یاد رکھنے والے لوگ کسی چیز کو جس تدبیر سے یاد کرتے ہیں تکلف والے حفظ سے یہی مراد ہے اسی تکلف والے حفظ سے کام لے کر اس وقت تک لاکھوں لاکھ کی تعداد قرآن کے حافظ لوگ بن رہے ہیں یعنی ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ رفتہ رفتہ تدریجی طور پر تھوڑا تھوڑا کر کے یاد کرتے ہیں، اور آپ سن چکے کہ کسی ایک آدمی کا نہیں بلکہ اس زمانہ کے عام محدثین کا یہی دستور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں چند حدیثیں جن کا اوسط پانچ سے دس تک کی حدیثوں کا تھا اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے، مقصد اس کا وہی تھا کہ عام لوگوں کے لئے حدیثوں کی یاد کرنے کی تدبیر یہ تکلف والی شکل ہی ہو سکتی تھی۔

اب ان سارے معلومات اور مقدمات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ مصنفین صحا اور عہدِ صحابہؓ کے اس درمیانی وقفہ میں مان بھی لیا جائے کہ حدیثوں کی حفاظت کی ایک ہی شکل یعنی کتابت نہیں صرف حفظ ہی تھی، تو جو ان کا ماحول تھا اور جس قسم کے ظاہری باطنی خصوصیات میں از سر تا قدم وہ ڈوبے ہوئے تھے ان کے لحاظ سے حدیثوں کو زبانی یاد کر لینا یہ کام ان کے لئے کچھ بھی دشوار تھا؟ ایک ایسے بدترین ناموافق حالات جن میں پچھلی صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمان گذر رہے ہیں ان کی زندگی کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو چکا ہے، قلوب پر دین کی گرفت روز بروز ڈھیلی پڑتی چلی جا رہی ہے لیکن با ایں ہمہ حفظ بہ تکلف کے عام قانون کے تحت ہمارے اور آپ کے سامنے دس بیس ورق ہی نہیں بلکہ اول سے آخر تک الحمد سے والناس تک کے حافظ قرآن ہزارہا ہزار کی تعداد میں جب پیدا ہو رہے ہیں تو جس زمانہ کا نقشہ صفحات بالا میں آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ حدیثوں کا

حفظ کا مسئلہ کیا کوئی بڑی بات تھی؟ جس کی دشواریوں کو محسوس کر کے یا کرا کے آج حدیثوں کے متعلق بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں خصوصاً جب اسی کے ساتھ ان نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ ان محفوظ حدیثوں میں ملفوظات نبویہ کے ساتھ ایک بڑا حصہ واقعات (یعنی افعال اور تقریرات) کا بھی شریک تھا، اور میرا یہ تخمینہ ہے کہ حدیث کے ان تینوں اجزاء میں دو تہائی حصہ ان ہی واقعات کا ہے۔ بلکہ صحیح تجزیے سے اگر کام لیا جائے تو شاید اس تخمینہ سے زیادہ بھی ہو، عرض کر چکا ہوں کہ واقعات کا یاد رکھنا آدمی کی قوت یادداشت کے لئے اتنا دشوار نہیں ہے، جتنا کہ ملفوظات اور اقوال کے یاد کرنے میں حافظہ پر بار پڑتا ہے پھر اسی کے ساتھ جب اس کو بھی سوچا جائے کہ سو ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ کے ابتدائی ایام میں عموماً حدیث کا سرمایہ بکھری ہوئی شکل میں تھا اجتماع اور تمرکز کی کیفیت اس میں بعد کو پیدا ہوئی، ظاہر ہے کہ اجتماع و تمرکز کی اس کیفیت سے پہلے ہر ایک پر حدیثوں کی محدود تعداد کے حفظ کی چونکہ ذمہ داری عاید ہوتی تھی اس لئے سمجھنا چاہئے کہ ایک خاص وقت تک اس سہولت سے بھی لوگ مستفید ہوتے رہے، لیکن جیسے جیسے یہ سرمایہ مخصوص دماغوں میں سمٹنے لگا تو اس کو بھولنا نہ چاہئے کہ حدیثوں کے سیکھنے سکھانے پڑھنے پڑھانے کے نظام کا استحکام اور اس کی استواری بھی بڑھتی چلی گئی اور گو عددی لحاظ سے آخر زمانہ میں حدیثوں کی تعداد میں بظاہر مہیب اضافہ نظر آتا ہے لیکن پہلی بات تو اس سلسلہ کی وہی ہے کہ غیر معمولی اضافہ وقفہ کی اس درمیانی مدت کے بعد ہوا ہے نیز حدیثوں کے عددی اضافہ کا راز جب معلوم ہو چکا کہ وہ خود حدیثوں کا اضافہ نہ تھا بلکہ زیادہ تر سند یا متن میں لفظ دو لفظ کے اضافہ سے حدیثوں کے عدد میں اضافہ ہو جاتا تھا، تو پھر اس کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، ایک

یمنی عالم نے اپنی کتاب "العلم الشامخ" نامی میں جلال الدین سیوطی کے اس دعویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ مجھے دولاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں، بڑے مزے سے لکھا ہے کہ لوگوں کو سیوطی کے اس دعویٰ سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ واقعی ان حضرات کو دو لاکھ حدیثیں یاد تھیں بلکہ ان کا یہ دعویٰ محدثین کی اسی اصطلاح پر مبنی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے۔

فلا یکون الواحد فی کتاب السیوطی	کہ ایک ایک حدیث مذکورہ بالا حساب
اربعة او عشرا او ستین حدیثا	سے سیوطی کی کتاب میں چار یا دس یا ساٹھ
باعتبارهم ص ۳۹۲ العلم الشامخ	تک کی تعداد تک پہنچ جاتی ہے۔

گویا سمجھنا چاہئے کہ حافظہ پر تو کل ساٹھ الفاظ کے یاد کرنے کا بار پڑا لیکن کہنے کے لئے ہو گیا کہ میں نے ساٹھ حدیثیں یاد کر لیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک ہی حدیث ہے حضرت ابوہریرہؓ بھی اس کے راوی ہیں، اور عائشہ صدیقہؓ بھی، ابن عمرؓ بھی آپ کے نزدیک تو وہ ایک ہی حدیث ہے، لیکن محدث بیان کرے گا کہ مجھے تین حدیثیں یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نام ابوہریرہؓ کے ساتھ "عائشہؓ" اور "ابن عمرؓ" ان دو ناموں کے یاد کر لینے سے ایک حدیث تین حدیث بن گئی عوام جو فن اور اس کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں ان کو حیرت ہوتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خود ان ناموں کے یاد رکھنے میں حافظہ کو دوسری بہت سی چیزوں سے مدد ملتی ہے، فن کار ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں فلاں فلاں صحابی سے حدیثیں زیادہ مروی ہیں۔

(باقی آئندہ)

ابوالمنذر ابن الکلبی کی ایک روایت پر تنقید

(حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند)

۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ روایت ذیل کی تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں مولانا موصوف کو ابن الکلبی کی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب الاصنام" کے اردو ترجمے اور اس پر تنقید کا خیال پیدا ہوا اور جیسا کہ صاحب موصوف کی عادت ہے کہ جس کام کا تہیہ کر لیتے ہیں اسمیں غرق ہو جاتے ہیں مہینوں کی محنت و کاوش اور تلاش و تحقیق کے بعد پوری کتاب کا ترجمہ مع تشریح و تنقید مکمل کر لیا اس وقت تک ندوۃ المصنفین عالم وجود میں نہیں آیا تھا اور جب ۱۹۳۸ء میں اس کا قیام عمل میں آیا تو دوسرے کاموں کا سلسلہ چھڑ گیا اور اسے شائع کرنیکا موقع نہیں ملا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مسودے کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اب ڈیڑھ سال کے بعد منتشر کاغذات میں دبے ہوئے یہ چند اوراق ملے ہیں۔ (مدیر)

"ابن کلبی راوی ہے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دن "عُزّیٰ" کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسلام سے پہلے جبکہ میں اپنی قوم کے دین پر تھا تو میں نے بھی ایک سرخ و سپید (کبری) بکری "عُزّیٰ" کی نذر کی تھی"

یہ روایت سرتاسر غلط اور باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ ابن کلبی کے متعلق محدثین کی جو متفقہ رائے ہے اگر اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی یہ قول اس لئے لغو اور بے اصل ہے کہ بے سند ہے اور بے سند قول کو اور وہ بھی ایسے شخص کی بیان کردہ قول کو جو محدثین کے نزدیک قطعاً ناقابل اعتبار اور کذاب ہو" روایت کرنا ہی روایت کی توہین کرنا ہے۔

صحیح اور صریح روایات میں مذکور ہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" نبوت سے قبل بھی

ہر قسم کے شرک کی نجاست سے پاک و منزہ اور متنفر رہے ہیں لہٰذا اُن روایات کی موجودگی میں اس بے سرو پا واقعہ کا بطلان بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے اہل جاھلیۃ جن امور کو کیا کرتے تھے میں نے ان میں سے کسی کوئی جاہلیت کا کام نہیں کیا البتہ دو مرتبہ اس سلسلہ میں ارادہ کیا تھا مگر دونوں مرتبہ میرے اور میرے ارادہ کے درمیان اللہ تعالیٰ آڑے آگیا (یعنی میں ان دونوں مرتبہ بھی امور جاہلیۃ) سے محفوظ رہا) اس کے بعد پھر کبھی ایک مرتبہ بھی میں نے کسی ایسے امر کا ارادہ نہیں کیا حتیٰ کہ وہ وقت آپہنچا کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے شرف رسالت سے مشرف فرمایا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک ہم عمر قریشی لڑکے سے "جو میرے ساتھ مکہ کی اونچی وادیوں میں بکریاں چرایا کرتا تھا" کہا کہ آج تو میری بکریوں کی بھی اگر نگرانی کرے تو میں مکہ میں جاکر نوجوانان مکہ کی طرح کسی عیش و طرب کی محفل میں شریک ہوں۔ اس لڑکے نے بخوشی منظور کر لیا اور میں روانہ ہو گیا اتفاق وقت کہ آبادی کے شروع ہی میں ایک مکان سے دف اور مزامیر کی آوازیں آرہی تھیں میں نے پوچھا یہاں آج یہ کیسا طرب کا سامان ہے کہنے والوں نے کہا کہ فلاں لڑکے کی فلاں لڑکی سے شادی ہوئی ہے۔ یہ سب اُس خوشی میں ہو رہا ہے میں اس ارادہ سے بیٹھا ہی تھا کہ اس کی سیر کروں کہ قدرتِ الٰہی نے مجھ پر فوراً نیند کا ایسا غلبہ طاری کر دیا کہ میں بے بس ہو کر اسی آن سو گیا اور ایسا سویا کہ سورج جب چڑھ آیا تب آنکھ کھلی۔ پھر اُٹھ کر اپنے ساتھی کے پاس پہنچا۔ اُس نے پوچھا رات کا حال سناؤ

لہ رواہ البیھقی فی سننہ والبزار وابن راھویہ فی مسانیدہ وابن اسحٰق فی سیرتہ وابن عساکر فی تاریخہ وابونعیم فی دلائل النبوۃ بسند صحیح عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

ہیں نے کہا کہ میں تو کچھ بھی نہ سن سکا اور نیند کا واقعہ اس کو سنایا۔ اسی طرح ایک رات کو بکریاں اُس کے سپرد کر کے مکہ پہنچا اور محفلِ طرب میں شرکت کی غرض سے بیٹھا ابھی بیٹھنے ہی پایا تھا کہ پہلے کی طرح پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نیند کو مسلط کر دیا خدا کی قسم ایسا سویا کہ سورج کی تمازت ہی نے جگایا واپس آیا تو اپنے نوجوان ساتھی سے سارا قصہ نقل کیا اس کے بعد شرفِ رسالت سے مشرف ہونے تک پھر کبھی جاہلیت کے کسی کام کا ارادہ تک بھی دل میں پیدا نہیں ہوا تفصیل کے لیے دیکھو امام بیہقی کی سنن کبریٰ اور ابونعیم کی دلائل النبوۃ

(۲) حضرت علی ہی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کبھی آپ نے بت کی پرستش کی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کبھی نہیں۔! یا رسول اللہ کبھی آپ نے شراب پی ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی نہیں! (دلائل النبوۃ جلد اول تاریخ ابن عساکر

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زید بن عمرو بن نُفَیل اس جانور کے گوشت کھانے کو معیوب سمجھتے تھے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔" میں نے مدت العمر اس جانور کا گوشت نہیں کھایا جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو رسالت کے شرف سے مشرف فرمایا۔ (دلائل النبوۃ جلد اول)

(۴) حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ایک پڑوسی سے سنا ہے وہ کہتا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ سنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے۔ اے خدیجہ خدا کی قسم میں نے کبھی "لات" کی پرستش نہیں کی۔ خدا کی قسم میں نے کبھی "عزّیٰ" کی پرستش نہیں کی (مسند احمد)

(۵) بیہقی نے زمانۂ نبوت سے قبل کے واقعات نقل کرتے ہوئے، روایت کیا ہے کہ زید بن حارثہ آپ کے ساتھ جا رہے تھے جاتے جاتے ایک بت نظر پڑا تو زید (جو کہ ابھی بچہ تھے) اس کو چھونے لگے آپ نے ان کو چھونے سے منع کیا اور فرمایا کہ کبھی اس کے پاس نہ پھٹکنا۔ (نسیم الریاض)

(۶) بحیرا نے دوران گفتگو میں (لات و عزّیٰ کا ذکر کر کے) آپ کو جانچا آپ نے فرمایا تم میرے سامنے لات و عزّیٰ کے متعلق کوئی تذکرہ نہ کرو کیونکہ ان ہر دو بتوں سے میں تمام بری چیزوں سے زیادہ بغض و عداوت رکھتا ہوں۔ (شفاء)

(۷) آپ کو ایک مرتبہ لڑکپن میں آپ کے چچا زبردستی اپنی ایک عید کے موقعہ پر لے گئے آپ فرماتے ہیں کہ میں اگر ذرا بھی اس بت کے قریب چلا جاتا جس کے سامنے میلا لگ رہا تھا فوراً اسی وقت ایک نورانی شکل نمودار ہوتی اور مجھ کو چیخ کر ہٹا دیتی اور کہتی کہ ہرگز اس بت کو ہاتھ نہ لگانا اس کے بعد پھر کبھی نبوت سے سرفرازی تک میں ان کی کسی عید میں شریک نہ ہوا (طبقات ابن سعد قصہ صنم بواز)

(۸) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ آپ زمزم کے قریب اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ اس جگہ کھڑے تھے جہاں "اساف" بت نصب تھا فوراً ہی آپ کی چشم مبارک ایک لمحہ کے لئے کعبہ کی جانب اٹھی اور اس کے فوراً بعد ہی آپ خیال سے ہٹ گئے۔ چچا زاد بھائیوں نے پوچھا کیوں یہ کیا حال ہے؟ فرمایا کہ مجھے اس بت کے قریب کھڑے ہونے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (دلائل النبوۃ)

(۹) حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جب (قریش کے زمانہ میں) کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی تو حضرت عباس اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (چچا بھتیجے) اس کی تعمیر کے لئے پتھر اٹھا

اُٹھا کر لا رہے تھے حضرت عباس نے آپ سے کہا کہ تہ بند کھول کر کاندھے پر رکھ لو تو پتھر کی رگڑ سے محفوظ رہو گے۔ آپ نے ایسا کیا تو فوراً بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور آنکھیں آسمان کی طرف دیکھتی رہیں تھوڑی دیر میں جب افاقہ ہوا تو آپ نے تہ بند کو بار بار مانگا۔ فوراً ہی آپ کے تہ بند باندھ دیا گیا (بخاری جلد اول باب بنیان الکعبہ) اور قسطلانی نے اسی حدیث کے ذیل میں ابو الطفیل کی حدیث نقل کی ہے جو اسی واقعہ سے متعلق ہے اس میں ہے نُودِيَ يَا مُحَمَّدُ غَطِّ عَوْرَتَكَ (الحدیث) اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ستر کو چھپاؤ۔

(۱۰) خواجہ ابو طالب ایک مرتبہ اپنے بھائی حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ اپنے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی قبل از نبوت زندگی کے وقت کی سوسائٹی کے خلاف تعجب خیز، حیرت انگیز حالات سنا کر ابتدائی زندگی کی طہارت و تقدیس پر فخریہ اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں میں نے اس کو نہ کبھی جھوٹ بولتے دیکھا، اور نہ کھیل کھلاکر۔ ہنستے، نہ اس میں زمانۂ جاہلیت کا کوئی چلن دیکھا اور نہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول پایا۔

ان صاف، صریح، اور صحیح روایات کے بعد معاملہ کی اصل حقیقت پر نظر ڈالیئے اور پھر ابن کلبی کی بے جا عبارت، بہتان طرازی، اور لغو بیانی کو دیکھئے۔ پہلی روایت جو "روایت و درایت کے اعتبار سے محدثین و ارباب سیر کے یہاں مسلّم ہے" خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اس صداقت کا اعلان کر رہی ہے کہ نبوت سے پہلے چالیس سال کی پوری زندگی میں شرک، صنم پرستی جیسی ملعون چیز تو کجا اس مقدس ہستی نے "جاہلیۃ" کے کسی معمولی سے معمولی عمل کو بھی اختیار نہیں کیا پاک زندگی

کے صرف دو لمحے ایسے گذرتے ہیں جن میں تقاضائے بشری تحریک کرتا ہے کہ شہر کی متمدن زندگی کے درمیان کسی عیش وطرب کی مجلس میں لطف اُٹھائیں مگر رب اکبر کو کچھ اور ہی منظور ہے وہ نہیں چاہتا کہ جس کی زندگی دنیا کے لیئے ہدایت و رحمت بنائی جانے والی ہے اُس کا ایک لمحہ بھی تاریکی کے کسی گوشہ اور جہالت کے کسی شوشہ سے روشناس ہو، آفتاب، ظلمت کا پرستار کیسے ہو جائے؟ نور، تاریکی سے کیونکر بدل جائے؟ اُس نے حفاظت کی اور زندگی پاک کے ان دونوں لمحات میں ید قدرت نے ایسا تھپک کر سلا دیا کہ سپیدۂ صبح کی نمود سے پہلے آپ بیدار نہ ہو سکے۔

سیرت کی دوسری روایت جس کے راوی خاندان نبوت کے سب سے بڑے رازدان حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں" تصریح کرتی ہے کہ آپ نے تمام عمر نہ کبھی بت پرستی کی، نہ شراب خواری "جو کہ اسلام کے اولین دور میں بھی مباح رہی ہے اور عرصہ کے بعد جس کی حرمت نازل ہوئی ہے" کیا امورِ جاہلیہ سے ایسا وجود اور سلیم الفطرت ہستی کی نفرت وعداوت کا ثبوت اس سے اور زیادہ مطلوب ہے؟ یا للعجب! ابن کلبی کہتا ہے کہ آپ نے عزّیٰ پر بھینٹ چڑھائی جب کہ آپ اپنی قوم کی ملت پر تھے (العیاذ باللہ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ میں نے ساری عمر میں کبھی بتوں کی بھینٹ کی قربانی کا گوشت نہیں کھایا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ آپ بت پرستی کے ان مراسم کو نفرت سے دیکھتے اور نجس و ناپاک سمجھتے تھے۔

اور کیا حضرت عروہ کی اس صحیح روایت (۱۷۳) کے بعد بھی" کہ آپ نے

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے خدا کی قسم کھاکر فرمایا کہ میں نے کبھی لات و عزیٰ کی پرستش نہیں کی" اور اسی طرح بحیرا راہب کے واقعہ (روایت ۵) میں اس تصریح کے بعد کہ لات و عزیٰ کا ذکر بھی میرے سامنے نہ کرو اس لیے کہ جس قدر ان دونوں سے مجھے بغض ہے کسی دوسری چیز سے اتنی نفرت نہیں ہے" ابن کلبی کی اس لغو بیانی کی پرکاہ کی برابر بھی وقعت ہو سکتی ہے ؟ آپ کی مقدس زندگی اور کسی بت کے لئے بھینٹ؟ (عیاذاً باللہ) آپ کے شرف صحبت کا سایہ بھی اگر کسی پر پڑ گیا ہے تو اس کی زندگی بھی قوم کی جاہلانہ و مشرکانہ رسوم سے یکسر پاک اور طاہر ہو گئی ہے۔ حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہ) کا واقعہ (روایت ۶) سامنے ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ شرک و توحید کے فرق سے ناآشنا، نذر و عبودیت کے مسائل سے ناواقف "زید" ایک بت کو دیکھتا اور آگے بڑھ کر صرف اس کو چھونا چاہتا ہے، مگر رحمت عالمیان، سرورِ کون و مکان، (جو ابھی شرف رسالت سے مشرف نہیں ہوئے) اس کو پیچھے ہٹا لیتے اور سختی سے ہدایت کرتے ہیں کہ کبھی کسی بت کو ہاتھ نہ لگانا۔

بچپن کی زندگی کا حال گھر والوں سے زیادہ کون جان سکتا ہے ؟ آپ کی بیوی "ام ایمن" سے دریافت کردہ (روایت ۸ میں) اس مقدس وجود کے لڑکپن کے زمانہ کا حال کیا بیان کرتی ہیں خود نہیں گھر والوں کے اصرار پر، مرضی سے نہیں دل کی نفرت و ناگواری سے ایک میلے میں بزرگان خاندان کے ہمراہ ہیں۔ اہل خاندان ایک بت کے سامنے نیاز مندانہ حاضر ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان کا ساتھ دیں۔ مگر ارادہ سے قبل ہی رب اکبر کا فرشتہ نمودار ہوتا ہے اور ذات اقدس کو اس سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ "آپ نہیں جانتے کہ یہ کون ہے ؟ میرے باز رکھنے میں اس کو کیا دخل

ہے ؟ مگر فطری استعداد، اور وہی سلامت قلب اس تنبیہ سے بیدار ہو جاتی ہے اور آپ اس جاہلانہ عید کی شرکت سے سختی کے ساتھ انکار کر دیتے اور واپس چلے آتے ہیں۔

اور پوچھو آپ کے بنی عم سے 'دریافت کرو ابن عباس سے (روایت ۸ میں) وہ بیان فرماتے ہیں۔ بچپن کا عالم ہے زمزم کے قریب اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہیں سامنے "اساف" ہے مگر قلب منور، سینۂ روشن، روح مطہر، ظلمت و تاریکی کے اس مجسمہ کی قربت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ نگاہ یک بیک کعبہ کی جانب اٹھ جاتی ہے؛ اور ہادی مطلق کا فرشتۂ رحمت آپ کے کان میں کہتا ہے کہ تیرا وجود ظلمات کی ان نجاستوں کو فنا کرنے آیا ہے اس لیے یہ جسمانی قربت کیسی؟ آپ کچھ دیکھتے ہیں مگر ابھی جانتے نہیں۔ آپ کچھ سنتے ہیں مگر ابھی پہچانتے نہیں۔ مگر نوید کمال نبوت، اور مستور نور رسالت' رہنمائی کرتے ہیں اور آپ فوراً ہٹ جاتے، اور اپنے عزیزوں کے دریافت کرنے پر اصل حال سے مطلع فرماتے ہیں۔

اور کیا ابو طالب سے نہیں سنا کہ انھوں نے حضرت عباس سے کیا کہا؟ اور اپنے پیارے یتیم بھتیجے کے بچپن کے کمالات کا اظہار کن الفاظ میں کیا؟ ابو طالب کی زبان زندگی مبارک کے پاک حالات میں رطب اللسان ہے بیان کرتے ہیں اور خود ہی حیرت میں پڑ جاتے ہیں، تعجب کرتے ہیں، فخر کرتے ہیں اور خوش ہو کر ان الفاظ کے ساتھ اپنے بیان کو ختم کرتے ہیں، میں نے نہ تو کبھی اس کو جھوٹ بولتے دیکھا، نہ کبھی بے تحاشا ہنستے دیکھا، نہ بچوں کی طرح کھیلتے دیکھا اور نہ جاہلیت کے کاموں میں سے کسی کام کو کرتے دیکھا، ابو طالب، چچا، میمونہ، پھوپی، ابن عباس

چچازاد بھائی، خدیجہ، زوجہ مطہرہ تو یہ فرمائیں کہ اس ذات قدسی صفات کی ساری زندگی تہو و لعب سے بیزار، لہو و لعب سے متنفر، جاہلیت کے کاموں سے یکسر پاک گذری اور ابن کلبی بے سند، بے دلیل جسارت و بے باکی سے یہ کہے کہ آپ نے "عزیٰ" کی نذر ایک بکری کی تھی۔

یہ روایات اگرچہ صحیح ہیں، صاف اور صریح ہیں، روایت و درایت کے اعتبار سے بے غل و غش ہیں اور ابن کلبی جیسے شخص کی بے سر و پا اور بے سند روایت کی تردید کے لئے کافی اور تسلی بخش ہیں مگر قبولیت و شہرت کے اس درجہ کو نہیں پہنچیں جو بخاری و مسلم کی روایات کو حاصل ہے تو کیا پھر بخاری "جو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے" آپ کی قبل نبوت زندگی کی معصومیت، تقدس و طہارت شرک و جہالت کی آلودگیوں سے بے لوثی کے اثبات کے لیئے خاموش ہے۔ نہیں ہرگز نہیں حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) راوی ہیں کہ جب قریش، کعبہ کی دوبارہ تعمیر میں مشغول تھے تو آپ کی نوعمری کا زمانہ تھا آپ بھی اپنے چچا عباس کے ہمراہ پتھر لانے میں مشغول تھے بزرگ اور شفیق چچا نے جاہلیت کے دستور کے مطابق نصیحت کی کہ تہ بند کھول کر کاندھے پر رکھ لو تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔ سعادت مند بھتیجے نے تعمیل کی ہی تھی کہ فطرتِ سلیم پر چوٹ لگی اور بے ستری نے آپ کو بیہوش کر دیا آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی خدائے برتر کی تنبیہ کا نظارہ کر رہی تھیں ہوش ہوا تو فوراً تہ بند مانگا اور ستر ڈھانک لیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد کبھی جاہلیت کی یہ رسم آپ نے اختیار نہ کی۔

جس زمین میں عریاں ہو جانا کوئی اہم بات نہ ہو، وقت کی سوسائٹی میں معیوب نہ ہو شرافت و نجابت جس کو عار نہ سمجھتی ہو، امیر و غریب، سب ہی اس میں مبتلا

ہوں یہ کیا قدرت کی کرشمہ سازی ہے کہ سارے عرب میں، عرب کے بہترین خاندان قریش میں، قریش کے سرداروں اور امیروں میں جو چیز صبح سے شام اور شام سے صبح تک روزمرہ کی زندگی کا معمولی واقعہ بن گئی ہو۔ عبدالمطلب اور عبداللہ کے "دریتیم" محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسی نفرت کی چیز بن جائے کہ فطرت سلیم اس کو برداشت نہ کرسکی اور حیاو حجاب کی نزاکت نے اس قدر مضطرب وبیقرار کردیا کہ بیہوش ہو گئے۔ تو کیا جس ہستی کے لئے قدرت نے "آنے والے عظیم الشان منصب کی خاطر" یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ جاہلیۃ کی اس معمولی رسم کو بھی جو عرف حیا کے خلاف اور غیرت کے منافی ہے کسی ذی ہوش کو یہ باور ہو سکتا ہے کہ اس کو یہ قدرت نے اسکے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا "عزیٰ" پہ نذریں چڑھائے اور ملت قوم کا سا لقہ دیکر مشرکانہ رسوم ادا کرے۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

بہر حال ان ہی صحیح روایات کی بنا پر مسلمانوں کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ "نبی" "رسول" اور "پیغمبر" زمانۂ نبوت سے پہلے بھی شرک کی تمام آلودگیوں اور جاہلیۃ کی رسوم سے اُسی طرح معصوم، پاک اور مطہر ہوتا ہے جس طرح نبوت و رسالت سے سرفرازی کے بعد معصوم سمجھا جاتا ہے اس لئے تمام جلیل القدر مفسرین آیۃ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى (اور پایا تم کو غافل پس ہدایت دی) کے تحت میں تصریح کرتے ہیں۔

اس شخص کی بات کسی طرح قابل توجہ نہیں جو یہ کہتا ہے کہ اسلام سے قبل (رسول اللہ) صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی ملت و شرک پر گامزن تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو اسلام کی راہ دکھائی۔ اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح تمام پہلے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام پیدائش ہی سے توحید پر قایم

رہتے ہیں اور اس بارے میں نبوت سے قبل اور بعد کے درمیان مطلق کوئی فرق نہیں ہے اور بلا ریب و شک تمام انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت سے قبل اللہ کی توحید اور صفات کے صحیح علم سے واقفیت اور ناواقفیت سے معصوم ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قریش نے آپ پر عیب تراشنے اور تہمتیں لگانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تو کھلا ہوا تم علط گئے اور اتہامات سے باز نہ رہی ہو وہ اگر یہ دیکھتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے ایک عرصہ تک اُن ہی کے دین پر رہے اور اُن ہی کی طرح مشرکانہ رسوم انجام دیتے رہے یا کبھی ایک مرتبہ بھی آپ کو اس قسم کے کسی عمل میں مبتلا پاتے تو ناممکن تھا کہ وہ دعوت نبوت کے زمانہ میں عیب گوئی اور نکتہ چینی نہ کرتے اور الزام نہ دیتے کہ یہ وہی بت ہیں جن کے سامنے ایک زمانہ تم نے بھی سر نیاز جھکایا اور ان پر چڑھاوے چڑھائے ہیں۔ مگر تم دیکھتے ہو کہ قریش کے تمام اتہامات اور الزامات کا دفتر اس الزام سے خالی ہے اور وہ کیسے کہہ سکتے تھے جبکہ وہ جانتے اور یقین رکھتے تھے کہ اس ہستی نے تمام عمر کبھی ان مشرکانہ رسوم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور کبھی ان کو اختیار نہیں کیا۔

اور زمخشری کہتا ہے۔ جس شخص نے یہ کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) چالیس سال تک اپنی قوم کے طریقہ پر رہے اگر اس کہنے سے اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مدت میں وحی الٰہی کا کوئی تعلق آپ سے نہیں ہوا تو صحیح ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ آپ اپنی قوم کے مذہب (شرک) پر تھے تو پناہ بخدا یہ بہتان ہے اس لئے کہ تمام انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نبوت سے پہلے اور بعد چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہوں کی آلائش سے پاک اور معصوم ہونا ازبس ضروری ہے چہ جائیکہ وہ کفر باللہ کی توحید اور اس کی خالقیت و

یکتائی کے عقیدہ سے بے بہرہ ہوں یا اس کے خلاف شرک میں مبتلا ہوں۔

شاید تم کہو کہ پھر "ووجدك ضالا" کے معنی کیا ہیں۔ اس کے متعلق مفسرین نے لغت عربی، محاورۂ عرب، امثالِ عرب، اور روایات و درایات صحیحہ کی روشنی میں بہت کافی بحث کی ہے جس کے لئے خازن، روح المعانی، ابن کثیر، بحر محیط، کبیر، اور المنار وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ مگر علم تفسیر کے سب سے بڑے اصول "یعنی القرآن یفسر بعضہ بعضا" قرآن خود اپنی ایک آیت کی دوسری آیت کے ذریعہ تفسیر کر دیتا ہے" کے مطابق ہمارے لیے سب سے بہتر اور شافی جواب یہ ہے کہ اس آیت کے صاف اور سادہ معنی وہی ہیں جو قرآن عزیز کی اس آیت "وماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان" اور تو (سرفرازی نبوت سے پہلے) نہیں جانتا تھا کہ خدا کی کتاب (قرآن) اور وحی کے ذریعہ بتایا ہوا ایمان کیا ہے میں آپ کی قبل از نبوت زندگی کا حال بیان کیا ہے یعنی عیاذاً باللہ آپ کی گم کردہ راہی یہ نہ تھی کہ آپ مشرکین مکہ کے مذہب و ملت پر مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے۔ بلکہ تمام زندگی کے تقدس وطہارت، شرک سے نفرت، استغراق محبت الٰہی، غار حرا میں خلوت کی شبہائے عبادت کے باوجود خدا کی بخشی ہوئی کتاب "قرآن" اور وحی کے ذریعہ اس کے بتائے ہوئے حقائق ایمان کے بغیر آپ گم کردہ راہ اور متحیر رہا کرتے تھے اور جب اس نے یہ دونوں چیزیں آپ کو بخش دیں تو پھر آپ ہدایت کے وہ معنی پا گئے جو بغیر موہبت ربانی اور عطیۂ الٰہی کے کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ وان کنت من قبلہ لمن الظالمین، اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

تصحیح

برہان بابت فروری میں جناب بسمل شاہجہانپوری کی ایک نظم پیغمبر اسلام کی زندگی شائع ہوئی تھی نظم کا پہلا مصرعہ یوں ہے۔

اے کہ ہر رازِ مشیت ہے نظر میں تیری

ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی

(۲)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

لیکن بادشاہ سلامت جہاں ہندوستان کے حکام اعلیٰ سے اپنی شکایات کو دور کرانے اور اپنے دعوے کو منوانے کی آخری کوشش کر رہے تھے وہاں انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر یہاں کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تو وہ انگلستان کے حکام اعلیٰ تک اپنے معاملات کو فیصلہ کے لئے پہنچائیں گے۔ جب مندرجہ بالا مراسلہ حکومت کی طرف سے ان کو موصول ہوا تو اس کے بعد ہی بادشاہ کو یہ اطلاع ملی کہ گورنر جنرل عنقریب انگلستان کے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔

چنانچہ شہنشاہ نے اُن کو خط لکھا جس میں درخواست کی کہ ہمارے معاملات کو بوجوہ احسن آپ طے کریں اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو آپ انگلستان کے افسران بالا کی خدمت میں شاہی مطالبات اور واقعات کو اصلی رنگ میں پیش کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے بادشاہ اس خدمت پر راجہ رام موہن رائے کو مامور کرنے کا ارادہ رکھتے تھے

بالآخر جب گورنمنٹ کا فیصلہ موصول ہوگیا تو بادشاہ نے راجہ رام موہن کو یہ اہم خدمت سپرد کی کہ وہ انگلستان جاکر شہنشاہ کے مطالبات کے متعلق ان کی

وکالت کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے پہلے ہی سے اس خدمت کے لئے تیار کر لئے گئے تھے۔

مارچ ۱۸۳۰ء کی ابتدا میں راجہ رام موہن رائے کو شاہی دربار سے تقرر کی سند عطا ہوئی اُن کو یہ حکم دیا گیا کہ ایک عرضداشت شہنشاہ کی طرف سے فارسی اور انگریزی میں تیار کریں۔ جب یہ عرضداشت تیار ہو گئی تو بطور ایلچی ان کو ولایت بھیج دیا اس موقع پر دربار شاہی سے رام موہن رائے کو راجہ کا خطاب ملا اور گورنمنٹ سے منظوری کے لئے کہا گیا۔

لیکن گورنمنٹ نے ان کی تقرری اور خطاب دونوں کی منظوری سے انکار کر دیا اپنے مراسلہ میں ریذیڈنٹ دہلی کو گورنمنٹ نے ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کو مطلع کر دے کہ گورنمنٹ اس عرضداشت کو بہ نظر حیرت و استعجاب دیکھتی ہے جس میں بقول اس کے کمپنی کے خلاف شاہی معاہدوں کی خلاف ورزی کے انتہائی سخت اور بے اصل الزامات عاید کئے گئے ہیں بادشاہ کے ولایت کو سفیر بھیجنے پر گورنمنٹ سخت چراغ پا ہوئی کیونکہ ان کی نظر میں یہ عمل غیر معمولی تھا لیکن سو اس نے دانشمندانہ طرز اختیار کیا اور ریذیڈنٹ کو یہ ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کو مطلع کر دے کہ اسے اس طرز عمل کا پورا اختیار ہے۔

پھر بھی گورنمنٹ کو بے چینی تھی اور بادشاہ سے یہ یقین چاہتی تھی کہ آیا راجہ رام موہن رائے کو بادشاہ نے حقیقتاً اپنا سفیر بنایا ہے جب ریذیڈنٹ نے بادشاہ سلامت سے استفسار کیا تو انھوں نے اُسے یقین دلا دیا کہ درحقیقت انھوں نے رام موہن کو سفیر مقرر کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ جو عرضداشت شاہی جاہ و مرتبت کے حسب حال تھی گورنمنٹ کی نظر میں قابلِ اعتراض تھی۔ بادشاہ سلامت نے تحریر کیا کہ

ہماری پچھلی درخواستیں وقتاً فوقتاً منظور کی گئیں اور وظیفہ میں بھی قدرے اضافہ ہوگیا لیکن ہمارے اہل خاندان اور ان کے متوسلین کی ضروریات میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے یہی وجہ تھی کہ لارڈ امہرسٹ کو جو معروضات بھیجی گئی تھیں اور جب ان معروضات کا دو ٹوک جواب مل گیا تو عالم مایوسی میں ہم اس اپیل پر مجبور ہوئے شہنشاہ کی عرضداشت میں اولین مطالبہ وظیفہ میں اضافہ تھا۔

۱۸۰۵ء میں شاہ عالم اور گورنمنٹ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کا حوالہ دیتے ہوئے بادشاہ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی پہلی دفعہ کی رو سے عطا کئے گئے محال کی آمدنی کی کل رقم ان کو ملنا چاہئے جو تقریباً تیس لاکھ تھی اور اس کے متعلق جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سر چارلس مٹکاف نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ وہی رقم ہے جو ۱۸۰۵ء میں گورنمنٹ نے طے کی تھی اس میں گورنمنٹ کے کل اخراجات مع فوج شامل تھے۔ مٹکاف نے یہ بھی کہا تھا کہ گورنمنٹ کا معاہدہ کرنے والے فریقین کی ذمہ داری کے عین موافق تھا اور اس معاہدہ کی عدم تکمیل معاہدہ کی اہم شرائط سے روگردانی کی بین مثال ہے۔

گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ نے مینیجر کے ایک مراسلہ میں یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ابتداءً گورنمنٹ کا یہ منشا تھا کہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی کفالت کے لئے چند مخصوص محال دریائے جمنا کے غرب میں مقرر کردئے جائیں لیکن اس تجویز پر عمل نہ کیا جاسکا درحقیقت یہ بہانہ غلط تھا۔ بادشاہ نے اس امر پر زور دیا تھا کہ جب موعودہ محالوں کی آمدنی شاہی وظیفہ کی کم سے کم رقم سے زیادہ ثابت نہ ہوئی تو معاہدہ بالا کی دوسری دفعہ کی مد سے متصدیان تعینات کئے گئے کہ وہ بادشاہ کے مرحوم باپ کے حضور میں محاصل اور اخراجات کی رپورٹ پیش کریں لیکن جب یہ محاصل اصل رقم سے زیادہ ہوجاتے تھے تو گورنمنٹ اس شرط پر

پوری طرح عمل کرنا ناموزوں سمجھتی تھی۔ اور متصدیوں کو ان محالوں سے ہٹا دیتی تھی علاوہ ازیں کمپنی کے متعدد قوانین متعلقہ مفتوحہ و محروسہ علاقہ جات میں بادشاہ کی حقیقت کا اعتراف ان محالوں کے محاصل کے متعلق واضح طور پر موجود تھا اس میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ روپیہ مسلسل کئی سال سے تھا گورنمنٹ کا یہ دعویٰ تھا کہ لارڈ منٹو نے ۱۸۰۹ء میں جو فیصلہ کیا تھا اس کے بعد گورنمنٹ کے ماسبق ارادوں کی تنسیخ ہو جاتی ہے لیکن بادشاہ کی یہ دلیل تھی کہ یہ فیصلہ خود ہی ضمنی ہونے کے اعتبار سے بے اثر ہے اس کے علاوہ شاہی وظیفہ میں اضافہ کا دعویٰ محض افسانہ ہے۔ معاہدہ کی دوسری دفعات کی خلاف ورزی کا بھی حوالہ دیا گیا۔

المختصر بادشاہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس محال سے کل محاصل کا مستحق میں ہوں جو ابتداءً شاہی خاندان کی کفالت کے لئے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اور جس پر آنریبل کمپنی نے اس کے جائز مالک سے نکال کر خود قبضہ کر لیا ہے۔ شاہی خاندان کو جن رقوم سے محروم کر دیا گیا ان کو واپس کر دیا جائے اور ہم بادشاہ انگلستان سے اس بات کی ضمانت چاہتے ہیں کہ اس معاہدہ کی آئندہ سختی کے ساتھ پابندی کی جائے جس کی بنا پر شاہی وظیفہ کی اول رقم مقرر کر دی گئی ہے اور جس کی رو سے جمنا کے مغربی محال کے کل محاصل شاہی خاندان کے حصہ میں آتے ہیں بشرطیکہ یہ محاصل مقررہ اوّل رقم سے زائد ہوں۔ نیز صحیح رقم معلوم کرنے کے ذرائع کا فیصلہ ہمارا حق ہے

یہ بات انسانی طبیعت کے اندر داخل ہے کہ ایک فریق پر جملہ تکالیف عاید کئے جائیں اور دوسرے فریق کو اس کی قربانیوں کا ثمرہ دیا جائے لہٰذا ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ ہمارے حقوق کا فیصلہ کر دیا جائے تاکہ علاقہ متعلقہ کا انتظام ہمارے

ذمہ ہو۔ یا بالعوض ہم کو ایک رقم ماہانہ ملے۔ موخر الذکر صورت میں محال کی کل آمدنی کو معیار قرار دیا جائے۔ اگر وہ تیس لاکھ سے کم نہ ہو تو ہم معاہدہ کی دفعات کی رو سے اپنے جملہ مطالبات کو تیس لاکھ سالانہ کی مقرر کردہ رقم کے بدلے نظرانداز کر دیں گے۔ ان باتوں کے علاوہ بادشاہ نے اس کا بھی یقین دلایا کہ حکام کے دل میں اگر یہ خدشہ ہو کہ شاید ہم کسی معاندانہ مقصد کے لئے روپیہ جمع کر رہے ہیں تو اس کے دفعیہ کے لیے ہم مقررہ رقم خزانہ شاہی میں رکھیں گے۔

بادشاہ کی دوسری شکایت مراسلات کے القاب میں تبدیلی کے متعلق تھی۔ بادشاہ کی شکایات بالا کا حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شکایات متعلقہ وظیفہ شاہی کے جواب میں انھوں نے سر چارلس مٹکاف کے متذکرہ بالا خیالات کا صرف حوالہ دینا ہی کافی سمجھا نئے آداب والقاب کو اختیار کرنے کی وجہ گورنمنٹ نے یہ بتائی کہ لارڈ ہسٹنگز کے عہد میں گورنمنٹ کی مہر میں گورنر جنرل کا لقب حلقہ بگوش شہنشاہ دہلی تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ گورنمنٹ بہ حیثیت رعایا اپنے آقا کو خطاب کرتی ہے اس لئے ایک نئی مہر کندہ کی گئی جس میں سے حلقہ بگوش کا لفظ اڑا دیا گیا اور مراسلات بند کر دیے گئے کیونکہ مارکوس آف ہسٹنگز نے بادشاہ سے اس کے اوپر مباحثہ کی بجائے مراسلات کا بند کر دینا ہی بہتر سمجھا تاکہ بادشاہ سے مزید تلخی کی نوبت نہ آئے۔

معاملات ۱۸۲۷ء تک اسی حالت میں رہے جب کہ لارڈ امہرسٹ کو ازسرنو ان کو تازہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ تو ہم پہلے دیکھ ہی چکے ہیں کہ بادشاہ نے مراسلات بند کر دینے کو اپنی توہین سمجھا تھا اس لئے لارڈ امہرسٹ بادشاہ کے اس خیال کو دور کرنے کے موقعہ کے منتظر تھے جب گورنر جنرل نے مغربی صوبہ جات کا دورہ کیا تو بادشاہ سلامت

ان سے ملنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ ملاقات ہوئی۔ لارڈ امرہسٹ کو یقین تھا
اس ملاقات کو جو حیثیت دی گئی ہے وہ بادشاہ کے ساتھ قطع مراسلت کی تجدید کا اہم
موقع ہے لیکن ان کی باتوں سے کے بعد گورنمنٹ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ شہنشا
کی شکایات ہی جزوِ اعظم قرار دیا گیا تھا گورنمنٹ نے اپنا فیصلہ ریذیڈنٹ کے ذرا
بادشاہ کو بھیجا جس میں یہ معلوم کیا گیا تھا کہ بادشاہ سلامت نے کس بنا پر اس کو ا
توہین قرار دیا ہے۔

بادشاہ نے وجوہ بتائے اور کہا کہ باریابی کے آداب شاہی میں ترمیم ہم
اس خوف سے منظور کر لی ہے۔ کہ مبادا بُرے نتائج رونما ہوں۔ جیسا کہ لارڈ ہیر
کے ساتھ پیش آئے تھے۔

بادشاہ کو یہ بھی امید تھی کہ لارڈ امرہسٹ کی خواہشات کو پورا کرنے سے ا
کی امیدیں برآئیں گی۔ اس معاملہ میں ان کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔

راجہ رام موہن رائے کے انگلستان کے سفر پر مختلف گوشوں سے اعتر
کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی اخبار "جان بل" نے ایک مضمون شائع کیا جس میں لکھا گیا کہ
دستاویزات وہ انگلستان لے جا رہے ہیں سرکاری دفاتر سے رشوت دے کر حا
کی گئی ہیں۔ جب راجہ رام موہن رائے کے علم میں آیا تو انھوں نے بھی گورنمنٹ ۔
احتجاج کیا اور اس معاملہ پر تحقیقات کا مطالبہ کیا اور انھوں نے یہ جتلا دیا کہ رشوت
معاملہ بالکل بے بنیاد ہے۔ دہلی کے ریذیڈنٹ کو گورنمنٹ نے تحقیقات کے ۔
کیں جس کی رپورٹ میں ریذیڈنٹ راجہ رام موہن رائے پر کچھ ثابت نہ کر سکا اور اس
رام موہن کا کردار اور بلند ہو گیا گورنمنٹ نے عدالت ڈائرکٹران میں اپنی رپورٹ بھیج

چند روز کے بعد شاہ دہلی کے ولی عہد نے اپنے بھائی سلیم اور اپنے دربار کے چند
ء کی اس کے خلاف سازش کی شکایت کی جس میں رام موہن رائے کا بھی نام تھا۔ شہزادہ
ورنمنٹ کو لکھا کہ افضل بیگ نے کلکتہ پہنچتے ہی اپنی بد طینتی کا ثبوت پیش کیا اور
ے بنگالی راجہ رام موہن رائے سے اپنی پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔ اس نے شہنشاہ
لاع بھیجی کہ راجہ رام موہن رائے۔ دبیر الدولہ۔ خواجہ فریدالدین خاں مرحوم کا دوست
۔ حقیقت یہ ہے کہ دبیر الدولہ کی حیات میں میں نے کبھی رام موہن رائے کا نام نہیں
ور نہ ان عرضیوں میں اس کا کبھی کوئی ذکر آیا جو دبیر الدولہ نے شہنشاہ کی خدمت
گذاریں۔ اس لئے لازمی افضل بیگ نے جو خط دبیر الدولہ کی طرف سے منسوب
ہ خط دراصل جعلی تھا۔ یہ جعلسازی مرزا سلیم کے علم سے سوہن لعل۔ افضل بیگ
رام موہن نے کی ہے۔ شہزادہ کے دل میں ان شبہات کا پیدا ہونا محل کے سازشی
ں سے کچھ بعید نہ تھا۔ لیکن راجہ رام موہن کے متعلق شاہزادہ کے شبہات محض فرضی تھے
کا ثبوت بعد کے واقعات سے مل گیا۔ اس اثنا میں راجہ رام موہن رائے کو اس
لاع مل گئی اور انھوں نے ایک خود دارانہ خط شاہزادہ کو لکھا جس میں انھوں نے
بے بنیاد الزام پر ملامت کی۔ شاہزادہ کو راجہ رام موہن رائے کا یہ غیر متوقع طرز
سخت ناگوار گزرا اور انھوں نے گورنمنٹ سے شکایت کی۔

بہرحال اپنے کردار کی صفائی کے بعد راجہ رام موہن رائے جہاز "البنی"
ار نومبر ۱۸۳۰ء کو انگلستان روانہ ہوئے۔ لارڈ ولیم بنٹنگ کو اپنے الوداعی خط
ھوں نے لکھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گذشتہ سیکریٹری مسٹر اسٹرلنگ کی چٹھی مورخہ

۱۵ر جنوری ۱۸۳۰ء اور دیگر وجوہ کی بنا پر میں عدالت ڈائرکٹران کے سامنے بحیثیت شہنشاہ اکبر ثانی کے سفیر کے نہیں جاؤں گا بلکہ ایک نجی حیثیت سے میں مطمئن ہوں کہ اپنی ذات کو اس خصوصی نوعیت سے علیحدہ رکھ کر جہاں پناہ کی خدمت اور جاں نثاری کے جو جذبات میں لے کر جا رہا ہوں اس میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی یہی نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ میری خدمات کو جن سیاسی شکوک اور رقابتوں کا خطرہ لاحق ہوتا ہے میں ان سے بری ہوں اور اس طرح کامیابی کا امکان اور قوی ہو جائے گا۔

۱۸ر اپریل ۱۸۳۱ء کو راجہ رام موہن رائے نے انگلستان کے ساحل پر قدم رکھا ان کی موجودگی سے انگلستان کے بلند خیال لوگوں کے دلوں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی بیان کیا جاتا ہے کہ وزراء سلطنت نے شہنشاہ کے سفیر کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا عدالت ڈائرکٹران کے ارکان نے راجہ رام موہن رائے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی بڑی تواضع کی راجہ رام موہن نے اپنی عرضداشت کو ڈائرکٹران اور بورڈ آف کنٹرول دونوں کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ عرصہ تک گفت و شنید ہوتی رہی چونکہ ارباب حل وعقد دوسرے امور میں منہمک تھے اس لئے عرصہ تک اس معاملہ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ کورٹ آف ڈائرکٹران کا فیصلہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ۱۳ر فروری ۱۸۳۳ء کو بھیج دیا گیا۔ شہنشاہ دہلی کا وظیفہ بڑھانے پر غور و خوض کے بعد کورٹ نے لکھا

ہماری یہ ہرگز نیت نہیں کہ ہم ان مختلف نکات کو زیر بحث لائیں جو اس مسئلہ کی تحریک کے سلسلہ میں پیدا ہوئے ہیں اور ایک حق بجانب اور اطمینان بخش فیصلہ کے راہ میں حائل ہیں اور انھوں نے ۳ لاکھ روپیہ سالانہ کے اضافہ کو اس شرط پر منظور کر لیا کہ شہنشاہ دہلی کے ہر قسم کے دعوی اس کے بعد ختم ہو جائیں۔ اس اضافہ کی تقسیم

کا طریقہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا لیکن دوسرا مسئلہ بادشاہ کے آداب والقاب سے متعلق تھا اس پر کورٹ نے بالکل سکوت اختیار کیا ـــــــــ

بہرکیف کورٹ کے فیصلہ کی اطلاع گورنر جنرل کے ایجنٹ متعینہ دہلی کو فوراً بھیج دی گئی تاکہ وہ بادشاہ کو مطلع کردیں اگر وہ اس فیصلہ کو منظور کرلیں تو اپنی منظوری کے سلسلے میں ایک راضی نامہ لکھ دیں۔ ایجنٹ کو یہ ہدایت کی گئی کہ اضافہ کی رقم کو خاندان شاہی کے اراکین کے درمیان تقسیم کرنے کی مناسب تجویز اور طریقوں کے متعلق اپنی رائے اور ارکانِ شاہی کی فہرست مرتب کرنے کا حکم دیا گیا۔

کورٹ کا فیصلہ اکبر شاہ ثانی کو پسند نہ آیا انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کو راجہ رام موہن رائے کے بیانات کا انتظار تھا جن کی کوششوں کا نتیجہ اس فیصلہ سے مختلف ہونے کی اُمید تھی۔ مگر گورنمنٹ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بادشاہ سلامت اضافہ سے انکار کر رہے ہیں اور اس لئے یہ اطلاع کورٹ کو بھیج دی گئی اسی اثنا میں بادشاہ کو راجہ رام موہن رائے کا مراسلہ ملا جس میں بادشاہ کو رائے دی گئی تھی کہ وہ جو کچھ ان کو دیا گیا ہے نامنظور کر دیں۔ کورٹ کے فیصلے سے راجہ مطمئن نہ تھے۔

راجہ پارلیمنٹ کے سامنے اس مسئلہ کو رکھنا چاہتے تھے اور گمان تھا کہ وہ انصاف کو بروئے کار لے آئینگے مگر راجہ خود موت کے دست ظلم کا شکار ہوا بادشاہ کی ساری مساعی پر یک لخت پانی پھر گیا"۔

اب امیدوں کا خاتمہ ہو چکا تھا اور قرضخواہ تقاضہ کر رہے تھے۔ مجبوراً چاروناچار بادشاہ نے کورٹ کے فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا پریذیڈنٹ

کو مزید ہدایت کی کہ بادشاہ کی منظوری فیاضانہ عطیہ کی غیر مشروط طور پر حاصل کر کر انگلستان بھیجدی جائے۔

بادشاہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اضافہ اس وقت سے دیا جائے جبکہ گورنمنٹ کی پہلی اطلاع موصول ہوئی تھی مگر جواب ملا کہ بغیر کورٹ کے حکم کے تعمیل نہیں کی جاسکتی شہنشاہ کی منظوری موصول ہوتی کورٹ آف ڈائرکٹران کو اس کی اطلاع دیدی گئی اور اس کے احکام کا انتظار ہونے لگا اسی دوران میں بادشاہ کی غیر مشروط منظوری اور تحریری راضی نامہ کے بعد ان سے ایک فہرست خاندان شاہی کی طلب کی گئی جن کے لئے یہ اضافہ منظور کیا گیا تھا مگر لطف یہ کہ وہ بھی مسترد کردی گئی البتہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے اپنی طرف سے ایک فہرست بھیجی جس میں بادشاہ اور ان کے شاہزادگان اور بیگمات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا یہ صورت بادشاہ سلامت کے نزدیک انتہائی نامنصفانہ تھی[ل]۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ نے اضافہ لینے سے قطعاً انکار کر دیا اور راضی نامہ کی واپسی چاہی اس سے پہلے بادشاہ نے گورنر جنرل کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک مراسلہ لکھا تھا لیکن بے سود معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔

وفات | جمعہ ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء کو بعمر ۸۲ سال قلعہ میں انتقال کیا۔

ان کے باپ کی طرح ان کی وفات پر بھی تینوں پریسیڈنسیوں سے ان کے اعزاز میں ۸۲ ضرب توپیں سر کی گئیں۔

اکبر شاہ کے عہد کے انگریزی عہدہ دار | ناظم الدولہ سیٹن صاحب بہادر ہر سال امرائے دہلی کی

ل دیباچہ راجہ رام موہن رائے مترجمہ مولوی سراج الحق ایم۔اے۔ علیگ (مصنف)

دعوت بڑے پیمانہ پر کرتے اس کے بعد محفل رقص و سرود بپا ہوتی کسی نے اس کے وصف میں کہا ہے

ناظم الدولہ در لباس سیاہ نظرے کن درین چہ باریکیست
بہر خلق است او چو آب حیات آب حیواں درون تاریکیست

جنرل اختر لونی کا بڑا دور دورا تھا پالکی پر نکلتے تھے آگے نقیب بالفاظ دولت زیادہ نواب نامدار سلامت بلند آواز کے ساتھ ہوتا جس جگہ اترتے تھے صدائے دولت شاد دشمن پائمال کی ہوتی تھی۔

مرشد اکبر شاہ ثانی

بیعت مولانا فخر الدین سے اکبر شاہ ثانی بیعت تھے
شجرۃ الانوار میں لکھا ہے

"حضرت ظل سبحانی محمد اکبر شاہ .... باعتقاد تمام مریدآں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند بعضے فرزندان و متعلقان خود را نیز مرید کنانیدند"

سخاوت اکبر شاہ ثانی میں جہاں عشرت نوازی تھی وہاں سخاوت بے حد اور غربا پروری کرتے تھے۔ بڑھاپے میں لیتے دیتے زیادہ تھے ایک دن حضرت سلطان جی کی فاتحہ خوانی کو گئے تخت رواں پر سوار درگاہ میں پہنچے ایک درویش صورت شخص نظر پڑا اس نے بادشاہ سلامت کو دیکھتے ہی السلام علیکم کہا بخندہ پیشانی سلام کا جواب دیا اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا انھوں نے بھی ہاتھ بڑھایا اتنے میں تخت رواں جنتی کوچہ میں داخل ہوا ہمراہی آگے پیچھے ہو گئے درویش نما شخص لپٹا ہوا ہاتھ

میں ہاتھ لئے ہوئے چلتا رہا اور انگشتری ہیرے کی اتارنے کی کوشش کی بادشاہ نے ہاتھ ڈھیلا کر دیا مگر چھنگلی میں سے انگشتری اُتری نہیں بلکہ چھنگلی میں درد ہونے لگا ہاتھ کھینچ لیا مزار پر حاضری دیکر فاتحہ خوانی کے بعد قلعہ لوٹ آئے ناظر کو حکم دیا ایک ہزار روپیہ لے کر حضرت سلطان جی فوراً جاؤ اس شکل و صورت کا درویش ملے گا اس کو میری جانب سے نذر کرنا ناظر حسب الحکم گیا وہ شخص رخصت ہو چکا تھا واپس آکر بادشاہ سلامت سے عرض کیا درویش کا پتہ نہ لگا بادشاہ نے کہا افسوس اس کی قسمت میں نہ دس ہزار کی انگشتری تھی اور نہ ایک ہزار روپیہ چھنگلی پر ورم آگیا تھا تین چار روز اس کی تکلیف اٹھائی۔[۱]

مذہبی حالت | اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کامل طور سے اکثر شعائر اسلامی ختم ہو گئے[۲] مشرکانہ رسوم اور بدعات ساری جاری تھیں۔

نکاح کا طریقہ شرعی ختم ہو چکا تھا شاہ عالم کے عہد سے قلعہ میں جتنے نکاح ہوتے تھے نہ وہاں قاضی کی ضرورت تھی نہ نکاح خواں کی اور نہ کسی وکیل کی نہ ایجاب و قبول کی محل میں ڈال لینے کا نام ہی نکاح تھا۔[۲]

اسلامی سنت ختان کو یک قلم اٹھا دیا گیا تھا تاکہ غیر جنسیت کا خیال تک نہ آنے پائے۔

راج کماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں تلک لگاتی تھیں پھر پرنام کرتی تھیں۔[۳] سیتلا کی پوجا کا رواج انھیں راجپوتنیوں کے طفیل سے آیا۔ اکبر شاہ ثانی کی بیوی ملکہ بابی جی کے

---

[۱] نتائج المعانی [۲] تذکرۂ عالم صفحہ ۱۶۳ [۳] امرائے ہنود صفحہ ۵۰

بن سے ابوظفر تھے[1] ان کی کارفرمائیاں کیا کچھ کم نہ تھیں۔

قلعہ میں قرآن شریف کے بجائے دیوان حافظ کی تلاوت ہوتی تھی اس کی غزلیں گائی جاتی تھیں اس کے اشعار پر حال آتا۔ سارے قلعہ میں سورہ یٰسین کا نام تنالوذی سورہ رکھا گیا تھا کوئی نام نہیں لیتا تھا[2]۔

ہر بیگم کا کمرہ طبلہ و سارنگی و بنت عنب کا گہوارہ تھا لطف یہ ہے کہ جو قلعے میں گیا شہزادیوں اور شہزادوں کے زمرے میں داخل ہو گیا ماما اصیلن یہاں تک کہ کنیاں بھی چند روز کے بعد شہزادیاں بن جایا کرتیں اس سے بڑھ کر یہ لطیفہ تھا کہ شہزادے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جمع ہوتے اور رنگ برنگ کے ڈنڈے آپس میں لڑایا کرتے تھے[3]

شاہ عالم کے عہد سے تعزیہ داری کا زور تھا مرہٹوں کے تغلب و استیلا سے مشرکانہ رسوم بہت جاری و ساری تھیں

بادشاہ اور ان کے اہل خاندان میں مذہب سے اتنا لگاؤ رہ گیا تھا سالانہ جامع مسجد کے تبرکات اکبر شاہ ثانی کے لئے قلعہ لیجائے جاتے انھیں آنکھوں سے لگایا جاتا اور خدام کو انعام و اکرام مل جاتا۔

شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ شاہ عبدالغنیؒ کے صاحبزادہ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اپنے باپ اور چچا سے کم عمری میں فارغ التحصیل ہوئے ہر ایک علم و فضل کا درخشندہ آفتاب و مہتاب تھا۔ قوم کی حالت بگڑی ہوئی دیکھی اصلاح کا ارادہ کیا۔ پہلی مہم بدعات و محدثات کے خلاف تھی اور آپ نے حقیقی اسلامی توحید کا نقشہ پیش کیا اور مسلمانوں کی ناگفتہ بہ طرز معاشرت کی دھجیاں اڑائیں اور ارباب دہلی کے اوباشانہ طریقوں کو آشکار کیا

---

[1] بلی صفحہ ۹۰ [2] تذکرہ عالم ہ ۲۵۴ و ۶۰ ہ [3] ایضاً

عوام تو عوام علماء بگڑ بیٹھے مگر شاہ صاحب کی عملی زندگی نے ان کے لیے کامیابی کا راستہ کھول دیا۔ سکھوں کی چیرہ دستیاں بڑھی ہوئی تھیں اور ان کے مظالم کی کوئی حد نہ تھی اکبر شاہ ثانی میں سکت نہ تھی جو اس سیلاب کو روکتے۔

شاہ صاحب نے اپنے چچا سے مظالم کی داستانیں سنی تھیں اس زمانہ میں مولانا سید احمد بریلوی دہلی آگئے شاہ صاحب اُٹھے بیعت کی اور علماء کے مشورہ سے مجاہدین کے لشکر کی تیاری کرنی شروع کر دی ۱۸۲۶ء میں جہاد کے لئے روانگی عمل میں آئی۔ تھانیسر۔ مالیر کوٹلہ۔ ممدوٹ۔ بھاولپور۔ حیدر آباد سندھ۔ جان گڑھ ہوتے ہوئے قندھار گئے۔ پھر کابل آئے درۂ خیبر سے پنجاب آئے راستہ میں امیر دوست محمد خاں کے بھائی نے بیعت کی اکوڑہ پر سردار بدھ سنگھ دس ہزار فوج لئے کھڑا تھا آپ نے اعلان نامہ دربار لاہور کے نام بھیجا بعد ازاں جنگ ہوئی سو سکھ مارے گئے ۲۷ مجاہدین شہید ہوئے۔ غرضکہ بہت سی جنگیں سکھوں سے متواتر ہوئیں مولانا عبدالحئی نے ۱۲۲۶ھ میں بمقام پنجتار انتقال کیا۔

سکھوں سے مقابلہ تھا ہی اتمان زئی اور درانی آڑے آئے جنگ زیدہ میں سرحدیوں کو شکست دینے کے بعد مردان پر قبضہ کر لیا یار محمد خاں کے بھائی سلطان محمد خاں نے سید صاحب سے معافی مانگ لی اس کو پشاور عطا کیا مگر سلطان سے بے وفائی کی اور آپ بالاکوٹ معہ مجاہدین کے آگئے سردار شیر سنگھ نے کثیر لشکر سے مقابلہ کیا اس میں شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی شہید ہوئے راجہ شیر سنگھ نے ان شہدا کو اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ اس واقعہ کے بعد صرف ۸۰۰ غازی باقی تھے۔ شیخ ولی محمد بقیہ گروہ کے سردار مقرر ہوئے اور سرحد میں رہ گئے۔

علمی دور صدر | اکبر شاہ کا زمانہ علمی اعتبار سے بہت اچھا تو نہ تھا پر غنیمت تھا یہ ضرور ہے اکبر شاہ کی طرف سے کوئی درسگاہ قایم نہ تھی نہ علماء کو بیش قرار وظائف دے جاتے یہ بڑا شرمناک واقعہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں عے روپیہ ماہوار نذرانہ پیش ہوا اور اپنی چہیتی کسبی "شکر لب" کو تین سو روپیہ ماہوار دئے جاتے مگر دلی اس عہد میں خاندان شاہ ولی اللہؒ کی وجہ سے مرجع اہل علم بنا ہوا تھا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ عبدالقادرؒ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے درس جاری تھے دور دور سے طلباء علمی استفادہ حاصل کرنے آتے ان کی عمریں اختتام پر پہنچ گئی تھیں اس عہد میں صدر الصدور کے عہدے پر مولانا فضل امام خیر آبادی ممتاز تھے اپنے فرائض ملازمت کی ادائیگی کے بعد منتہی طلبا کو معقولات کا درس دیا کرتے۔ ایک طرف علوم نقلیہ اور دوسری طرف علوم عقلیہ کی اشاعت عام تھی یہ ضرور ہے کہ بادشاہ کی ناقدری سے اہل علم دلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ رام پور چلے گئے۔ مگر پھر بھی تھوڑے بہت علمی چرچے تھے مولانا فضل امام نے دلی میں "مرقات" لکھی اور "افق المبین" پر حاشیہ چڑھایا۔ اس کے علاوہ ان دنوں اردو شعر و شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ بادشاہ سلامت کو بھی کچھ اس سے دلچسپی تھی خود بھی کہہ لیا کرتے شعاع تخلص تھا

دلی اس زمانہ میں آج کی ایسی دلی نہ تھی گو اجڑ گئی تھی بڑے بڑے صاحبان کمال مرہٹہ گردی سے عاجز آکر دلی چھوڑ گئے تھے اس پر بھی میر درد سودا درد کے تلامذہ نے دلی کی آبرو بڑھائے رکھی۔ سید محمد میر اثر۔ حکیم قدرت اللہ قاسم۔

؎ تذکرہ عالم از مولوی رحیم بخش دہلوی صفحہ ۲۵۹

حضرت نصیرالدین نصیرؔ، میر نظام الدین ممنون دہلی جیسے شہر میں ان کی شاعری کا سکہ رائج تھا اکبر شاہ بادشاہ نے فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا[۱] ایسے ایسے ارباب کمال کا یہاں جمگھٹا تھا اور شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ یہ ضرور ہے لکھنؤ کی گنگا جمنی لہریں یہاں کے شعرا کو لبھا کر وہاں ہاتھ دھونے پہنچا دیتی تھیں مگر وضع دار لوگ دلی سے جانا عار سمجھتے تھے شیخ ابراہیم ذوق بھی اکبر شاہ کے دربار میں قصیدہ لے کر پہنچے ولی عہد ابو ظفر کے شاعری میں نگران بنے۔ اور قصیدہ کے صلہ میں خاقانی ہند کا خطاب عنایت ہوا

اکبر شاہ کا آخری عہد تھا اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ مولانا فضل حق۔ مرزا غالب۔ حکیم مومن خاں مومن سے حضرات کی جوانی تھی ان حضرات کے کارنامے عہد ابوظفر سے وابستہ ہیں

علمائے عہد | مولانا فضل امام فاروقی ابن قاضی ارشد بندہ قاضی صدر الدین ہرگامی مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی تلمیذ رشید ملا وہاج الدین گوپاموی سے اخذ علوم عقلیہ و نقلیہ کیا۔

"بمنصب صدر الصدوری شاہجہاں آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت"

میرزاہد رسالہ میر زاہد ملا جلال پر حاشیے لکھے

"در علوم عقلیہ سبقت ربودہ"[۴]

پنجم ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ کو انتقال کیا[۵]

---

[۱] گل رعنا صفحہ ۲۷۹ [۲] غدر کے چند باغی علماء [۳] ایضاً [۴] تذکرہ علماء ہند صفحہ ۱۶۲-۱۶۲
[۵] ایضاً [۶] ایضاً

مولوی کرم اللہ محدث دہلوی آپ اہل ہنود سے تھے مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے دست حق پرست پہ داخل اسلام ہوئے اور علوم اسلامیہ کی تکمیل کی شاہ غلام علی دہلوی سے خرقہ خلافت پایا ۱۲۵۹ھ میں انتقال ہوا۔[1]

مولانا رشید الدین خاں دہلوی ارشد تلامذہ مولانا رفیع الدین دہلوی سے تھے ابجد العلوم میں نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں

كان فاضلا جامعا بين كثير من العلوم الدراسية[2]

مولوی رحمٰن علی تذکرہ علمائے ہند میں تحریر کرتے ہیں

"ذہن وقار و طبع نقاد و در علم کلام کمالے وافر داشت"[3]

شوکت عمر یہ یادگار سے ہے ۱۲۴۹ھ میں انتقال کیا۔

مشائخ | حضرت مولانا شاہ ابوسعید متوفی ۱۲۵۰ھ - مولانا شاہ احمد سعید - مولانا شاہ عبدالغنی۔ شاہ محمد آفاق متوفی ۱۲۵۲ھ حاجی علاء الدین احمد ہمدانی مولانا قطب الدین متوفی سنہ ۱۲۰۱ھ۔ حضرت شاہ غیاث الدین متوفی ۱۲۴۴ھ۔

سید شاہ صابر بخش چشتی ابن شاہ نصیر الدین ابن شاہ غلام سادات چشتی بعمر ۶۳ سال ۱۲۳۲ھ میں انتقال کیا دریا گنج میں مزار ہے

میران شاہ نانو بندہ شیخ جلال الدین تھانیسری حریم مسجد فتحپوری میں عمر گذاری ۱۲۶۱ھ میں انتقال ہوا۔ شاہ جلال آپ کے سجادہ نشین تھے۔

مولانا محمد حیات پنجابی سید شاہ صابر بخش کی خانقاہ میں درس وتدریس کا مشغلہ رکھا ۱۲۶۴ھ میں انتقال ہوا شاہ فدا حسین نبیرۂ خواجہ یوسف ہمدانی متوفی ۱۲۵۹ھ

---

[1] ذکر علما از مولوی اکرام اللہ گوپاموی [2] ابجد العلوم صفحہ ۹۱۷ [3] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۶۳

شاہ توکل حسین متوفی ۱۲۶۲ھ سید عسکری مجذوب مہر قطبی مجذوب شاہ عبدالغنی مجذوب

حکماء۔ حکیم صادق علی خاں ابن حکیم شریف خاں سرآمد حکمائے روزگار سے تھے اکثر اطبائے نامی ان سے نسبت شاگردی سے سرمایۂ اعتبار رکھتے ہیں۔

حکیم امام الدین خاں۔ حکیم غلام حیدر خاں۔ حکیم نصر اللہ خاں۔ حکیم فتح اللہ خاں۔

حکیم پیر بخش خاں فاروقی محمد اکبر شاہ کی پیشگاہ عنایت سے حکیم دوراں خاں کے خطاب سے مشرف تھے۔ حضرت صہبائیؔ کے بھائی تھے۔

حکیم غلام حیدر خاں شاگرد حکیم شریف خاں ۱۲۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

یہ ہے اکبر شاہ ثانی کے عہد کی پوری تصویر۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے معلومات کا گنجینہ

ہندوستان کی بارہ سو سال کی اسلامی تاریخ کے معلومات بیحد منتشر اور پراگندہ ہیں، انھیں سے کسی حصہ کو مرتب کرنے کے لئے، تاریخ، سیر و سوانح، تصوف، ملفوظات نثر و نظم کی قلمی و مطبوعہ کتابوں کے ہزاروں صفحات پڑھنے کی ضرورت ہے پھر بھی پوری کامیابی مشکل ہے مولانا حکیم سید عبد الحئی رحمۃ اللہ علیہ مصنف گل رعنا و تاریخ گجرات نے پچیس۲۵ سال کے انہاک و محنت سے ان معلومات کو اپنے عربی تذکرہ مشاہیر ہند کی ۸ آٹھ جلدوں میں یکجا کر دیا ہے، اس عظیم الشان کتاب کا جس کا نام "نزہۃ الخواطر" ہے پہلا حصہ (جس میں پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک کے مشاہیر و اہل فضل کے حالات ہیں) خوبصورت عربی ٹائپ میں شائع ہو گیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے ملک اور اپنے اسلاف کی اسلامی تاریخ سے ناواقفیت کا وہ نقص دور ہو جاتا ہے جو علمی و دینی حلقوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ قیمت:- تین روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ اسلام ۳۴ گوئین روڈ لکھنؤ

ادبیات

نعت

ب دعائی خیرآبادی) ہیڈ ماسٹر ہائی سکول پینے پور

محمد مصطفیٰ کا جب کسی سے نام سنتے ہیں
سکونِ قلب کا گویا [illegible] پیغام سنتے ہیں

نویدِ جنت الفردوس صبح و شام سنتے ہیں
جو دل سے مدحتِ پیغمبرِ اسلام سنتے ہیں

الٰہی کیسی پُرانوار گلیاں ہیں مدینہ کی
خداوندا! انھیں دیکھا نہیں ہے نام سنتے ہیں

درِ محبوب پہ پہنچیں یہی ارمان ہے دل میں
مریضِ عشق پاتا ہے وہاں آرام سنتے ہیں

وہ یاد آتے ہیں تو اک ہوک سی اُٹھتی ہے ہائے ہائے
کلیجہ تھام لیتے ہیں جب اُن کا نام سنتے ہیں

غزل

محمد مصطفیٰ خاں خلش خورجوی

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

سہے لاکھوں ستم لیکن نہ کی آہ و فغاں اب تک
زباں رکھتے ہوئے بھی ہم رہے ہیں بے زباں اب تک

بیاباں ہے برابر سوگوارِ بوستاں اب تک
کہ نوکِ خار پہ ہیں اشکِ شبنم کے نشاں اب تک

شہنشاہِ دو عالم وہ مکینِ گنبدِ خضرا
ملائک چومتے ہیں جس کا سنگِ آستاں اب تک

خدا جانے کہ ایسا کون ہے آوارۂ منزل
کہ جس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے گردِ کارواں اب تک

نشانِ بزمِ عشرت ہے اگر باقی تو اتنا ہے
کہ شمعِ کشتۂ محفل سے اُٹھتا ہے دھواں اب تک

زمانہ جاگ اُٹھا بڑھ گئیں قومیں بہت آگے
یہاں ہیں خوابِ غفلت کی وہی سرشاریاں اب تک

جہاں میں ایک دو کیسے، ہزاروں انقلاب آئے
ہماری عظمتوں کے پھر بھی باقی ہیں نشاں اب تک

زمانہ جانتا ہے جو چمن والوں پہ گذری ہے
زباں لیکن نہیں ہے شکوہ سنجِ باغباں اب تک

تعارف بزم سے اپنا کرائیں کیا خلش کہہ کر
کہ دنیائے سخن میں ہم ہیں بے نام و نشاں اب تک

تبصرے

نئی روشنی (ہفت روزہ جریدہ) ادارۂ تحریر ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، مولوی عبد اللطیف اعظمی۔ ضخامت صفحات ۱۲۔ قیمت سالانہ ہے، تقطیع اوسط۔ ملنے کا پتہ دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی۔

دہلی سے نئے دن روزانہ اور ہفت روزہ اخبار نکلتے ہی رہتے ہیں لیکن نئی روشنی اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ یہ اخبار بدلے ہوئے حالات کے مطابق ملک و ملت کی صحیح رہنمائی و خدمت کا فرض بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ ہفتہ بھر کی "ہندوستان" "پاکستان" اور "باہر کی دنیا" کی ضروری خبروں کے خلاصے اور ملکی و غیر ملکی اہم معاملات و سیاسی مسائل پر مبصرانہ نقد و تبصرہ کے ساتھ مختلف النوع تاریخی، سیاسی، علمی، ادبی معلومات و دلچسپ منظومات بھی پیش کرتا ہے۔ بزم بے تکلف و نکاہات، پڑھنے کی چیز ہے۔ مگر اس کے بعض مزاحی مضامین مثلاً قینچی ایسے اچھے اخبار کی ثقاہت کو زیب نہیں دیتے۔ اس اخبار کا مطالعہ اور اس کی اعانت اصحاب ذوق اور ملک و ملت کے بہی خواہوں کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔ "ش"

تذکرہ

بسلسلۂ برہان ماہ جنوری ۱۹۴۹ء صفحہ ۵۸

مولوی قطب الدین گوپا موی تبحر در علوم ادبیہ و اصول خوب میداشت۔ در علم و فضل مسلّم روزگار بودہ شاگرد ملا قاضی شہاب گوپا موی است"۔ اس کا نمبر ۲۹ ہے ملا وہاج الدین گوپاموی ان کے بعد ہیں۔ **تصحیح اغلاط مضمون آمدنامہ** برہان ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۲۶

سطر ۷ شمس الحق کے بجائے شمس العلماء پڑھا جائے۔

" ۹ گوپاموی کے بجائے گوپاموی پڑھا جائے۔

بُرہان

جلد بست ودوم   شمارہ (۶)

جون ۱۹۴۹ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

پچھلے دنوں ایک امریکن نامہ نگار جو آج کل ایشیا کے ملکوں کا دورہ کر کے وہاں ک
مختلف تحریکات اور عوام کے احساسات و جذبات کا مطالعہ کر رہے ہیں بزمانۂ قیام کلکتہ
از راہِ کرم راقم الحروف سے بھی ملنے آئے اور دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو کرتے اور جو کچھ
میں کہتا رہا لکھتے رہے اس گفتگو سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ پھر دوبارہ انھوں نے گرا
ہوٹل میں ڈنر پر مدعو کیا اور وہاں کھانے کے بعد رات گئے دیر تک اُن سے گفتگو رہی اثنا
گفتگو میں انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ "اگر آپ کو امریکہ کی کسی یونیورسٹی کی طرف سے" "اسلا
کے نئے رجحانات" پر چند لکچروں کے لئے مدعو کیا جائے تو کیا آپ منظور کر لیں گے" م
نے عرض کیا چشم ما روشن دل ما شاد، مگر شرط یہ ہے کہ تاریخ مقررہ سے کم از کم چھ مہینے
پہلے مجھ کو اطلاع دی جائے تاکہ میں لکچر اطمینان سے تیار کر سکوں پھر خط و کتابت بھی
ہند کے ذریعہ ہونی چاہئے۔

موصوف سے گفتگو کے اثنا میں یہ معلوم کر کے میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ مو
مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مجددانہ افکار سے بڑی حد تک واقف
اور اُن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں مولانا کے افکار کے سلسلہ میں موصوف کے ذہن
ایک بڑی الجھن یہ تھی کہ مولانا ایک طرف قومیت بربنائے ملک و وطن پر بہت زور
ہیں اور دوسری جانب پوری دنیا کے لئے ایک وفاقی نظام کے قائل ہیں۔ یہ دونوں
کس طرح جمع ہو سکتی ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں

اب بھی ہو رہا ہے مختلف ملکوں میں مختلف قومی حکومتیں قایم ہیں لیکن اس کے باوجود یہ سب انجمن اقوام متحدہ کی ممبر ہونے کی حیثیت سے اس انجمن کے چارٹر کو مانتی ہیں اور اس کے لئے انجمن کے سامنے جواب دہ ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اس چارٹر کی حیثیت کسی درجہ میں سیاسی ہے ورنہ دراصل وہ ایک اخلاقی معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا سوویٹ روس کو دیکھئے کہ اس کے ماتحت متعدد جمہوریتیں قایم ہیں جو اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہیں اور صرف معاشی اور اقتصادی نظام کے اعتبار سے سوویٹ روس کا جز ہیں پس سوویٹ روس میں یا انجمن اقوام متحدہ کے زیر اثر مختلف قومی حکومتوں میں جو باہمی ارتباط پایا جاتا ہے وہ ایک بہت محدود پیمانہ پر ہے مولانا اسی طرح کا ایک بین الاقوامی سنگھٹن یا ایک عالمگیر وفاقیت بہت وسیع پیمانہ پر قایم کرنے کے آرزومند تھے اور صرف اسی ایک چیز کو دنیا کے مصائب و آلام کے خاتمہ کا یقینی اور کامیاب ذریعہ جانتے تھے۔

مولانا کے ذہن میں قومیت کا جو تصور ہے وہ ہرگز جارحانہ یا جابرانہ نہیں ہے جس سے فاشزم پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان انسان کے درمیان نفرت و عناد کی سنگین دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں اور پھر یہی نفرت و عناد ہولناک جنگ کی شکل میں ظاہر ہو کر انسانیت کی بربادی و تباہی کا باعث بنتی ہے اس کے برخلاف مولانا کے نزدیک ایک قوم کی قومیت جو ملکی اور جغرافیائی خصائص کی بنیاد پر قایم ہو۔ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص کی اپنی ذاتی شخصیت اگر ایک شخص اپنی ذاتی شخصیت کو باقی رکھتے ہوئے بھی کسی ایک بڑی جماعت کا ممبر ہو سکتا ہے اور اس سے شخصیت اور جماعتی اشتراک میں کوئی تضاد یا تصادم پیدا نہیں ہوتا تو اسی طرح ایک قوم اپنے ملکی خصائص اور قومی رسوم و عوائد کو باقی رکھتے ہوئے بھی ایک عالمگیر انسانی برادری کا ممبر بن سکتی ہے ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

فرض کیجئے تمام انسانوں کے لیئے ایک ہی لباس اور ایک ہی زبان بن جائے تو قدو قامت اور جسم کی فربہی ولاغری کے باعث ایک ہی وضع کے لباس میں جو فرق و امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور یا مختلف آب وہوا کے اثر سے زبان کے عضلات میں جو فرق ہوتا اور لب ولہجہ میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے لباس اور زبان کی عالمگیر وحدت کی وجہ سے کیا یہ سب امتیازات فنا ہو جائیں گے ؟ ہرگز نہیں

انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل آپ کے خیال میں کیسا ہے ؟ میں نے کہا ہندوستان ہو یا کوئی اور ملک بہر حال ہر جگہ کے مسلمانوں کا مستقبل ان کے اپنے ہاتھ میں ہے وہ چاہیں اس کو بگاڑیں یا سنواریں ۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے ہاتھوں آتی ہے قرآن مسلمان کو کسی کے رحم وکرم پر جینا ہرگز نہیں سکھاتا وہ مسلمان میں خود اعتمادی کی روح اُجاگر کرکے یہ بتاتا ہے کہ انھیں اپنے ساتھ بھی انصاف کرنا چاہیئے اور دوسروں کے ساتھ بھی قرآن میں سب سے زیادہ بُرائی ظلم کی بیان کی گئی ہے اور ظلم کے معنی ہیں وضع الشئی فی غیر محلہ اور قرآن نے ہر شئے کا محل اور موقع بھی بتا دیا ہے اس کے علاوہ قرآن نے مسلمانوں کو ایک ایسا کیمیاوی نسخہ بھی عطا کر دیا ہے جس کے ذریعہ سنگدل سے سنگدل دشمن کو بھی موم اور دوست بنایا جا سکتا ہے پس اگر مسلمان اس نسخہ کو استعمال کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے لیے وہ ایک عام ہر دلعزیزی اور حقیقی عظمت وبزرگی کا مقام حاصل نہ کر سکیں ۔

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

(از جناب مولوی غلام ربانی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ))

ایم۔اے تفسیر کے لئے امتحانی مقالہ خاکسار نے جو تیار کیا تھا یہ مضمون اسی مقالہ سے ماخوذ ہے علاوہ دوسری عام کتابوں کے علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب اتقان اور الجزائری کی تبیان سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ حضرت الاستاذ مولانا مناظر احسن گیلانی کے درسی محاضرات داملائی سے تحقیق کی راہ میں غیر معمولی مدد ملی ہے عموماً اس مضمون میں سے نقاط نظر آپ کو اگر ملیں گے تو اسے حضرت الاستاذ ہی کا فیض خیال فرمائیے

"گر خار گر گل است ہمہ آوردہ تست" غلام ربانی

تاریخی طور پر اس کا متعین کرنا دشوار کیا بلکہ ناممکن ہے کہ نسل انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی کہاں اور کب ملی قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا

ہ میرے عزیز رفیق علم مولوی غلام ربانی ایم۔ اے عثمانیہ نے خاکسار کی تقریروں اور املائی محاضرات کو پیش نظر رکھ کر یہ مقالہ تیار کیا اور جب مجھے دکھایا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی مسرت ہوئی گو اس موضوع پر خاکسار نے خود ایک کتاب لکھی ہے لیکن بعض وجوہ سے شائع ہونے کے قابل اسکو میں نے نہیں پایا اس کتاب کے مضمون کا اور خاکسار کے خصوصی نقاط نظر کا بڑا اچھا خلاصہ یہ ہوگیا ہے اب اگر میری کتاب نہ بھی شائع ہو تو چنداں اسکی ضرورت بھی باقی نہ رہی اس موضوع پر عربی اور اردو میں بہت سی کتابیں لوگ لکھ چکے ہیں اہل علم اندازہ کریں گے کہ کن کن غلط فہمیوں کے ازالے کرنے کی کوشش اس میں کی گئی ہے کوشش کی کامیابی و ناکامی کا مدار اہل علم و۔

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لئے آتے رہے اور جس طرح خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی ارشاد باری ہے:-

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ	ہم نے تم پر وحی اسی طرح کی جیسے نوح پر اور نوح
نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ (مائدہ)	کے بعد پیغمبروں پر وحی کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ	ان پیغام لانے والوں میں سے بعضوں کا حال تم
وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ	سے ہم نے بیان کیا اور بعضوں کا حال نہیں بیان کیا ہے۔

بھی فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بد انجام کو علم وعمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لئے اور اس کی تشریح وتعلیم کے لئے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا	الدین یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے
وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ	دور میں بدلہ دیا جائے اسی کو قانون بنا کر جو تمہیں دیا
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا	گیا (یہی دین ہے) جس کی وصیت خدا نے نوح
الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (شوریٰ)	کو کی، اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اسی کی وصیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بصیرت کے فیصلہ پر موقوف ہے خاکسار نے اس مقالہ کو دیکھ لیا ہے اور بعض مقامات پر حواشی کے ذریعہ بعض جگہ اصل عبارت میں کچھ ترمیمیں بھی کردی گئی ہیں دین کی کوئی صحیح خدمت اس کوشش سے بن آئے تو یہی سب سے بڑا صلہ ہے۔ ۱۲۔ (مناظر احسن گیلانی)

ہم نے ابراہیم کو کی اور موسیٰ کو بھی و عیسیٰ کو بھی اسی

کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین

(اسی دستور کو قائم کرو اور اس میں مت بکھرو،

ایک اور مقام میں یہ فرما کر کہ

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ (المومنون)

کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء اولین (اگلے باپ دادوں) کو نہیں دی گئی تھی؟

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی تعبیر دین و مذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستور العمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوع انسانی کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لئے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک ہو تو شکل و صورت چہرہ و بشرہ رنگ و روغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص خطے میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گھرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے

بہرحال زندگی کا وہی دستور العمل جو ہمارے آباء اولین کو ملا تھا اصولاً اسی کا اعادہ اسی کی تجدید کا عمل پچھلی نسلوں میں بھی ہوتا رہا اسی لئے دین یا زندگی کا یہ دستور العمل پہلا ایک مشترک موروثی ترکہ ہے البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدرت کے عطا کئے ہوئے

اس امین کی حفاظت دنگرانی میں بوجوہ مختلف قومیں غفلتوں اور لاپرواہیوں کی شکار ہوتی رہیں خدا کی خالص تعلیم سے ہٹ ہٹ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خود تراشیدہ رسوم اور دستوروں میں لوگ الجھتے رہے مختلف زمانوں اور ملکوں میں زیادہ تر پیغمبروں کی ضرورت اسی عام تاریخی حادثہ نے پیدا کی یعنی جب خدا کی خالص تعلیم اور ہدایت نامہ سے لوگ ہٹ گئے تو پھر اسی موروثی آئین کہن کی طرف واپس کرنے کے لئے حق تعالیٰ قوموں اور امتوں میں رسولوں اور پیغمبروں کو پیدا کرتا اور اٹھاتا رہا۔

چاہیے تو یہی تھا کہ معقن کی شخصی وحدت اور جس کے لئے قانون بنایا گیا ان کی نوعی وحدت کی بنیاد پر لوگ اپنے اس موروثی قانون کو ایک ہی قانون کی حیثیت سے دیکھتے مگر تصدیق و توثیق، تصحیح اور تکمیل وغیرہ اغراض کے لئے متعدد پیغمبروں کا ظہور مختلف زمانوں میں جو ہوتا رہا یہ عجیب بات ہے کہ اسی ایک دستور العمل کے پیش کرنے والوں کے اس تعدد و کثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت سے ہیں۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانیوالوں کی وجہ سے کیا کتاب بھی چند ہو جائیگی یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند اڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی سماوی آسمانی کتابوں کا وہ آخری اور مکمل ترین اڈیشن ہے اور قوموں کے پاس اس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق صرف یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس جدید تازہ ترین اور کامل اڈیشن سے مقابلہ کرکے قومیں اپنی موروثی کتاب

کی تصحیح کرلیں۔ یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباء و اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے۔ یقیناً نہ قرآن میں ایسا حکم دیا گیا ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں نے ایسا کیا[1]۔ آج کروڑہا کروڑ

---

[1] اس سے اندازہ کیجئے کہ عبداللہ بن سلام صحابی رضی اللہ عنہ جو علماء بنی اسرائیل میں سے تھے جب رسول اللہؐ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انھوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں آپ نے فرمایا اقرء ھذا اللیلۃ وھذا اللیلۃ (یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص۲۶ ج اطبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلاء والجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں توراۃ ختم کرنے کا عام دستور اپنے لئے انھوں نے مقرر کرلیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے ابن سعد ج ۷ ص ۱۶۱

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی تصحیحی راہ نمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے انجیل و تورات خیر ان کا تو پوچھنا ہی کیا میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو میں وید کے بعض حصوں کا ترجمہ جو ہو گیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا یہی یجر وید کا ایک ٹکڑا تھا ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے پودوں میں سے نکالا ہوا تاریکی کو دور کرتا ہوا ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے ادھیائے[۱۲] گو بکتہ ہوئے کچھ دیر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ " تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا یا ہم ہیں اس کے اگانے والے (الواقعہ) قریب قریب اسی کے سورۂ یٰسین میں بھی ہے عام مفسرین عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کرتے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً اُن میں عیسائی یہودی اور اسی قسم کی دوسری مذہبی امتوں کے لوگ ہیں پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا توراۃ اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انھیں جھٹلا رہے ہیں یہ واقعہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن (قطعاً) کو مان کر حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقہ میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء و عناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث و واقعات نے ان کے دین کے جن حقائق و مسائل کو مشتبہ و مشکوک کر دیا تھا قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انھوں نے پایا اور شک و ریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں، قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پا لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گذشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلا خوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبائی دین کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے

بقیہ حاشیہ سلسلۂ صفحہ گذشتہ) لیکن بیچر وید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا ہے کہ کیوں نہیں قرآن کا بھی سدر درخت کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے نشو ونما کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے ۱۲ مناظر احسن گیلانی

بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور ان کی سچی تعلیم، صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے یہ واقعہ بھی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت و تبلیغ کا بھی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت و وفاق کے مرکزی نقطہ پر "وہ سمٹ کر لے آنا چاہتا ہے"

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی ذیلی گفتگو تھی میں آپ کے سامنے اس موروثی دین کی الہٰی کتاب کے آخری اڈیشن کے ان پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق بدبختی سے بداندیش دماغوں میں خواہ مخواہ بعض بے بنیاد وساوس و اوہام مختلف راہوں سے گھس پڑے ہیں یعنی قرآن مجید کی تدوین یا جمع و ترتیب کی جو واقعی سرگذشت ہے اسی کے متعلق ایک مختصر اجمالی بیان اُن لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو ناواقفیت کی وجہ سے ان ہی اوہام سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں بلاوجہ مبتلا ہیں۔

قرآن کی تدوین کی معتدبہ شہادتیں قرآن کی تدوین یا جمع و ترتیب کے متعلقہ سوالوں پر جن شہادتوں سے روشنی پڑسکتی ہے آسانی کے لئے ہم ان شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں یعنی شہادتوں کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جو خود اس کتاب کے اندر پایا جاتا ہے ہم اندرونی شہادتوں سے اس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا سلسلہ ان تاریخی روایات کا ہے جن سے اس کتاب کے تدوینی حالات کے جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے ہم ان کو بیرونی شہادتوں سے موسوم کریں گے پہلے ہم اندرونی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں

اندرونی شہادتیں واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے دُنیا کی ان تمام کتابوں میں جنہیں قومیں خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں قرآن ایک واحد کتاب ہے یعنی اپنے متعلقہ سوالات کے جوابات کے لئے وہ قطعاً ایک خود مکتفی ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اس سلسلہ میں اگر تاریخی روایات

کا ذخیرہ نہ کبھی ہوتا جب کبھی اس سلسلے میں قرآن کے متعلق جن امور کا جاننا ضروری ہے سب کے جواب کے لئے خود قرآن ہی کافی ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کا نازل کرنے والا کون ہے؟ کس پر یہ نازل ہوئی؟ کس لئے نازل ہوئی صرف ان سب بنیادی سوالوں کے جوابات جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اس کتاب میں جگہ جگہ موجود ہیں! حالانکہ اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں اگر کوئی جاننا چاہے تو وہ مشکل ہی سے ان سوالوں کا جواب معلوم کر سکتا ہے لیکن جو قرآن کی یہ عام باتیں ہیں اس لئے ان سوالوں پر بحث کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے قرآن کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں اس وقت صرف حسب ذیل سوالوں کا جواب پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ابتدائی حالت اس کتاب کی کیا تھی بالفاظ دیگر میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے عموماً خدا کی طرف منسوب ہونے والی دوسری کتابوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے ابتداءً زبانی یادداشتوں اور گیتوں یا بھجنوں کی شکل میں وہ رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں[1] اس باب میں قرآن کا کیا حال ہے ؟

---

[1] ہدیہ ہے کہ اس سلسلے میں کتابوں کے جس مجموعے کو دنیا کا قدیم ترین مجموعہ عموماً سمجھا جاتا ہے یعنی ہمارے ملک کی واکاشن بانی وید کے متعلق آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ قرآن مجید جو اس سلسلہ کی آخری کتاب ہے اس کے چھ سو سال بعد قلمبند ہوئی۔ البیرونی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ ہی دن پہلے ایک کشمیری پنڈت نے وید کو کتابی قالب عطا کیا ورنہ اس سے پہلے پشتہا پشت برہمنوں کا خاص طبقہ اس کو زبانی یاد کرتا چلا جا رہا تھا ڈاکٹر گپتا اپنی کتاب ہندی فلسفہ میں لکھتے ہیں کہ عموماً وید کے قلمبند کرنے کو زمانہ تک کفر سمجھا جاتا تھا ۱۲۔

ظاہر ہے کہ اس سوال کے حل کے لئے اوراق اُلٹنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ بقرہ ہی کی پہلی آیت ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے) اسی فقرے میں اس سوال کا جواب آپ کو مل جائے گا یعنی خود کتاب کا لفظ جس کے معنی نوشتہ اور لکھی ہوئی چیز کے ہیں اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش کرنے والا ابتدا ہی سے اس کو نوشتہ اور مکتوبہ کی شکل ہی میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ تقریباً قرآن شریف کی ہر بڑی سورۃ میں آپ کو کتاب ہونے کے اس دعویٰ کا مسلسل ذکر ملتا چلا جائے گا۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کفار عرب کا یہ فقرہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ

اَكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا — لکھ لیا ہے اس شخص نے (یعنی پیغمبر نے) اور وہی پڑھا جاتا ہے اس پر صبح و شام۔ (سورۃ فرقان)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام اور کھلی ہوئی بات تھی جسے وہ بھی جانتے تھے جنہوں نے اب تک اس کو خدا کی کتاب نہیں مانا تھا۔

ماسوا اس کے اس کتاب یا نوشتے کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا پیغمبر تو خود امی تھے لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے پھر کن لوگوں سے اس کو لکھواتے تھے آپ چاہیں تو ان سوالات کے جوابات بھی قرآن ہی میں تلاش کر کے پا سکتے ہیں مثلاً پہلا سوال یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا، اس کے لئے قرآن ہی میں پڑھیئے۔

وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ — قسم ہے (کوہ طور) کی اور لکھی ہوئی کتاب کی
رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور) — جو باریک جھلی کھلی ہوئی پر لکھی ہوئی ہے،

جب کہ معلوم ہے رق ایک خاص قسم کی باریک جھلی کو کہتے ہیں جو لکھنے کے کام کے لئے تیار کی جاتی تھی انگریزی میں جس کو (پارچمینٹ) (Parchemint) کہتے ہیں اور قدیم زمانہ کی تورات انجیل وغیرہ اسی پر لکھی ہوئی اب بھی ملتی ہے۔ قرآن یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کی کتابت بھی رق ہی پر ہوئی ہے اسی طرح اس کی خبر دیتے ہوئے کہ قرآن تو چونک پیدا کرنے والی ایک چیز ہے اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے کہ

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ — صحیفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے صحیفے جو مکرم
بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (عبس) — دمحترم ہیں پاک ہیں لکھے ہوتے ہیں ہاتھوں سے ان لکھنے والوں کے جو بڑے بزرگ اور پاکباز لوگ ہیں۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ قرآن صحیفوں میں لکھا جارہا تھا بلکہ اس کے لکھنے والوں کے ان اعلیٰ خصوصیات کا بھی اظہار کیا گیا ہے جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے اس قسم کی آیتیں پڑھتے ہیں مثلاً

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ) — نہیں چھوتے اسکو (یعنی قرآن) کو مگر وہی لوگ جو پاک ہیں[1]

---

[1] تفسیر فتح البیان ج ۹ ص ۲۸ میں دیکھئے "کتاب مسطور جو رق منشور میں لکھی ہوئی ہے اس سے مراد قرآن ہے ۱۲ -

مگر نہیں سوچتے کہ زبانی یادداشت کی شکل میں جو چیز ہوگی کسی حیثیت سے بھی یہ حکم یعنی مس اور چھونے کی ممانعت کا تصور اس کے متعلق کیا جا سکتا ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے مس اور چھوئے جانے کا بھی امکان تھا ورنہ ممانعت یقیناً ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

علاوہ اس کے تدریجی نزول یعنی وقفہ وقفہ سے قرآنی آیتیں جو اُتر رہی ہیں اور "جملۃ واحدۃ" یعنی ایک ہی دفعہ ان کو نازل نہیں کیا گیا اس کی وجہ بیان کی گئی کہ

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ — تاکہ ہم جمائیں اس طریقے سے اس کو تیرے دل میں

ظاہر ہے کہ تثبیت فی الفواد (یعنی زبانی یاد کرنے کا موقع) خود پیغمبر کو نزول کے اسی تدریجی طریقے سے بہ سہولت مل سکتا تھا پھر سورہ بنی اسرائیل میں

قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (اسرائیل) — قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کر کے ہم نے اتارا (یہ اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں پر وقفہ کے ساتھ اس کتاب کو تم پڑھو۔

اسی تدریجی نزول کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی کہ لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھنے کا موقع اسی طرح سے مل سکتا ہے گویا علاوہ پیغمبر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرآن شریف کے زبانی یاد کرانے کی بھی تدبیر ہو سکتی تھی اس تدبیر میں جو کامیابی ہوتی اس کی خبر دیتے ہوئے قرآن ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (عنکبوت) — بلکہ وہ یعنی قرآن، تو کھلی ہوئی واضح آیتوں کا مجموعہ ہے) جو ان لوگوں کے سینوں میں ہے جنھیں علم دیا گیا ہے

مطلب یہی ہوا کہ علاوہ کتابی قالب میں محفوظ ہونے کے صحابیوں میں اہل علم کا جو طبقہ تھا قرآن اطلاع دیتا ہے کہ ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ ہوتا چلا جا رہا تھا

نیز سورۂ مزمل کے آخری رکوع میں

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ — پس پڑھو جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن کو

کے حکم کو نافذ کرتے ہوتے اس واقعہ کا تذکرہ قرآن ہی میں کیا گیا ہے کہ پیغمبر ہی نہیں بلکہ پیغمبر کے صحابیوں کا ایک طائفہ بھی

أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ — رات کے دو تہائی یا آدھے یا دو تہائی حصہ میں

کھڑے ہوتے ہیں، اور قرآن کو دہراتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق

يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ — پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات میں بھی اور دن میں بھی

وغیرہ آیتوں میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ صبح و شام ان کا شغل اپنے یاد کئے ہوئے قرآن کا اعادہ اور تکرار تھا۔

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی کا سامان کتابۃً و حفظاً یعنی لکھ کر اور زبانی یاد کر کے جو کیا گیا تھا اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت ہے خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود اس کتاب کے تحفظ کرنے کا سامان اس حد تک کر چکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کو جو مختلف حوادث واقعات پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی میں انسداد کر دیا گیا تھا۔ سورۃ البروج میں ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ — کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں کی؟

(باقی آئندہ)

خلیفۃ الاعظم
امیرالمومنین عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ

(۳)

از جناب سید انوار الحق صاحب حقی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی لکچرر
(تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

شاہان لیون اور نوار کی خلیفہ کے دربار میں حاضری

خلیفہ ناصر اس وقت عیسائیوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اردونہ ثالث سے باعزت شرائط پر صلح منظور کرلی تھی ورنہ وہ اس سے کہیں زیادہ سخت اور تذلیل آمیز شرائط منوا سکتا تھا۔ مگر چونکہ سینکو نے بدعہدی کی اس لئے اپنی عزت و عظمت قایم رکھنے کی خاطر اس نے احمد کو یہ حکم دیا تھا۔

سینکو نہایت ہی مغرور و متکبر تھا اور جلد ہی اس نے اپنی رعایا کو بددل اور ناراض کر دیا۔ اس کی مطلق العنانی سے اہالی کلیسا اور امراء اس کے خلاف ہو گئے اور عوام اس کے مٹاپے سے جس کی وجہ سے اس کا چلنا پھرنا دوبھر تھا بددل تھے آخر قبائلی سرداروں کی مخالفت اور سازش سے مجبور ہو کر سینکو نے اپنی نانی طوطہ ملکہ نوار کے پاس جاکر پناہ لی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اسے دوبارہ لیون کا تخت دلائیگی لیون کا تخت دوبارہ حاصل کرنا آسان نہ تھا کیونکہ لیون میں سینکو کا کوئی بھی حامی اور طرفدار نہ تھا اور سلطنت نوار اتنی مضبوط اور طاقتور نہ تھی کہ ملکہ طوطہ تن تنہا

اپنے بل بوتے پر لیون کی تسخیر کا خواب بھی دیکھتی اس کام کے لئے اسے خلیفہ ناصر کے علاوہ کوئی دوسرا مددگار ومعاون نہ نظر آتا تھا جو اتنا طاقتور ہو کہ فتح وتسخیر کے بعد بھی سنکو کو تخت لیون پر برقرار رکھ سکے اور ساتھ ہی اس کے مٹاپے کا بھی علاج کرا دے جس وجہ سے اُس کی رعایا کی اپنے بادشاہ سے بددلی ونفرت دور ہو جائے کیونکہ لیون کے عوام جنگجو اور بہادر تھے جن کی سیر وتفریح شکار اور میدان جنگ کے علاوہ کچھ نہ تھی بقول اسکاٹ "جنگ ان کا پیشہ تھا اور جنگی مشقیں ان کی زندگی کا بہترین شغل اور لازمی جز تھیں ایسا طبیب حاذق جو سنکو کے مٹاپے کو دور کر دے صرف قرطبہ ہی میں مل سکتا لیکن خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر سے مدد مانگنے میں ملکہ طوطہ کی عزت وعظمت پر آنچ آتی تھی۔ پروفیسر ڈوزی کے الفاظ میں "ایسا سوال کرنے میں ملکہ کی عزت میں بٹہ لگتا تھا کیونکہ اسے ایک ایسے بادشاہ کے سامنے سائل بننا پڑتا تھا جس کو وہ کافر سمجھتی تھی جس سے تیس برس تک لڑائیاں ہوتی رہیں جس نے مشکل سے ایک سال بھی ایسا جانے نہیں دیا کہ جس میں ملکہ کے ملک اور مقبوضات کو غارت اور وہاں کے قصبات کو جلا کر خاک نہ کیا ہو۔ پس ایسے شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانا ملکہ کی طبیعت کے خلاف تھا لیکن نواسے کی محبت اور اس کو پھر تندرست اور صاحب تاج وتخت دیکھنے کی آرزو نے اسے بالکل مجبور کر دیا، نواسے کی مصیبتوں کے خیال سے طلب امداد میں اس بات کی غیرت نہ رہی کہ ایک مسلمان بادشاہ کے سامنے جس سے عداوت چلی آتی تھی درخواست پیش کرے۔"

خلیفہ نے ملکہ کی درخواست کو قبول کر لیا۔ اور سنکو کے علاج کے لئے شاہی طبیب حصدائی کو بھیجا۔ طبیب حاذق ہونے کے علاوہ حصدائی نہایت ہی شیریں

مقال فصیح بیان اور لایق و تجربہ کار سفیر بھی تھا۔ سینکو کے علاج کے علاوہ خلیفہ نے اس کے سپرد یہ فرض بھی کیا کہ وہ اس کی شرطوں کو ملکہ سے منوائے۔ خلیفہ کی دو شرطیں نہایت سخت تھیں اول تو یہ کہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے ملکہ طوطہ، اس کا بیٹا غرسیہ اور نواسہ سینکو قرطبہ آئیں اور دوسری یہ کہ لیون کی فتح کے بعد سرحد والے دس قلعے خلیفہ کے حوالے کر دئے جائیں گے پہلی شرط ملکہ کے لئے بہت سخت تھی۔ لیکن مجبوراً راضی ہوگئی اور اس طرح حصدائی کی شیریں کلامی اور دانشمندی کی بدولت مسلمانان اندلس نے اپنی تاریخ میں پہلی اور آخری بار یہ سماں دیکھا کہ ان کے قدیمی دشمنوں کے فرمانروا خلیفہ کے حضور میں حاضر ہو کر اس سے امداد و اعانت کے خواستگار ہوتے ہیں۔ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور ان کی خوشیوں کا اندازہ انہیں ان قصیدوں سے ہوسکتا ہے جو حصدائی کی تعریف میں لکھے گئے تھے۔

اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ ان کی حیثیت و مرتبت کے شایانِ شان سلوک کیا جس خوش اخلاقی اور خسروانہ فراخدلی سے وہ طالب و سائل بادشاہوں سے پیش آیا اس کے تمام یورپی مورخین مداح ہیں اسکاٹ کا کہنا ہے کہ "بہت سے پادریوں اور امراء کو لے کر تینوں عیسائی بادشاہوں نے اپنا سفر بصورت سفر شروع کیا جب یہ مسلمانوں کے ملک سے گذرے تو لوگ سخت تعجب کی نگاہ سے اس نئی بات کو دیکھتے تھے راستہ بھر ایک جم غفیر قطار در قطار کھڑا رہتا تھا۔ شہر اور قصبے ان کو دیکھنے کے لئے خالی ہو جاتے تھے۔ جس سے ان تینوں بادشاہوں کو راستہ چلنا مشکل ہو جاتا تھا قرطبہ میں جب پہنچے تو ان کا نہایت شان و شوکت سے استقبال کیا گیا جو ایسا تھا کہ جیسا کسی فتحیاب فوج کا کیا جاتا ہے نہ ایسا کہ جیسا کسی طالب و سائلِ تخت کا ہوتا ہے امیرالمومنین

کی خوش تدبیری نے جہاں تک ممکن ہوا اس استقبال کو ایسے رنگ میں رنگا کہ سانکوں کو اپنی توہین معلوم نہیں ہوئی۔"

پروفیسر ڈوزی لکھتے ہیں کہ "اس امر میں شبہ کی ضرورت نہیں کہ ناصر کے لئے یہ دن بہت ہی خوشی اور اطمینان کا تھا۔ وہ دیکھتا ہوگا کہ اس کے پرانے دشمن اور بدخواہ ردمیر ثانی فاتح شنت مانکش والخندق کا فرزند سنیکو اور وہ بہادر ملکہ جو لڑائیوں میں خود اپنی فوجوں کو خلیفہ کے مقابلے پر لاتی تھی اس وقت دونوں اسکے قدموں پر سر رکھتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات خلیفہ ناصر کے دل میں جو کچھ بھی ہوں لیکن کسی علامت سے اس نے انھیں ظاہر نہ ہونے دیا۔" اور بقول لین پول وہ "ان لوگوں سے بڑے تزک و احتشام اور ان ساری خوش اخلاقیوں کے ساتھ ملا جو اس کا خاصہ تھیں۔"

اپنے وعدہ کے مطابق خلیفہ نے سنیکو کی اپنی پوری طاقت سے مدد کی اور عربی فوجوں نے ۹۵۹ء میں لیون کا بڑا حصہ فتح کر کے اس پر سنیکو کی حکومت قائم کرادی اور ۹۶۰ء میں دار السلطنت پر قبضہ کر کے سارا ملک اسی کے قبضہ واقتدار میں کردیا یہ خلیفہ کی سب سے شاندار اور آخری کامیابی تھی کیونکہ اگلے سال ۱۶ اکتوبر ۹۶۱ء کو اس نے اس دار فانی کو ستر سال کی عمر میں خیرباد کہا۔

خلیفہ عبدالرحمٰن عادل۔ ترقی پسند اور روادار تھا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس نے اس فراخدلی، روشن خیالی اور منصف مزاجی سے حکومت کی کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ یورپ میں عیاشی، رشوت ستانی، جبر و تشدد اور ظلم و ستم کا دور دورہ تھا اسپین ان سے بری تھا جب یورپ میں مذہبی اختلافات پر رعایا زندہ آگ میں جلائی جاتی تھی اسپین میں وہ مسلمانوں کے دوش

بدوش امورِ سلطنت میں حصّہ لیتی تھی۔ غیرمسلم رعایا پر مذہبی روک ٹوک نہ تھی۔ اپنی عبادت گاہوں میں وہ اپنے طریقہ پر عبادت کرتے تھے۔ عالم اور فاضل کی قدر تھی۔ اس لئے بلا امتیاز مذہب وملت اعلیٰ عہدوں پر غیرمسلم فائز کئے جاتے تھے، خلیفہ کی دولت، طاقت، عظمت اور شان وشوکت یورپ اور افریقہ میں گھر گھر مشہور تھی اور ایشیا کے مسلم ملکوں میں بھی اس کا ذکر وچرچا ہونے لگا تھا۔

کارنامے | سلاطین اندلس میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کا درجہ سب سے بلند اور ممتاز ہے اور اس کا شمار دنیا کے مشہور فرمانرواؤں کی صفِ اول میں ہونا چاہیے۔ ڈوزی لکھتا ہے "جو کام اس نے کئے وہ کام نہ تھے بلکہ قریب قریب معجزے تھے۔ جس وقت وہ تخت نشین ہوا تھا تو تمام ملک بدنظمی وخانہ جنگی کا شکار ہو رہا تھا ہر طرف فتنہ وفساد برپا تھا سلطنت مختلف النسل لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی تھی جو شمال کے عیسائیوں کی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا شکار ہو رہی تھیں اور نوبت اس کے قریب پہنچ گئی تھی کہ ان ریاستوں کو کہیں تو لیون کے عیسائی اور کہیں افریقہ کے فاطمی ایک دن اپنا لقمہ نہ بنالیں باوجود بے شمار مشکلات کے عبدالرحمٰن نے اندلس کو اندلسی دشمنوں کے فساد اور بیرونی دشمنوں کی حکومت سے بچالیا .... اسپین میں اسلامی حکومت کو جو اعلیٰ رتبہ عبدالرحمٰن ثالث نے بخشا وہ کبھی پہلے اسے حاصل نہ ہوا تھا اس نے سلطنت میں امن واستحکام پیدا کیا بیرون ملک اس کی عزت اور وقعت قایم کی۔"

خلیفہ نے بیرونی دشمنوں کے مقابل اپنی طاقت کو بہت بڑھالیا تھا فاطمی خلفا در افریقہ کی طرف سے حملوں کی روک تھام کے لئے اس نے کیوٹا کے مقام پر ایک مستقل مستقر قایم کیا تھا۔ بحری جنگوں میں بھی وہ اپنے حریفوں کا ہمسر رہا شمال کی عیسائی

ریاستوں سے اُس نے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ اور اُن پر اپنی طاقت و عظمت کا ایسا سکہ جما یا تھا کہ وہ اب اُس کی مخالفت اور ہمسری کے دعوؤں کے بجائے اس کو اپنا مربی و سرپرست تسلیم کرنے لگی تھیں۔ اور ان کے معزول فرمانروا اس کے پاس اپنے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے آنے لگے تھے اس نے اندلس کو اغیار کی نظروں میں نہایت دقیع بنا دیا تھا اور دور دراز ملکوں کے سفیر خلیفہ کے دربار میں حاضری دیتے تھے۔ فرانس۔ جرمنی اٹلی اور قسطنطنیہ کے حکمران اس کو تحفے بھیجتے تھے اور اس کی دوستی اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے

دولت وحشمت | خلیفہ ناصر کے عہد میں تمام ملک خوش، فارغ البال، ترقی پذیر اور پرامن تھا۔ اس سے پیشتر اندلس کبھی اس قدر زرخیز و پرسکون نہ تھا۔ صنعت و حرفت عروج پر تھی۔ تجارت کو روزافزوں فروغ تھا۔ اور زراعت بارآور تھی رعایا خوشحال اور فارغ البال تھی۔ ملک کی مرفہ الحالی کا اندازہ اس کی آمدنی اور آبادی سے بخوبی ہوتا ہے عبدالرحمٰن کے عہد حکومت میں ملک کی آبادی تین کروڑ سے زیادہ تھی۔ بڑے بڑے شہروں کی تعداد اسّی تھی جن میں اشبیلیہ اور المیریا کی آبادی پانچ پانچ لاکھ۔ غرناطہ کی چار لاکھ پچیس ہزار۔ ملاغہ کی تین لاکھ۔ بلنسیہ کی ڈھائی لاکھ اور طلیطلہ کی دو لاکھ تھی چھوٹے شہروں اور قصبوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی۔ صرف وادی الکبیر ہی پر بارہ ہزار گاؤں بسے ہوئے تھے شہروں میں صفائی اور روشنی کا خاص انتظام تھا۔ سڑکیں پختہ تھیں اور ان پر دو رویہ لالٹینیں نصب تھیں گندے پانی کے لئے باقاعدہ نہایت چوڑی اور پختہ موریوں اور نالوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ حکومت کے علاوہ عوام بھی اس قدر صفائی پسند تھے کہ مورخین کا بیان ہے کہ انھیں بھوکا رہنا منظور تھا مگر گندگی اور غلاظت کو دور کرنے کے

لئے وہ آخری پائی تک صرف کر دیتے تھے۔ بقول لین پول جب "قرون وسطیٰ کے عیسائیوں نے نہانے دھونے اور پاک وصاف رہنے کو کافروں کی رسم سمجھ کر مردود قرار دے دیا تھا اور جب پادری اور پادرنیں اپنی گندگی کی فخریہ نشر واشاعت کرتی پھرتی تھیں یہاں تک کہ ایک عیسائیہ ولیہ نے تفاخراً یہ واقعہ قلمبند کیا ہے کہ اس نے ساٹھ(۲) سال کی عمر میں ایک مرتبہ بھی غسل نہ کیا اور سوائے مذہبی ضرورت کے انگلیوں پر پانی چھڑکنے کے سوا کبھی پانی کے قریب تک نہ گئی۔ جس زمانہ میں میلا کچیلا رہنا عیسائی تقدس کا تمغہ تھا اس زمانہ میں مسلمان صفائی اور پاکیزگی کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔۔۔۔۔۔ آخر میں جب اسپین پر دوبارہ عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو فلپ دوم، انگلستان کی ملکہ میری کے شوہر نے جو اسپین کا بادشاہ تھا اپنے حکم سے تمام پبلک حماموں کو تڑوا کر زمین کے برابر کرادیا تھا۔ کیونکہ وہ "کفار" کی تہذیب وتمدن کے اعلیٰ نمونہ تھے" اور بات بھی یہی تھی کیونکہ حمام مسلمانوں کی معاشرت و تہذیب کا جزو لاینفک تھے۔ آبادی اتنی گنجان تھی کہ ایک دن کے سفر میں ایک مسافر کو تین شہروں اور لاتعداد دیہات اور قصبات سے گذرنا پڑتا تھا اور سڑک کے دونوں طرف پھل اور سایہ دار درختوں کا لامتناہی سلسلہ ہوتا تھا آبادی کی طرح اندلس کی دولتمندی بھی ناقابل اعتبار معلوم ہوتی ہے فارغ البالی اور مرفہ الحالی کے سلسلہ میں یورپ کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ بغداد اور الف لیلہ کی رنگین و مبالغہ آمیز روایات ہیچ ہیں۔ حکومت کی سالانہ آمدنی ساڑھے آٹھ کروڑ روپئے تھی (دسویں صدی میں روپیہ کی قیمت کی نسبت آجکل کے لحاظ سے وہی تھی جو ایک کو بیس سے ہوتی ہے) عبدالرحمٰن نے محاصل میں کمی و تخفیف کردی تھی۔ معدنیات، مال تجارت اور پیداوار پر ۱/۱۵ ٹیکس تھا مال درآمد۔ جائداد کی فروخت اور دکانوں پر بھی کچھ برائے نام ٹیکس تھا۔ حکومت کے

رعب و دبدبہ اور خلیفہ کی شان و شوکت کے لئے عمارات و قصور پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا اور عیسائیوں کے خلاف مسلسل پچاس سال جنگ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا لیکن پھر بھی خلیفہ کی وفات کے وقت پچاس کروڑ روپیہ خزانہ میں موجود تھا یہ دولت ٹیکسوں کی بھرمار غلاموں کی محنت یا جنگ کے مال غنیمت سے نہیں حاصل ہوتی تھی بلکہ زراعت اور صنعت و حرفت کی ترقی نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔ زراعت کو اس قدر ترقی دی گئی تھی کہ ایک فٹ زمین بھی بنجر نہیں چھوڑی گئی تھی جنگلات صاف کر کے کاشت کی جاتی تھی اور سارے ملک میں آبپاشی کا نہایت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ اسکاٹ کا بیان ہے کہ "مسلمانوں کو کچھ ایسا تجربہ تھا کہ خشک زمین کو بھی دیکھ کر بتلا دیتے تھے کہ آیا یہاں پانی ہے یا نہیں آج تک پہاڑوں میں ان کی کھودی ہوئی نالیاں موجود ہیں جو ان کی محنت و مشقت کی زندہ شہادت ہیں" تمام ملک میں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا اور ہر جگہ لہلہاتے ہوئے باغات، پھل پھول اور میوے نظر آتے تھے جنوبی صوبوں میں نو سال میں تین تین اور چار چار فصلیں تک پیدا کی جاتی تھیں۔ سائنٹفک طریقوں سے کاشتکاری ہونے کی بدولت غلہ کی اس قدر فراوانی تھی کہ تین کروڑ سے زیادہ آبادی کے لئے کافی ہوتا تھا اور نہایت سستا تھا[1]۔

اندلس میں عام سیر چشمی اور فارغ البالی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی سے

---

[1] قسطالۂ قدیم بے گیاہ اور بنجر ہونے میں ضرب المثل تھا مگر مسلمانوں کے زمانہ میں وہاں سرسبز جنگل تھے اور جا بجا خوبصورت گاؤں آباد تھے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں لامنکا کے جس میدان میں حد نظر تک کھیت ہی کھیت تھے وہاں اس وقت بھوکے جانوروں کو کہیں کہیں منہ مارنے کو گھاس نظر آ جاتی ہے.... ... آج کل کے مقابلہ میں فصلیں پوری سوگنی پیداوار دیتی تھیں۔ (اسکاٹ)

معمولی آدمی بھی صاف اور خوبصورت لباس زیب تن کرتا تھا۔ سواری رکھتا تھا۔ اور خوش ذائقہ وشیریں پھل اس کی غذا کا ضروری جزو تھے جبکہ اس وقت یورپ میں گرانی اور کمیابی کی وجہ سے پھلوں کا تکلفات میں شمار ہوتا تھا۔ پیشہ ور فقیر ناپید تھے۔ بیمار اور اپاہجوں کے علاج اور خبر گیری کا باقاعدہ سرکاری انتظام ہوتا تھا۔ یتیموں کی تعلیم اور پرورش کا بھی خلیفہ کی جانب سے مناسب اور معقول بندوبست تھا۔

علم دوستی | خلیفہ کو علم وادب سے خاص شغف تھا۔ اور خلیفہ کی فیاضی۔ قدر افزائی اور فراخ حوصلگی کی شہرت تمام دنیا میں تھی اور اس کی قدر دانی کی وجہ سے قرطبہ طلبہ علوم وفنون کے علماء اور فضلا کا مرکز ومنزل ہوگیا تھا۔ قرطبہ کے طبیب اور جراح اپنا جواب نہیں رکھتے تھے خلیفہ کی علم دوستی اور شوق کی وجہ سے سارے ملک میں علم وادب کا خاص چرچا تھا اور بقول اسکاٹ" قصر شاہی میں، شہزادوں کے محلوں میں، امرا کے مکانات میں، علما کے گھروں میں ہر ایک متلاشیِ علم کو اپنے دل ودماغ کی ترقی کا پورا سامان مل جاتا تھا کیونکہ ہر جگہ مذاقِ عام کے مباحثے ہوتے رہتے تھے کہیں سائنٹفک تحقیقات ہوتی تھیں کہیں علمی تقریریں سنی جاتی تھیں۔ کہیں بدیہہ گوئی کی مشق ہوتی تھی۔ کہیں شعراء کی آپس میں طبع آزمائیاں ہوتی تھیں۔ ہر ایک پیشہ، ہر ایک طبقہ، ہر ایک گروہ میں نہایت کارآمد اور خوبصورت صنعتوں کا زور تھا مرد، عورت علم وادب کے شیدائی تھے اور ہر فرد اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا" خلیفہ اور خلیفہ کے بڑے بیٹوں نے اپنی اپنی علیحدہ لائبریریاں قائم کی تھیں۔ اور خود خلیفہ اپنی لائبریری میں کئی کئی گھنٹے علمی بحث ومباحثہ میں صرف کیا کرتا تھا اور یہ خلیفہ کی علم دوستی اور شوق کا اثر تھا کہ رعایا کو بھی علم سے اتنی دلچسپی اور گرویدگی ہوگئی تھی۔ کہ وہ عمدہ کتب کے مقابلہ میں زر وجواہر کو ہیچ سمجھتے تھے۔ بہترین اور بے مثل

کتب خلیفہ ناصر اور اس کے بعد اس کے لائق، علم دوست اور علم پرور بیٹے حکم کے دورِ حکومت میں تصنیف کی گئیں۔ قابل اور لائق مصنفین کی تعداد کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی وفات کے تیس سال بعد ابن فلطان نے ایک ضخیم کتاب صرف مولفین اور مصنفین کے مختصر حالات پر لکھی۔

تعلیم عام تھی۔ عام طور سے ہر شخص قرآن کریم پڑھ سکتا تھا قریب قریب ہر مسجد میں ایک اسکول تھا۔ جہاں مفت تعلیم ملتی تھی۔ اہل اسپین علم کے اس قدر شائق ہو گئے تھے کہ اوسط درجہ کے مسلمانوں نے بھی اپنے گھروں اور احاطوں میں مکتب اور مدرسے قائم کئے تھے۔

رفاہِ عام (تجارت، زراعت اور صناعیوں نے ملک میں دولت کے انبار لگا دیئے تھے اور شاہی خزانوں کے علاوہ رعایا بھی مالامال تھی خلیفہ کو رفاہِ عام کا اس قدر شوق تھا کہ مالیات سلطنت کا ایک تہائی حصہ اس مد میں خرچ کرتا تھا مسلم قیدیوں کی رہائی کے لیئے خلیفہ نے بڑی جدوجہد کی اور اس کام کو اس وقت تک جاری رکھا گیا جب تک خلیفہ کو یہ یقین کامل نہ ہو گیا کہ ایک بھی مسلمان کسی دوسری مملکت میں بطور قیدی یا غلام کے موجود نہیں ہے۔ عمارات بنوانے کا بھی خلیفہ کو بہت شوق تھا۔ محلات، مساجد، حمام، چشمے فوارے، پل، باغات سڑکیں وغیرہ وغیرہ آج بھی مسلمانوں کی اس عظمت و شکوہ کی شاہد ہیں جن کی یاد دل سے کبھی فراموش نہ ہوگی۔

صنعت و حرفت | ملک کی بیرونی تجارت اور سواحل اندلس کی حفاظت کے لئے ایک نہایت ہی طاقتور اور بحری بیڑہ تھا۔ اہل لوگ بحری سفر کے اس قدر شائق ہو گئے تھے کہ جو مقامات یا علاقے دریاؤں کے کنارے نہیں تھے ان کو مضبوط اور پختہ سڑکوں و پلوں کے ذریعہ

دریاؤں سے ملا دیا گیا تھا۔ چنانچہ اکثر شہر دریا سے صرف ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر نہ تھے تجارتی بیڑہ کی بدولت اندلس کے تجارتی تعلقات نہایت وسیع تھے۔ اور یورپ ایشیا اور افریقیہ کی نادر اشیاء اندلس کے شہروں میں نہایت آسانی اور فراوانی سے ملتی تھیں جو خام پیداوار غیر ممالک سے آتی تھیں اس کو اہل اسپین تیار کر کے باہر بھیجتے تھے اس وقت پارچہ بافی، فن شیشہ گری، مرصع طلائی زیورات بنانے، چاندی اور پیتل کے برتن ڈھالنے میں کوئی ملک اسپین کا ہمسر نہ تھا قرطبہ میں تقریباً دو تین لاکھ گھر تھے جن میں سے تین چوتھائی گھران صناعوں اور کاریگروں کے تھے جو پارچہ بافی اور دیگر فنون کے استاد کامل تھے مگر صناعی کے لحاظ سے المیریا اور اشبیلیہ کو قرطبہ پر بھی فوقیت حاصل تھی اور یہ صنعت و حرفت زراعت و تجارت کی بحالی اور ترقی کا نتیجہ تھا کہ تکلیف دہ ٹیکس معاف کر دینے اور محاصل میں کمی کر دینے کے باوجود خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی کل آمدنی عبدالرحمٰن اول سے بیس گنی اور عبدالرحمٰن دوم سے پانچ گنا زیادہ تھی۔

ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا خلیفہ ہر ایک کے ساتھ یکساں انصاف و عمل کا حامی و خواہاں تھا ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمیوں کی جان و مال اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا جاتا تھا۔ محافظ دستے سڑکوں پر پہرہ دیتے تھے" اور آمد و رفت کے ذرائع اتنے عمدہ اور محفوظ تھے کہ دیہاتوں کی پیداوار اور صنعتی اشیاء ملک کے گوشہ گوشہ میں بآسانی پہنچ جاتی تھیں۔

قرطبہ | قرطبہ کی شان و شوکت یورپ میں قسطنطنیہ کے سوائے سب سے بڑھی ہوئی تھی فلسفہ اور سائنس کا مرکز وسیع تھا۔ جگہ جگہ علم و ہنر۔ فن و کمال کا چرچا تھا۔ اس کی عمارات، باغات، مدرسے، کتب خانے، شفاخانے، سڑکیں اور اس کے شہریوں کی

نفاست ولیاقت کا عام شہرہ تھا۔ اور ان باتوں میں یورپ کا کوئی شہر بھی اس کا مقابلہ
کر سکتا تھا اس کا یورپی مورخین کو بھی اعتراف ہے۔ لین پول لکھتا ہے:۔

"جب ہمارے سیکسن آبا چوبی مکانات میں رہتے تھے اور گندی پیالوں پر
سوتے تھے جب ہماری زبان بھی نہ بنی تھی اور جب لکھنا پڑھنا صرف معدودے چند
پادریوں کا اجارہ بنا ہوا تھا ہمیں اس زمانہ کے اندلسی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تعریف
کئے بغیر چارہ نہیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تمام یورپ جہالت اور درندگی
کا آماجگاہ بنا ہوا تھا تو اندلس کے دارالحکومت قرطبہ کے علوم و فنون کی روشنی سے ہماری
آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا ہونے لگتی ہے۔"

قرطبہ دس میل کی لمبائی میں بسا ہوا تھا اور اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ
تھی۔ مکانات کی تعداد دو اور تین لاکھ کے درمیان تھی۔ اس میں سات سو مسجدیں، ۹
سو پبلک حمام۔ اسی ہزار چار سو دکانیں۔ چار ہزار تجارت کے گودام۔ پچاس شفاخانے
ایک دارالعلوم اور لاتعداد مدرسے و مکتب اور پبلک کتب خانے تھے۔ باغات اور
تفریح گاہوں کا کیا شمار و قطار۔ مقری کے بیان کے مطابق قرطبہ اس زمانہ میں تمام دنیا
کے علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا اور دنیا کے مختلف حصوں سے طلباء تحصیل علم کے لئے
آیا کرتے تھے اور فن شعر، سائنس، فلسفہ، الٰہیات اور قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل
کرتے تھے۔

برنہارٹ اور ای ایم وبشیا لکھتے ہیں کہ "سائنس آرٹ، اور ادب
اس عہد میں جیسے مسلم اسپین میں عروج پر تھے۔ ویسے یورپ میں اس وقت کہیں نظر
شاندار عمارات اور خانگی زندگی کی عیش و عشرت یورپ میں اندلس جیسی کہیں بھی نہ ملتی تھی

سوسائٹی میں مسلمان عورتوں کو وہ مرتبہ اور عزت حاصل تھی۔ جو اس وقت یورپ میں عیسائی عورت کو کہیں بھی نصیب نہ تھی اور نہ صدیوں بعد تک حاصل ہو سکی۔ صنعت و حرفت اور زراعت میں بلکہ علوم و فنون، فلسفہ و سائنس کے ہر شعبہ اور ہر شق میں عربوں نے اس قدر ترقی کی تھی اور ان کی ترقی سے دنیا کو اس قدر فائدہ پہنچا کہ اس کی شکر گذاری کسی طرح ممکن نہیں ہے"

اعتراضات | مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے خلیفہ عبدالرحمٰن کے دور حکومت پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور قبل اس کے اس مختصر مضمون کو ختم کیا جائے چند اعتراضات کا جواب دینا ضروری ہے۔

اسکاٹ کا یہ اعتراض ہے کہ عبدالرحمٰن کا دامن بہت سے بدنما داغوں سے ملوث ہے اس کے عادات واطوار پسندیدہ نہ تھے۔ اور "اس کے جذبات عیش ونشاط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں" تعصب پر مبنی ہے معلوم نہیں اس نے کہاں سے اور کیونکر یہ الزام تراشا۔ کیونکہ علامہ مقری نے صاف صاف لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن کی سیرت کے خط وخال اسلامی تھے۔ جب ہم خلیفہ کی خدمات ملک کو دیکھتے ہیں تو ہم کیسے اور کیوں کر یقین کرلیں کہ اس شخص کی زندگی لہو ولعب میں بسر ہوتی یا یہ کہ وہ نفسانی خواہشات سے مغلوب رہتا تھا" عرب مورخین کا بیان ہے کہ خلیفہ کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ نکلا جس میں انھوں نے ان دنوں کو احتیاط سے قلمبند کیا تھا جن میں بے فکر رہے تھے ایسے دنوں کی کل تعداد چودہ تھی۔ یہ اس شخص کی ذمہ داری اور احساس فرض کا حال ہے جسے عیش پرست کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بقول علامہ مقری سعادت نے قسم کھائی

تھی۔ ترقیات دنیاوی اور وسعت ملک میں وہ ضرب المثل تھا۔ اس نے پچاس برس سے زیادہ حکومت کی مگر صرف چودہ دن بے فکری کے ملے اس میں شک نہیں کہ اس کے محلات کی سجاوٹ، اور بناوٹ میں اکثر جگہ عریاں مناظر پیش کئے گئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عریاں تصاویر و نقوش اس کی اخلاقی پستی اور رکیک جذبات کا مظہر ہیں بلکہ جیسا کہ پروفیسر ڈوزی نے لکھا ہے کہ " یہ چیزیں خلیفہ کی قوتِ تخیئلی اور فن سپاہ گری کا مظاہرہ کرتی ہیں "

عمارات سے معمار کا اندازہ کیا جاتا ہے اور عبدالرحمٰن کی قابلِ توصیف وزریں کامیابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اپنی سیرت وکردار اور اخلاق واطوار کے اعتبار سے اور علم وادب، تہذیب وشائستگی کے سرپرست کی حیثیت سے وہ یورپ کے ہر تاجدار سے بڑھا ہوا تھا۔

اس طرح بعض مورخین زوالِ بنوامیہ کا سبب خلیفہ عبدالرحمٰن کو قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ خلیفہ ہے جس نے اسپین کو دنیا کا سب سے مضبوط اور ترقی یافتہ ملک بنایا۔ درحقیقت زوال اسپین کا سبب عبدالرحمٰن کا دورِ حکومت نہیں بلکہ اس کے بیٹے حکم ثانی کی حد سے زیادہ مشغولیات علم وادب تھی۔ حکم کا سارا وقت علم وفنون کی ترقی میں صرف ہوا اور وہ انتظام مملکت کی طرف متوجہ نہ ہوسکا جس کی وجہ سے خلافت اندلس کی بنیادوں میں وہ استواری اور مضبوطی نہ رہی جو اس کے جلیل القدر باپ نے چھوڑ دی تھی۔ مگر اسپین کی تباہی کا ذمہ دار حکم بھی نہیں بلکہ اس کے کمزور عیش پرست جانشین اور وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہبی جھگڑے چھیڑ کر اور خانہ جنگی کر کے اس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا وہ ملک جو اتحاد واتفاق، اخوت و یگانگت کی وجہ سے

رفعت میں ثریا کا مدِ مقابل تھا اور جو آسمان شہرت پر مثل ماہ چہار دہم چمک رہا تھا نا اتفاقیوں کی بدولت اپنی حفاظت نہ کر سکا اور مسلمانوں کی جلا وطنی کے بعد بقول لین پول تھوڑے عرصہ تک عیسائی اسپین ماہتاب کی طرح مستعار روشنی سے بارونق نظر آیا۔ اس کے بعد اس کو گھن لگ گیا اور آج تک ایسی تاریکی میں پڑا ذلتیں اٹھا رہا ہے۔ زوال اسپین ایک الگ مضمون ہے اور آئندہ کسی موقع پر اس سے بحث کی جائیگی۔

تاریخ میں خلیفہ کا مرتبہ | عبد الرحمٰن بڑا فرض شناس اور لائق فرمانروا تھا وہ امور سلطنت میں معمولی سے معمولی چیزوں پر بھی غور و فکر کیا کرتا تھا وہ نہ صرف زمانہ وسطیٰ کا ایک جلیل القدر خلیفہ تھا بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ جمہوریت اور عمومیت کا دور دورہ ہے وہ ایک اعلیٰ درجہ رکھتا ہے کیونکہ عبد الرحمٰن نے رعایا کی خوشی اور خوش حالی کو ہمیشہ اپنا فرض اولین تصور کیا اور کبھی ایک منٹ کے لئے بھی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو فراموش نہیں کیا یہی جمہوریت کی اساس ہے لیکن اگر ہم بنظر غور اور انصاف دیکھیں تو نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ آج بھی اس کا عملی سبق کہیں نہیں ملتا۔

اس نے رعایا میں صحیح جذبہ ترقی پیدا کیا انھیں علم و ادب صفائی اور پاکیزگی تہذیب و تمدن رحم و انصاف اُخوت و محبت حسن و نفاست صناعی اور کاریگری کا خوگر بناکر گمنامی کے قعر مذلت سے نکال کر بام عروج و شہرت پر پہنچا دیا اس نے عرب قوم اور اسپین ا نام تمام دنیا میں روشن کیا اور تاریخ عالم میں ایک ازوال ایک ابدی اور غیر فانی کارنامہ چھوڑ گیا وہ دور

دسطی کا حکیم تھا جس نے اپنی ضربِ حیات آفریں سے اسپین کی جانِ خفتہ کو بیدار کیا وہ ایک مسیحا تھا جس نے اپنے ملک اور قوم کی چارہ سازی کی۔

ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی

(۳)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

آگے فرماتے ہیں۔

"پس اول مقدم ایں است کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی وملک گیری شوند"

آپ کے سامنے فتنے اٹھ رہے تھے، سکھوں نے ظلم پر کمر باندھی تھی اور بادشاہ کا تغافل بڑھا ہوا تھا ایک دن خود دربار میں تشریف لے گئے اور فرمایا۔

"بہ تنبیہ آنہا (فتنہ سکھاں) باید پرداخت کہ فلاح دینی و دنیوی در ضمن آں است"

سکھوں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ دہلی کے علماء کے خاندان ہراساں و پریشان تھے بڑے بڑے خاندانوں کو عزت و ناموس کا خطرہ تھا شاہ عبدالعزیز نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کو ایک خط میں لکھا۔

ایام بہ دانست فالقلب منحیر ع — من قوم سکہ وان الخوف معقول

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے — سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے

تذکرہ شاہ ولی اللہ میں مولوی رحیم بخش دہلوی نے پورا خط نقل کیا ہے اس عہد کے

علماء کی سعی تھوڑی بہت مرزا نجف خاں کے ہاتھوں پوری ہوئی جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے

شعرا کا جمگھٹا دہلی میں ان دنوں اردو شاعری شباب پر تھی آئے دن مشاعرے ہوتے میر تقی میر کے یہاں مشاعرہ ہوتا اس کے بعد میر ممنون نے اپنے یہاں شعر و شاعری کی محفل جمائی مگر مرہٹہ گردی نے صحبتوں کا لطف اٹھا دیا تھا۔

دلی کی شعر و شاعری کی سبھا کا اُجاڑ دلی میں جاٹ گردی نے امرا تو امرا ارباب فضل و کمال کو بھی چین نہ لینے دیا۔کوئی مرشد آباد و عظیم آباد گیا کوئی دکن پہنچا جن میں دوری کی سکت نہ تھی وہ فرخ آباد اور فیض آباد سدھارے

نواب شجاع الدولہ کو محمد اسحٰق خاں شوستری کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم جو محمد شاہ بادشاہ کی منہ بولی بیٹی تھیں ان کی سیر چشمی سے آدھی دلی ادھر کھنچ گئی مرزا جواں بخت جو لکھنؤ گئے کچھ شعرا انکے پاس پہنچے مرزا سلیمان شکوہ کا لکھنؤ میں دوسرا دربار تھا دلی سے جو جاتا ان کے خوان کرم کا مہمان رہتا۔

علامہ سراج الدین علی خاں آرزو دلی سے لکھنؤ چلے گئے نواب سالار جنگ کے یہاں دن گذارے میر غلام حسین ضاحک نے فیض آباد جا بسایا میر سوز اور مرزا رفیع سودا "دلی کا نگر اور رنگ دیکھ کر فرخ آباد گئے وہاں نواب مہربان خاں رند نے ہاتھوں ہاتھ لیا "جب وہاں کا کھیل بگڑا تو فیض آباد ہو کر لکھنؤ آگئے"

میر محمد تقی میر نے جاٹ گردی سے گھبرا کر وطن اکبر آباد چھوڑا کچھ عرصہ دلی میں خوش وقتی سے بسر کی بقول صاحب گل رعنا وضعداری نے مدتوں ان کو دلی سے نکلنے نہ دیا آخر کب تک، وہ گھبرا کر لکھنؤ چلے گئے پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ میر ولی اللہ محب

میر غلام حسین برشتہ۔ میر انشاء اللہ خاں انشاء اور جرأت بھی لکھنو پہنچ گئے۔ مرزا قتیل جو ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے ساتھ شل ساتھ کے تھے اُن کے مرنے پر دلی سے منہ موڑ گئے غرضکہ دلی کی شعر و شاعری کی سبھا اُجڑ گئی۔

علمی دور | شاہ عالم کا ابتدائی زمانہ دلی سے باہر گذرا عالمگیر ثانی کا عہد تھا گو طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا امن چین کہاں مگر علمی ترقی بالخصوص دینیات کی وسعت پذیر تھی حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان علمی بساط بچھائے ہوئے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر کی درسگاہیں رونق پر تھیں اقطاع ہند سے طالبان علم حدیث و قرآن آکر فیض یاب ہو رہے تھے قال اللہ و قال الرسول کی گرم بازاری تھی یہی زمانہ تھا۔ حضرت شاہ فخر الدین دکن سے دلی آئے تو اجمیری دروازہ کے باہر امیر غازی خاں فیروز جنگ کے مدرسہ میں درس دینے لگے علوم معقول کے ساتھ حقائق و معارف کے دریا بہائے

"سینہ ہا سے گنجور حقائق و دلہائے معادن معارف گشت خفتگان بیدار

دلے ہوشیاں ہوشیار گشتند و بے خبراں باخبر و بے اثراں با اثر گردیدند[1]

آپ کے شاگرد مولانا سید احمد بھی درس دیتے تھے میر بدیع الدین حضرت شاہ عبدالرحمٰن لکھوی آپ کے شاگردوں میں نامور تھے۔

غرضکہ ملکی بدامنی اور اخلاقی پستی کے زمانہ میں بھی علماء درس و تدریس میں مشغول تھے مخالف ہوا تیز و تند لیکن یہ لوگ اپنا چراغ جلا رہے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ نے اپنے عہد کے علمی چرچوں کا اس طرح ذکر کیا ہے

بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ النَّصِيْبُ بِهَا ‏ لَمْ تَنْفَتِحْ عَيْنُهُ إِلَّا عَلَى الصُّحُفِ

---

[1] مناقب فخریہ۔

جس طرف نکل جائے اس میں مدارس نظر آئیں گے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری ہوگا

حضرت شاہ فخر الدین اور حضرت شاہ مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ علم طریقت کی بساطیں بچھائے ہوئے تھے۔

ان درسگاہوں نے کثرت سے علما پیدا کردیے اور یہاں سے کامیاب ہوکر جہاں گئے وہاں علم کی ترویج کی۔ شاہ عالم کے عہد میں اردو میں قرآن مجید کے ترجمے ہوئے شاہ عبد القادر شاہ رفیع الدین حکیم شریف خاں کی سعی سے مشکور ہوئے شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ نے ڈہائی پارہ کی تفسیر فارسی میں لکھی۔

نصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کلیم دہلوی نے کیا۔[۱] الٰہی بخش اکبرآبادی نے ایک کتاب اردو میں لکھ کر بادشاہ کے نذر کی۔ اس عہد میں اردو میں کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔

علمائے کرام | حضرت شاہ فخر الدین ابن شاہ نظام الدین اورنگ آبادی نبیرۂ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی والدہ سیدہ بیگم حضرت سید محمد گیسو دراز کی پوتی تھیں ۱۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے مولانا محمد میاں محمد جان مولوی عبد الحکیم سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی بیعت اپنے والد سے فرمائی وہ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مرید تھے ۱۱۶۰ھ میں دلی آئے اور مدرسہ امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ میں درس و تدریس میں لگ گئے اس کے علاوہ رشد و ہدایت کی محفل الگ جمنے لگی بڑے پایہ کے بزرگ تھے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال ہوا تاریخ گفت ہاتف خورشید دو جہانی ۱۱۹۹

---

[۱] تذکرہ شعرا میر حسن [۲] تذکرہ ہمیشہ بہار نصر اللہ خاں قمر

حضرت مظہر جان جاناں ابن مرزا جان دہلوی ۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی تیس برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کسبِ کمال کیا شعر و شاعری میں صاحبِ کمال تھے فارسی میں بیس ہزار اشعار میں سے ایک ہزار اشعار کا دیوان ہے جو خریطہ جواہر سے کم نہیں اردو میں غزلیں اور اشعار کافی ہیں۔ ساتویں محرم ۱۱۹۵ھ کو ایک ایرانی نے مرزا نجف خاں کے اشارہ سے ان کے قرابین ماری دسویں کو وصال ہوا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہ عمری دہلوی نے باپ سے جملہ علوم حاصل کئے سن پیدائش ۱۱۵۹ھ ہے اور وفات کا ۱۲۳۹ھ تفسیر فتح القدیر تحفہ اثنا عشریہ بستان المحدثین یادگار سے ہیں

حضرت شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ العمری قدس سرہٗ کا قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور چند تصانیف یادگار سے ہیں ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔

حضرت شاہ عبدالقادر ابن شاہ ولی اللہ نے تمام عمر اکبرآبادی مسجد میں گذاردی موضح القرآن ۱۲۰۵ھ میں لکھی تینوں بھائی درس و تدریس میں تمام عمر لگے رہے بعمر ۶۳ سال ۱۲۳۰ھ میں وصال ہوا مہندیوں میں دفن ہیں۔

حافظ فخر الدین محدث نبیرۂ شاہ عبدالحق محدث دہلوی محمد شاہی عہد کے بزرگ تھے عمر کا بقیہ حصہ شاہ عالم کے عہد میں گذارا بڑے فاضل اور عالم اجل تھے۔ صحیح مسلم کی شرح فارسی میں لکھی اور عین العلم اور حصن حصین کی شرحیں یادگار سے ہیں تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

مولوی سلام اللہ بن شیخ الاسلام ابن حافظ فخر الدین دہلوی فقیہ فاضل محدث کامل مفسر متبحر علامہ عصر تھے علوم اپنے والد شارح صحیح بخاری فارسی سے تحصیل کئے

---

[1] مناقب فخریہ و گل رعنا وغیرہ

مسند افاضت پر متمکن ہو کر مثل اپنے اجداد کے نشر علوم میں لگ گئے تصانیف ہیں کمالین
حاشیہ تفسیر جلالین - محلی شرح موطا ترجمہ فارسی صحیح بخاری ترجمہ فارسی شمائل ترمذی مشہور
ہیں ۱۲۳۳ھ میں انتقال فرمایا

مفتی محمد ولی بن مفتی محمد امان بن ابو سعید سعید صاحب بحر الحقائق بن مفتی علیم اللہ
بن مفتی عبید اللہ برادر ملا وجیہ الدین گوپاموی مؤلف فتاوی عالمگیری - ملا معز الدین داماد
ملا محمد صالح ہرگامی (جد مولانا فضل امام خیر آبادی) کے نواسہ تھے تذکرہ علمائے اودھ میں ہے

"او بنور علم و دانش در اطراف و اکناف عالم بغایت مشہور اند و مہارتش
در علم فقہ و حدیث ضرب المثل جمہور علما نزدیک و دور در مدرسہ پدر بزرگوار خویش
پیوستہ بافادہ قیام می نماید زیر عہدۂ افتا بعد وفات پدر ممتاز شدہ

فتاوی یادگار سے ہے -

یورپ میں آپ کے اجداد در محب اللہ بہاری اور غلام یحیی بہاری سے علم پھیلا
بنگال اور مدراس میں قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح سلم و دیگر علماء گوپاموی
مجتبی علیخاں بہادر افضل العلماء قاضی ارتضا علی خاں بہادر علامہ عبد العلی بحر العلوم سے
سے علم پھیلا اور خوب پھیلا - حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی اولاد کے ذریعہ
تمام ہندوستان میں علوم کی اشاعت ہوئی - مگر عجب اتفاق ہے کہ یہ خاندان اور
شاہ محمد افضل محب اللہ ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ بلگرام میں عبد الجلیل اور
غلام علی آزاد یہ سب خاندان دو تین پشت سے آگے نہ چلے یعنی وہ علمی حیثیت برقرار نہ
رہی لیکن بحر العلوم کا خاندان اور مفتیان گوپاموہ دو سو برس تک ایک حیثیت پر قائم رہا
اور سیکڑوں علما و فضلا پیدا ہوئے مفتی محمد ولی کے صاحبزادہ قاضی محمد اسمعیل مدراس

ہیں قاضی القضات اور "نکات تفسیر فارسی" کے مؤلف تھے مفتی محمد ولی کا انتقال ۱۹ ار شوال سنہ ۱۲۱۰ھ کو ہوا۔

قاضی احمد علی سندیلوی ابن سید فتح محمد شاگرد و داماد مولانا حمد اللہ سندیلوی

"دانشمند متبحر کثیر الدرس والتصانیف ذکی و ذہین بود از پیشگاہ سلاطین دہلی بعہدۂ قضائے قصبہ سندیلہ عز امتیاز داشت"[۱]

ان کی تصنیفات میں حاشیہ میر زاہد رسالہ و حاشیہ میر زاہد ملا جلال میر زاہد شرح مواقف و شرح سلم العلوم مشہور و معروف ہیں ۱۲ ر ہجری کے اواخر میں انتقال کیا مولوی حیدر علی سندیلوی مولانا حمد اللہ کے خلف رشید اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں والد خود اور قاضی احمد علی کے شاگرد تھے عمر کا بڑا حصہ باپ کے ساتھ دہلی میں گذارا آخری عمر میں وطن چلے گئے درس و تدریس جاری کیا۔ مشاہیر علماء افضل العلماء قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی مولوی دلدار علی مجتہد لکھنوی مولوی نور اللہ فرنگی محلی و قاضی جلال الدین آسیونی سے شاگرد تھے حاشیہ میر زاہد رسالہ تصنیفات میر زاہد ملا جلال علمی یادگار چھوڑیں۔ ۲ ر رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو انتقال ہوا۔

مولوی عبد الحیٔ دہلوی شاگرد و داماد مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی

"در فقہ حنفی دستگاہے کامل داشت"[۲]

رسالہ نکاح ایامی و فتاوی متفرق تالیف سے ہیں ۸ ر شعبان سنہ ۱۲۴۳ھ کو وفات پائی۔

قاضی ثناء اللہ عثمانی نبیرہ شیخ جلال الدین کبیر پانی پتی ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید اور ۱۶ سال کی عمر میں علوم معقول و منقول کی تکمیل کی فقہ اور اصول میں مجتہدانہ درجہ حاصل تھا تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں کتب حدیث کی سند حضرت شاہ ولی اللہ سے

[۱] آثار علماء [۲] تذکرہ علماء ہند۔

حاصل کی تفسیر مظہری جس کو اپنے پیر طریقت مرزا مظہر شہید کے نام سے لکھی ۱۲۲۵ھ میں وصال ہوا۔

ملا عبد العلی بحر العلوم بن ملا نظام الدین سہالوی نے سترہ برس کی عمر میں تحصیل علوم عربیہ سے فراغت پائی لکھنؤ سے شاہجہاں پور گئے حافظ الملک حافظ رحمت خاں با اعزاز و اکرام اپنے پاس رکھا یہاں درس کا سلسلہ شروع کیا ان کی شہادت کے بعد نواب فیض اللہ خاں نے رام پور بلالیا کچھ عرصہ رہے دہلی آئے حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں گئے آپ نے ہی بحر العلوم کا خطاب دیا نواب والا جاہ محمد علی فاروقی گوپا موی رئیس کرناٹک نے خرچ بھیجکر مدراس بلوالیا۔ جب آپ مدراس پہنچے تو تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا خود والاجاہ نے پالکی کو کندھا دیا اور دربار میں اپنی نشست پر جگہ دی عالیشان مدرسہ بنوا کر آپ کے سپرد کیا اور ملک العلماء کا خطاب دیا، کثیر المقدار کتب ارکان اربعہ در اصول فقہ حاشیہ بر میر زاہد رسالہ حاشیہ بر حاشیہ زاہدیہ بر شرح تہذیب جلالیہ۔ حواشی ثلاثیہ بر حاشیہ زاہدیہ امور عامہ جدیدہ و قدیمہ۔ شرح مسلم مع حاشیہ منہیہ۔ عجالہ نافعہ فواتح الرحموت۔ شرح مسلم الثبوت۔ تکملہ بر شرح ملا نظام الدین بر تحریر ابن ہمام تنویر الابصار شرح فارسی منار حاشیہ بر شرح صدر شیرازی۔ شرح مثنوی مولانا روم۔ شرح فقہ اکبر وغیرہ محمد علی والاجاہ امورات ملکی میں آپ سے مشورہ لیا کرتا ۸۳ برس کی عمر میں ۱۲ رجب ۱۲۳۵ھ کو وفات ہوئی۔

حکما: علامہ حکیم شریف خاں دہلوی شاہ عالم کے سرکاری طبیب تھے شفاء الملک کا خطاب تھا۔ عجالہ نافعہ۔ تالیف شریفی۔ علاج الامراض۔ حاشیہ نفیسی۔ حاشیہ شرح اسباب۔ ترجمہ فارسی مشکوٰۃ المصابیح۔ ترجمہ اردو کلام مجید یادگار سے ہے۔ ۱۲۳۱ھ کو وفات ہوئی۔

۴۸۶ھ

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل

(از جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلی)

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تمہید۔ آج کل اُردو زبان کو بگاڑ کر ایک نئی زبان بنانے کی اور اس کے لئے ہندی رسم الخط رائج کرنے کی زبردست کوشش کی جارہی ہے اتنی زبردست کوشش ملک کو آزاد کرانے کے لئے کی جاتی تو غالباً نصف صدی قبل ہی ملک آزاد ہو چکا ہوتا۔ کاش کہ اب ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد ہندستانی قوم اس کی تعمیر و ترقی کی طرف اپنی تمام قوتیں متوجہ کرتی اور ایک صدی کی برطانوی تخریب کا علاج کرتی! مگر افسوس! ایک ہزار برس میں ہندوستان کے تمام فرقوں کے اشتراکِ عمل سے جو تمدن بنا تھا اس کو آج بیگانہ سمجھا جا رہا ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان میں رہنا ہے تو اپنا تمدن (یا کلچر) چھوڑنا پڑیگا۔ یہ صرف مطالبہ ہی نہیں بلکہ اس کے لئے سخت جد وجہد کی جارہی ہے مگر یہ بالکل بے دلیل اور بے سوچی سمجھی بات ہے غالباً ان لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں دیکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا کوئی خاص تمدن نہیں ہے ان کا تمدن وہی ہے جو ہندوستان کے تمام باشندوں کا ہے غیر ملکی تمدن کو انھوں نے اسی وقت خیر باد کہدیا تھا جب انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا وہ ہندوستان کی دولت اور پیداوار کو کسی دوسرے ملک کا پیٹ بھرنے کے لئے

نہیں لے گئے۔ نہ کسی دوسرے ملک کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ اپنا اوسیدھا کر
کے لئے ہندوستان کو آلۂ کار بنائے تمام فرقوں کے اشتراک سے ایک تمدن کی بنا
پڑ گئی حتیٰ کہ اس کے لئے بعض شوریدہ سروں نے مذہب کی وحدت کو بھی ضروری
سمجھا اور اکبر بادشاہ کے عہد میں یہ کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں ایک ایسی عظیم
قومی وحدت قایم کی جائے۔ جس میں کسی قسم کی تفریق وامتیاز کا شائبہ نہ رہے، لیکن
نظریہ ناکام رہا اور چھوت چھات کی صورت میں اس کا عظیم ردعمل ہوا۔ اس کے باوجود
تمدن کا اشتراک رہا اور آج تک ہے۔ اب اگر کسی نئے تمدن کی طرف دعوت دی
رہی ہے تو صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کو اپنا تمدن چھوڑ کر نیا تمدن
اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہئے مگر ان مدعیوں نے اب تک اس نئے تمدن کی رہنمائی
رسائی نہیں فرمائی ہے اس لئے ابھی ہمیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ نیا تمدن کیا ہے
یہ ایک لسانی کلیہ ہے کہ نئی زبان ہمیشہ مختلف قوموں کے اشتراک اور اختلاط سے بنتی
ہے۔ قانون سے نہ کوئی زبان بن سکتی اور رائج ہو سکتی ہے اور نہ مٹائی جا سکتی ہے
ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے عہد حکومت میں سرکاری زبان فارسی
وغیرہ رہی اور انگریزوں کے دو سو برس کے زمانۂ عروج میں انگریزی کا عروج رہا
لیکن نہ فارسی ہندوستان کی ملکی زبان بن سکی نہ انگریزی بلکہ ایک بین الاقوامی زبان خود
بخود بن گئی اور یہ زبان سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے ہندو
مسلمانوں کا تمدن جدا جدا نہیں ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اب آزادی ملنے کے بعد بعض
لیڈر کون سے تمدن کی طرف مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں انگریزوں کے دو سو برس کے
عروج کے زمانہ میں باوجودیکہ ہندوستان میں بھی انگریزی زبان کا عروج رہا اور آج تمام

نیا کی بین الاقوامی زبان بھی انگریزی بن گئی ہے مگر ہندوستان کی مشترک زبان جو تھی وہی
ہی اور آج تک ہندوستانی ادب میں انگریزی کے چند الفاظ بھی راہ نہ پا سکے۔ اگر قانون
طاقت اور حکومت کے جاہ و جلال سے کوئی زبان بن جایا کرتی تو انگریزوں کے عہد
ں ہندستانی ادب میں انگریزی بھی داخل ہو جاتی اور ضرور کوئی نئی زبان بن جاتی۔ مگر
ئی زبان کیوں کر بنتی انگریزوں نے ہندوستان کو نہ اپنا وطن سمجھا نہ اپنے ملکی تمدن کو چھوڑا
اپنے ذہن سے اپنے ملکی و وطنی رجحانات کو محو ہونے دیا ان کا تمدن تہذیب، زبان
ر رنگ روپ بالکل اجنبی اور بیگانہ ہی رہا۔ کسی ملک کی وحدت کو قایم رکھنے کے
لئے اور افراد کی قوت کو ملک کی تعمیر میں لگانے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپس
ں ادائے مطالب کے لئے ایک ہی زبان ہو ایسا نہ ہوا تو ملک کی ترقی صدیوں پیچھے
پڑ رہے گی جو لوگ ایک نئی زبان گڑھنے کی فکر میں سرگرداں ہیں کیا اچھا ہوتا کہ اتنا وقت
ادوسرے تعمیری کاموں میں صرف کرتے صنعت و حرفت اور تجارت بین الاقوامی تعلقات کے بغیر
رقی نہیں کر سکتی۔ اب ہم کو متحد ہو کر دنیا کی سائنسی دوڑ میں شامل ہونا چاہیے اگر ملک کی
زبیت زبان اور چھوت چھات کے جھگڑوں میں پھنسی رہی اور یوں ہی اپنا وقت ضائع
رتی رہی تو جب تک ہم نیا تمدن بنا کر اور نئی زبان سیکھ کر فارغ ہوں گے دنیا کہیں سے
ہیں پہنچ چکی ہوگی ملک کے سامنے زبان سے زیادہ بہت سے اہم مسائل ہیں ہم کو ان
طرف متوجہ ہونا چاہیے اور جو زبان پہلے سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اُسی سے کام لینا
اہیے۔

کوئی زبان نہ خود بنتی ہے نہ فنا ہوتی ہے اس لیے یہ بالکل واضح حقیقت ہے
ملک کے بعض لیڈروں کا جو قیمتی وقت اردو کے خلاف محاذ بنانے میں صرف ہو رہا ہے

وہ بالکل رائیگاں ہے، ہونا یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد کے یہ بے بہا لمحات ملک کے دفاع اقتصاد اور امن و اتحاد پر صرف کیے جاتے۔ مگر افسوس کہ اس وقت اردو کی کچھ اس انداز سے مخالفت کی جارہی ہے کہ گویا مسلمان بادشاہوں نے اس زبان کو ہندوستانیوں کے منہ میں زبردستی ٹھونس دیا تھا اس کو اب اگل دینا چاہیے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کی انحطاط کے وقت سے اردو نے ترقی شروع کی اور زوال کے بعد وہ ایک ترقی یافتہ عالمگیر زبان بنی۔ یہی تو کبیر داس اور امیر خسرو کی زبان ہے جو نکھر نکھرا کر داغ کے زمانے میں اردوئے معلیٰ کہلائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار منشی پریم چند کی زبان بنی۔

انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان کے تمام عناصر کی واحد نمایندہ جماعت ہے جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اکثریت کے انتہا پسند طبقہ میں لفظ اردو سے نفرت کی جانے لگی ہے اور کچھ ایسا سمجھا جانے لگا ہے کہ گویا یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور فرقہ پسند افراد اس لفظ سے چڑھنے لگے ہیں تو اس نے اس لفظ کو ترک کر دیا اور ہندوستان کی مشترک زبان کو ہندوستانی کا لقب دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی زبان کے سوا کسی زبان میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی سرکاری زبان بن کر قومی و ملکی وحدت کو باقی رکھ سکے۔

ہندوستانی زبان کی ادبی حیثیت آج تک وہی ہے جو داغ نے قایم کی تھی۔ جس نہج پر داغ نے زبان کو نکھارا اور لغات و تراکیب کو مرتب کیا تھا اس سے بہتر تبدیلی اب تک نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے زبان کے اس آخری دور کا مورث اعلیٰ صرف داغ مرحوم کو کہا جا سکتا ہے داغ مرحوم اور ان کے تلامذہ دور حاضر کی عالمگیر اور صالح زبان کے معمار ہیں۔ بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہندوستانی قوم ان حضرات کے حالات سے

ناواقف رہے جنھوں نے ہندستانی ادب کو نکھار کر ایک بین الاقوامی زبان بننے کے قابل بنایا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء (شوال ۱۳۶۵ھ) میں ہندستان اور خاصکر دلی اور پنجاب میں جو خونین انقلاب آیا اس کے نتیجے میں دلی پر صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ تمام مغربی اضلاع کی تہذیب چھا گئی۔ اور اب دہلی بڑا ہی عجیب وغریب شہر نظر آنے لگا۔ کثرت آبادی کی وجہ سے نہایت آباد لیکن دیدۂ عبرت کے لئے یکسر ویران جن لوگوں کے دم سے دہلی کی بچی کھچی روایات باقی تھیں سب منتشر ہو گئے یا تہ تیغ ہوئے۔ شاندار عمارتیں، درسگاہیں اور علوم وفنون کے بے بہا ذخیرے نذر آتش ہوئے۔ اس آٹھویں بربادی کے بعد زبان کے لحاظ سے دلی کی مرکزیت ختم ہوئی۔ اور ممکن ہے کہ دنیا کچھ عرصے کے بعد زبان کے ان اولوالعزم معماروں کو بھول جائے جن بزرگوں نے ہندستانی ادب کی خدمت کے لئے اپنی عمر کے بہترین لمحات صرف کئے۔

ان میں سے ایک درخشندہ ستارا حضرت ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی کی ذات گرامی تھی جو خاندان لوہارو کے ایک ممتاز فرد اور دلی کی قدیم تہذیب کے ایک مکمل نمونہ تھے اور جہاں استاد داغؔ مرحوم کے عزیز ترین شاگرد اور بھتیجے اور داماد تھے۔ داغؔ مرحوم کے دہلی کے شاگردوں میں سے تین دلی والے مشہور ہیں ایک سائلؔ مرحوم دوسرے حضرت سید وحید الدین بیخودؔ دہلوی مدظلہ تیسرے پنڈت تربھون ناتھ زتشی المتخلص بہ زارؔ دہلوی مدظلہ موخرالذکر ہر دو حضرات الحمدللہ حیات ہیں۔

(متعنا اللہ بطول حیاتہما)

ضروری ہے کہ دلی کے اس آخری دور کے تمام مشاہیر ادب کے حالات

قلمبند کیے جائیں۔ فی الحال اس سلسلے کو میں اپنے اُستاد جناب سائلؔ مرحوم سے شروع کرتا ہوں اگر حالات سازگار رہے تو ممکن ہے کہ دیگر حضرات کے حالات قلمبند کرنے کا موقع مل جائے۔

افسانۂ یاران کہن خواندم و رفتم ــ دریاب! کہ لعل و گہر افشاندم و رفتم

سائل صاحب کے خاندانی حالات | مغل بادشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی (المتوفی ۱۷۵۴ء) کے عہد میں[1] تین تورانی بھائی سمرقند سے ہندستان میں وارد ہوئے۔ قاسم جان۔ عارف جان عالم جان (یہی عارف جان ہمارے سائل مرحوم کے دادا کے دادا ہیں)

قاسم جان | قاسم جان کو نواب معین الملک ناظم پنجاب (عرف میر منو خلف نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ[2]) نے سندھ کی جاگیر دی۔ اور نظیر بیگ خاں ہزارہ کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ عارف جان کی شادی اٹک کے ناظم مرزا محمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی[3]۔ تینوں بھائی میر منو کی رفاقت میں سکھوں کے مقابلے میں اپنی شجاعت اور سپہ سالاری کے جوہر دکھاتے رہے۔ نواب معین الملک کے انتقال کے بعد قاسم جان پانچ سو تورانی سوار[4] سے کر بہار پہنچے اور شہزادہ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کی معیت میں میرن بن میر جعفر کو شکست دی (جو لارڈ کلائیو کی معیت میں شہزادہ سے نبرد آزما تھا) شہزادہ نے ان کو شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دیکر اپنے رفقا میں داخل کر لیا۔ جب شہزادہ وہاں سے واپس ہوا تو یہ تینوں بھائی دہلی آگئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں گلی قاسم جان انھیں کے نام سے مشہور ہے اس محلے میں قاسم جان نے حویلی بنوائی تھی جو احاطہ کالے صاحب کہلاتی ہے اور اسی کے قریب ایک مسجد ۱۱۹۳ھ میں بنوائی تھی جو اب نواب احمد سعید خاں[5]

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۴۴ و جلوۂ داغ ص۹ [2] آبحیات آزاد ص۴۴۳ [3] تاریخ رؤسائے پنجاب ص۱۱۹ [4] غالب از مہر۔

کی مسجد کہلاتی ہے[1] حاجی شیخ نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب (جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور ایک مقدس بزرگ تھے) یہ حویلی حاجی بیگم زوجۂ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ان کو نذر کر دی تھی اس لئے اب انھیں کے نام سے منسوب ہے[2]۔

اس کے بعد عالمگیر ثانی کا قتل شہزادۂ عالی گہر کی تخت نشینی۔ وغیرہ معاملات میں ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں سپہ سالار کے لئے قوت بازو رہے اور معاملات سلطنت میں دخیل رہے۔ نواب عارف جان دیہات جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے نجف خاں کے انتقال اور دہلی پر غلام قادر روہیلہ کے تسلط کے بعد قاسم جان بعہد آصف الدولہ لکھنؤ چلے گئے تھے۔ نواب قاسم جان اور نواب عارف جان دونوں بھائی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں سماع خانے کے صحن میں مدفون ہیں[3]۔

نواب قاسم جان (شرف الدولہ سہراب جنگ) کے تین لڑکے تھے فیض اللہ بیگ خاں قدرت اللہ بیگ خاں فیروز۔ محمد بخش خاں۔ قدرت اللہ بیگ خاں کی صاحبزادی حاجی بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کو منسوب تھیں۔ فیض اللہ بیگ خاں کے دو فرزند تھے نواب غلام حسین خاں مسرور جن کی شادی بنیادی بیگم بنت نواب الٰہی بخش خاں معروف کے ساتھ ہوئی تھی مسرور صاحب مرزا غالب کے ہم زلف ہوتے کیونکہ نواب معروف کی دوسری صاحبزادی امراؤ بیگم مرزا غالب کو منسوب تھیں۔ مرزا غالب نے جس لڑکے کو متبنیٰ کیا تھا وہ انھیں نواب غلام حسین خاں مسرور کے صاحبزادے زین العابدین خاں عارف تھے مرزا صاحب نے ان کو بیٹے کی طرح پرورش کیا اور رجب جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ م اپریل ۱۸۵۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا تو مرزا غالب نے نہایت پر درد مرثیہ لکھا جو دیوان غالب

[1] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص۲۳۳ [2] ایضاً ص۲۰ [3] واقعات ایضاً ص۲۶۹

میں موجود ہے۔ عارف کے انتقال کے بعد ان کے دونوں لڑکوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں کی غور و پرداخت بھی مرزا غالب کے ذمہ رہی عارف کی شادی نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں کی بہن نواب بیگم سے ہوئی تھی ان کے دو ہی لڑکے تھے باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں باقر علی خاں کامل کی شادی نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم (عرف بگا بیگم) کے ساتھ ہوئی ان کی صرف تین لڑکیاں تھیں۔ محمد سلطان بیگم (عرف جنددبیگم) فاطمہ سلطان بیگم (عرف بند د بیگم) رقیہ سلطان بیگم (عرف مجھن بیگم) جنددبیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں کو منسوب تھیں بند د بیگم مرزا بشیر الدین بن نواب علاء الدین والی لوہارو کو منسوب تھیں۔ مجھن بیگم ڈاکٹر ذوالنور علی احمد آسامی عرف کرنل زیڈ احمد کو منسوب ہوئیں۔

عارف کے دوسرے صاحبزادے حسین علی خاں شاداں کی شادی حسن جہاں بیگم (بنت مرزا اکبر علی خاں بن بنی بخش خاں بن عارف جان) کے ساتھ ہوئی تھی

(مکاتیب غالب از عرشی صفحہ ۹۵ و ۹۶)

عارف جان | عارف جان کے چار بیٹے تھے الٰہی بخش خاں۔ احمد بخش خاں۔ بنی بخش خاں۔ محمد علی خاں اور ایک لڑکی تھی جو مرزا غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کو منسوب تھی۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف | ایک عالی خاندان امیر تھے علوم ضروری سے باخبر تھے اور شاعر کے کہنہ مشاق مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لی اور سید علی خاں غمگین وغیرہ سے استفادہ کیا آخر عمر میں ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے[1]۔ نواب الٰہی بخش خاں حضرت مولانا فخر الدین فخر عالم کے مرید تھے۔ آپ کا سلسلہ بیعت خواجہ کلیم اللہ جہاں آبادی سے ملتا ہے

[1] آب حیات آزاد صفحہ ۴۴۲

ازیادداشت مخطوطہ مرزا بشیر الدین احمد خان (بشکریہ نواب خسرو مرزا)

خواجہ عبدالرحمن — خواجہ نعمت اللہ بیگ — خواجہ ضیا جان بیگ

- شرف الدولہ قاسم جان شوہر بنت نظیر بیگ خاں ھزارہ
- عارف جان مورث اعلیٰ سائل صاحب مخدوم در مہرولی
- دختر
- عالم جان

- فیض اللہ بیگ خاں
- قدرت اللہ بیگ خاں
- محمد بخش خاں

- نواب غلام حسین خاں مسرور شوہر بنیادی بیگم بنت نواب الٰہی بخش خاں معروف
- غلام نقشبند خاں
- معین الدین حسین خاں
- محمد حسن خاں
- حاجی بیگم زوجہ نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں
- فتح اللہ بیگ خاں

- مرزا زین العابدین عارف
- مرزا حیدر حسین خاں
- غلام حسن خاں محو
- محسن خاں
- احمد علی خاں
- احمد حسن خاں
- نجابت خاں

- باقر علی خاں کامل شوہر معظم زمانی بیگم بنت نواب ضیاء الدین
- حسین علی خاں شاداں شوہر حسن جہاں بیگم بنت مرزا اکبر بیگ
- محمد حسین خاں
- محمد حسن خاں عرف جعفر مرزا
- جعفر حسین خاں
- احمد حسین خاں
- محمد حسین خاں
- حسن خاں
- صفدر حسین خاں
- حسین علی خاں

مرزا اصغر حسین

محمد سلطان بیگم عرف حیدری بیگم زوجہ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں | محمد معظم عرف ... بیگم زوجہ مرزا شہاب الدین ... | ... سلطان بیگم عرف محبوب بیگم زوجہ ... علی احمد

شیخ نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب۔ مولانا فخر عالمؒ کے پوتے اور مولانا قطب الدین کے صاحبزادے تھے۔[1]

نواب معروف نہایت متقی اور صاحبِ دل انسان تھے۔ سیر چشمی اور سخاوت ان کی ضرب المثل تھی ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ مرزا علی بخش خاں رنجور مرزا علی نواز خاں بنیادی بیگم امراؤ بیگم مرزا علی بخش خاں رنجور کے صاحبزادے غلام فخر الدین خاں کی شادی مرزا غالب کی بھتیجی عزیز النساء بیگم بنت مرزا یوسف خاں کے ساتھ ہوئی ان کے صاحبزادے مرزا محمد سعید خاں اور ان کے صاحبزادے میر زا نصر اللہ خاں ہیں جو آج کل سرکار نظام میں صدر محاسب کے عہدہ پر فائز ہیں۔

مرزا علی نواز خاں کا حال معلوم نہ ہو سکا بنیادی بیگم نواب غلام حسین خاں مسرور بن فیض اللہ بیگ خاں بن شرف الدولہ قاسم جان کو منسوب تھیں اور امراؤ بیگم مرزا غالب کو منسوب تھیں۔

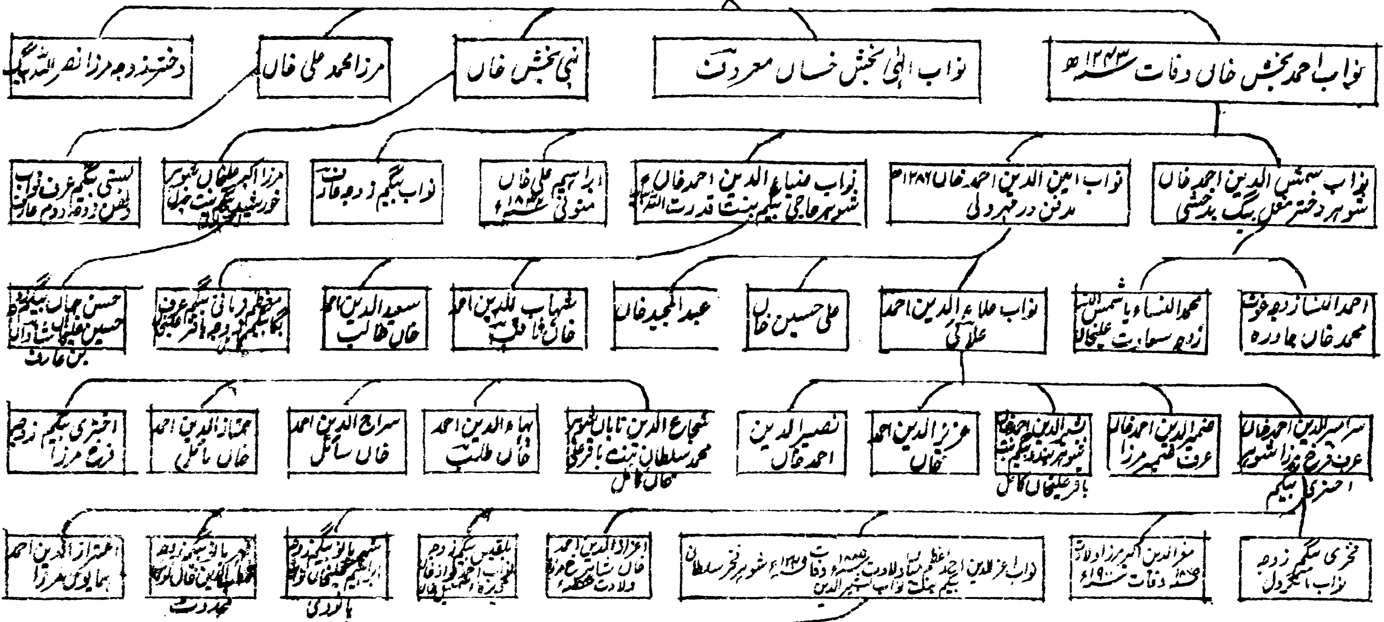
نواب احمد بخش خاں اپنے بزرگ بھائی پر جان چھڑکتے تھے۔ ان پر بیدریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اور ان سے صرف دعا کی التجا رکھتے تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی سخاوت، سیر چشمی اور مہمان نوازی، ذوق شعر و سخن اور اپنے بھائیوں سے محبت و الفت وغیرہ دلچسپ واقعات تفصیل کے ساتھ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں لکھے ہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

نبی بخش خاں کے ایک صاحبزادے مرزا اکبر علی خاں ہمیں معلوم ہو سکے ہیں انھوں نے خورشید بیگم (بنت جنرل اختر لونی) سے شادی کی تھی۔ ان کی صاحبزادی حسن جہاں بیگم مرزا حسین علی خاں شاداں (بن زین العابدین خاں عارف) کو منسوب ہوئیں۔

(مکاتیب غالب از امتیاز علی عرشی صفحہ ۹۵ و ۹۶)

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۳۴



عارف جان
نواب احمد بخش خاں وفات ۱۲۴۳ھ
نواب الٰہی بخش خاں معروف
نبی بخش خاں
مرزا محمد علی خاں
دختر دوم مرزا نصر اللہ بیگ
نواب شمس الدین احمد خاں شوہر دختر مغل بیگ بدخشی
نواب امین الدین احمد خاں ۱۲۸۶ھ مدفون در مہرولی
نواب ضیاء الدین احمد خاں شوہر حاجی بیگم بنت قدرت اللہ بیگ
ابراہیم علی خاں
نواب بیگم زوجہ عارف
مرزا اکبر علی خاں
احمد النساء زوجہ محمد خاں
محمد النساء زوجہ سعادت علی خاں
نواب علاء الدین احمد علائی
علی حسین خاں
عبد المجید خاں
سعید الدین احمد خاں طالب
حسین علی خاں
نصیر الدین احمد خاں
سراج الدین احمد خاں سائل
بہاء الدین احمد خاں طالب
ممتاز الدین احمد خاں مائل
معز الدین احمد مرزا وفات ۱۹۰۰ء
نواب امین الدین احمد خاں ثانی موجود و آخری نواب لوہارو

عالم جان

کالے خاں | رجب بیگ خاں

سپهدار خاں | غلام معین الدین خاں | طرہ باز خاں | محمد علی خاں | بیگم جان

مرزا خاں | معین الدین خاں | غلام نظام الدین | نجم الدین خاں | [illegible] الدین خاں | کریم الدین خاں | حسام الدین خاں داماد قطب الدین خاں

بیگم جان | علی مرزا خاں | مرزا سردار خاں | امتیازی بیگم | قطب الدین خاں | غلام حسین خاں | مرزا بسم اللہ بیگ خاں

امۃ الفاطمہ بیگم عرف خضری بیگم

مرزا اکرم علی خاں ⟷ ریاض الدین احمد خاں مالک [illegible] الاخبار | مرزا افضل علی خاں

مسٹر مالک رام مصنف "ذکر غالب" کو غالباً اس بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس غلط فہمی میں مولانا مہر بھی مبتلا ہو گئے ہیں جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے مرزا اکبر علی خاں نبی بخش خاں کے بیٹے تھے پوتے نہ تھے اور انھوں نے ایک انگریز جنرل ڈیوڈ اختر لونی کی لڑکی سے نکاح کیا تھا حسن جہاں بیگم جس کو غالب نے نواب احمد بخش خاں کے بھائی کی پوتی لکھا ہے مرزا اکبر علی خاں کی بیٹی مبارک بیگم کے بطن سے تھی مبارک بیگم جنرل اختر لونی کی داشتہ تھی (مبارک بیگم کی بنائی ہوئی لال مسجد دہلی میں تھانہ حوض قاضی کے پاس موجود ہے) مرزا غالب نے حسن جہاں بیگم اکبر علی خاں کی بیٹی کا نام لکھا ہے بیوی کا نہیں۔ لہذا مالک رام ایم اے اور مرزا غالب کے بیانات متضاد نہیں معلوم ہوتے۔ (واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص ۳۲۹)

مرزا محمد علی خاں کی ایک لڑکی ستی بیگم (عرف نواب دلہن) تھیں۔ (جو مرزا زین العابدین عارف کی دوسری زوجہ تھیں)۔

نواب احمد بخش خاں عارف جان کے دوسرے صاحبزادے نواب احمد بخش خاں نہایت اچھے جرنیل تھے۔ چند سال مرہٹوں کی خدمت کرنے کے بعد راؤ راجہ بختاور سنگھ والی الور سے اپنی عقیدت ظاہر کی جنھوں نے ان کو بطور معتمد لارڈ لیک کے پاس بھیجا یہ کمانڈر انچیف کے ساتھ بہت سی مہموں میں رہے سر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے ان کی عام خدمات اور خصوصاً اس کارگزاری کے باعث جو انھوں نے اس عہدنامے کے بارے میں کی تھی جو گورنمنٹ انگریزی اور راجہ الور کے ساتھ ہوا ان کو ضلع گوڑگانوہ کے چھ محال فیروزپور جھرکہ، پونا، سانکرہ، بچھور، نگینہ، اور نوبارہ بطور دوام جاگیر میں ملے اس جاگیر کی آمدنی تین لاکھ روپیہ سالانہ تھی گورنمنٹ ہند نے باضابطہ

منظور کر لیا اور نواب احمد بخش خاں کو فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔ نواب موصوف نے ۱۲۴۳ھ میں فیروز پور جھرکا میں جو مسجد بنوائی تھی وہ اب بھی موجود ہے اس مسجد کے حوض کی مکرر تعمیر ۱۳۶۶ھ میں آخری نواب لوہارو امین الدین احمد خاں ثانی کے اہتمام سے ہوئی اس کا قطعہ تاریخ راقم الحروف واصف نے کہا:۔

قطعہ تاریخ تعمیر حوض جامع مسجد جھرکا

امین الدین احمد خان ثانی ہے از آل احمد بخش خانی
رئیس و حکمرانِ لوہارو ملاذ خلق و ملجائے امانی
امیر خوش گہر فرخ نژادے اعز عنصر فخر دودمانی
بہ ایمائش شد این حوض مصفے خجستہ یادگار جاودانی
منور با صفائے آب پاکش ز سطحش تا فضائے آسمانی
بہ صحن مسجد این حوض مطہر چو از تسنیم جام ارغوانی
بہ واصف دہلوی تلمیذ سائلؔ رسیدہ قال یمن و شادمانی

ہزار و سہ صد و شصت آمو ششش
ز ہجرت با بہ نظم این معانی

خواصوں کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں ایک میواتی الاصل جس کا نام مدی خانم عرف بہو بیگم تھا اس کے بطن سے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد اور دوسرے صاحبزادے ابراہیم علی خاں (المتوفی ۱۸۳۲ء) اور ایک بیٹی نواب بیگم تھیں (جو زین العابدین عارف کو منسوب تھیں) اور دوسری بیگم ان کے اپنے خاندان کی تھی اس کا نام بیگم جان تھا یہ غالبؔ نواب احمد بخش خاں کی چچا زاد بہن تھی ان کے بطن سے نواب امین الدین

لہ تاریخ رؤسائے پنجاب صفحہ ۱۱۹

اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔

نواب نے ۱۸۲۲ء میں بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین قرار دیا۔ چونکہ وہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے اس لئے خاندان کے دوسرے افراد جن میں غالب بھی شامل تھے انھیں نسباً اپنا ہم پایہ نہیں گردانتے تھے اس وجہ سے خاندان میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔

معاملے کی نزاکت کو محسوس کرکے نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کی مسند شمس الدین احمد خاں کو دے کر لوہارو سے دست برداری کا اقرار نامہ لکھوالیا اور لوہارو کی جاگیر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو سونپ کر اپنی خاندانی حویلی (واقع مہرولی) میں گوشہ نشین ہو گئے اکتوبر ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) میں وفات پائی اور اپنے پیر مرشد مولانا فخر الدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

نواب شمس الدین احمد خاں | نواب کے انتقال کے بعد تینوں صاحبزادوں میں کافی کشمکش اور رسہ کشی رہی۔ شمس الدین احمد خاں نے دعویٰ دائر کیا کہ لوہارو کی مسند بھی مجھے ملنی چاہیئے اور دونوں بھائیوں کی پنشنیں ہونی چاہئیں۔ آخرکار دونوں جاگیروں کا فیصلہ نواب شمس الدین کے حق میں ہو گیا۔ ۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے یہ نواب احمد بخش خاں کے خاص بے تکلف دوست تھے انھوں نے یہ تجویز کی کہ نواب مرحوم کی تقسیم کے مطابق لوہارو دونوں چھوٹے صاحبزادوں کو ملنا چاہیئے (اس زمانے میں ایسٹ انڈین کمپنی کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ تھا) ولیم فریزر کے مشورے اور تجویز کے مطابق امین الدین احمد خاں نے کلکتہ جاکر قانونی چارہ جوئی کی اور شمس الدین احمد خاں کے خلاف

عارف جان

نواب احمد بخش خاں

نواب الٰہی بخش خاں معروف

نبی بخش خاں

مرزا محمد علی خاں

زوجہ مرزا نصر اللہ بیگ

مرزا علی بخش خاں رنجور

مرزا علی نواز خاں

بنیادی بیگم زوجہ نواب غلام حسین خاں

امراؤ بیگم زوجہ مرزا غالب

بستی بیگم عرف نواب دلہن زوجہ دوم عارف

غلام فخر الدین خاں شوہر عزیز النساء بیگم بنت مرزا یوسف خاں برادر مرزا غالب

حسن علی خاں

مرزا عبد حسن خاں مرزا زین العابدین عارف نبیرہ

میرزا احمد سعید خاں

عبد الرحیم بیگ

حسن جہاں بیگم

میرزا نصر اللہ خاں صدر کاسب سرکار آصفیہ

عبد المجید بیگ

عبد الرحمن بیگ

فیصلہ ہوگیا۔ اس فیصلے کے بعد ولیم فریزر کو ۱۸۳۵ء میں کسی شخص نے قتل کر دیا۔ تفتیش شروع ہوئی قاتل کے ساتھی کے بیان سے نواب شمس الدین احمد خاں پر تحریض قتل کا الزام ثابت ہوگیا اور بڑی زبردست احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد کشمیری دروازہ دہلی کے باہر نوسو فوجیوں کے پہرے میں اس بہادر رئیس کو پھانسی دیدی گئی[2]۔ یہ واقعہ تمام مورخین کے متفقہ بیان کے مطابق ۱۲۵۲ھ میں ہوا[3]۔ نواب شمس الدین احمد خاں قدم شریف میں مدفون ہیں۔ ان کا مدفن اس چبوترے کے پائین ہے جس پر نواب ابراہیم علی خاں والی لوہارو کا مزار ہے یعنی قدم شریف میں داخل ہونے کا جو دروازہ ہے اس دروازہ کے بالکل مقابل چبوترے کے نیچے سنگ مرمر کے تعویذ والی قبر انھیں کی ہے اور دوسری قبر برابر میں نواب شہاب الدین احمد ثاقب یعنی سائل صاحب کے والد کی ہے۔ نواب موصوف کی دو لڑکیاں تھیں احمد النساء بیگم محمد النساء بیگم (یا شمس النساء بیگم) نیز دوجانہ جھرکہ کی ریاست ضبط ہوگئی۔

جب نواب کو پھانسی دی گئی اس وقت داغ کی عمر ۶ سال سے کم تھی ان کی والدہ نے نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پا جانے کے بعد حضور صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد بہادر شاہ کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ محل شاہی میں گزارا اور نواب شوکت محل بیگم خطاب پایا[4]۔ ولی عہد مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو کی پہلی شادی مرزا الٰہی بخش بن مرزا بچہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرزا الٰہی بخش

---

[1] غالب از مہر میں خاندان لوہارو کے مناقشات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ [2] بعض لوگ ولیم فریزر کے قتل کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فریزر صاحب نواب صاحب کے رشتے کی کسی بیگم سے ناجائز تعلقات رکھتے تھے اس بنا پر نواب نے فریزر صاحب کو قتل کرا یا (واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۲۹۰) [3] جلوہ ...

المتوفی ۱۸۷۸ء کی والدہ عمدۃ الزمانی بیگم بنت عالمگیر ثانی تھیں۔ یہ مرزا الٰہی بخش وہی ذات شریف ہیں جو نواب زینت محل کے ہاں کافی رسائی رکھتے تھے اور جنہوں نے شاہ دہلی کو نہایت آسانی کے ساتھ گرفتار کرا دیا تھا۔ شہر اور اندرون لال قلعہ کی ضروری خبریں سرکار انگریزی تک پہنچایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کے اس قابل قدر اور تاریخی کارنامے کے صلے میں سرکار انگریزی کی طرف سے ان کے اور ان کے خاندان کے لئے ۲۲۸۳۰ روپیہ سالانہ کی پنشن نسلاً بعد نسلٍ یکم مئی ۱۸۵۸ء سے عطا کی گئی اس کے علاوہ بہت کافی انعامات و اکرامات سے نوازا گیا[۱]۔ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں "سانڈرس" نے ان کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ "فاتحوں کی خوشنودی کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ کو بھی پکڑوا دے"۔۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد گورنمنٹ چاہتی تھی کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے اس لئے الٰہی بخش جیسے خاندان فروش کو بھی دہلی میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی بہرحال کچھ دنوں کی زاریالی کے بعد انھیں قیام کی اجازت مل گئی اور خاندان شاہی کے ہیڈ قرار پائے عید کے دن انھوں نے چاہا تھا کہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر عیدگاہ جائیں ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا تو چوبدار بھیجکر ممانعت کر دی کہ یہ امتیاز قلعہ کے شہزادوں کو حاصل تھا اب وہ زمانہ گیا۔

فبعداً للقوم الظالمین" (غالب از مہر صفحہ ۲۹۱)

فاعتبروا یا اُولی الابصار۔ نواب شمس الدین احمد خاں کی بڑی صاحبزادی محمد النساء بیگم نواب سعادت علی خاں کو منسوب ہوئیں جو نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے چچا تھے ان کی دو لڑکیاں سکندر جہاں اور اکبری بیگم اور ایک لڑکے نواب قاسم علی خاں مرحوم تھے۔ سکندر جہاں جناب سائل مرحوم کی والدہ ہیں اور اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والی پاٹودی کی زوجہ ہیں نواب قاسم علی خاں کی دو اولادیں ہیں نواب عباس علی خاں اور نواب سردار جہاں بیگم زوجہ نواب ممتاز حسین خاں مرحوم والی پاٹودی۔ نواب شمس الدین خاں کی دوسری صاحبزادی اعظم النساء بیگم

[۱] تاریخ رؤسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب صفحہ ۱۸۹

تدوین حدیث

(۶)

کاپیوں کی ایک خاص ترتیب کی وجہ سے مئی کے رسالے میں اس مضمون کے یہ چند صفحات نہیں آسکے تھے اب انکو اس اشاعت میں دیا جارہا ہے اور اسی اشاعت پر یہ مضمون ختم ہو رہا ہے
مدیر

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات

(جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

جس کا حاصل یہی ہوا کہ صرف گناہگار ہی قرار دینا نہیں بلکہ ان مسائل میں کسی فریق کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے مخالف کو برسر غلطی سمجھے جیسے قرآن کی مختلف متواترہ قرأتوں میں سے کسی قراۃ کے قاری کو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح قرآن نہیں پڑھ رہا ہے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہ میں بھی اس قسم کے اختلافات موجود تھے، باوجود اس کے جب ان میں ہر ایک کو علی الہدی اور برسر حق یقین کیا جاتا ہے تو ان کے بعد ان ہی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو برسر غلطی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے انھوں نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے جو تم دیکھتے ہو کہ سلف ان اختلافی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مسلک کے متعلق اس قسم کے الفاظ لکھا کرتے تھے یعنی

هذا احوط، هذا هو المختار وهذا احب الی وما بلغنا الا ذالك

یہی پہلو احتیاط سے زیادہ قریب ہے، یہی بات زیادہ پسندیدہ ہے، یہ پہلو مجھے زیادہ مرغوب ہے یا یہ کہ نہ پہنچی ہم تک مگر یہی بات

سلف کی کتابوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں

وهذا الكثر في المبسوط والآثار لمحمد وكلام الشافعي ص۹۵ انصاف	(مختلف پہلوؤں میں سے کسی مسئلہ کے متعلق کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے مذکورہ بالا نوعیت کے الفاظ) مبسوط اور کتاب الآثار مصنفہ امام محمدؒ (شاگرد ابو حنیفہ) اور امام شافعی کے کلام میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے کسی گوشہ کو نبوت کی پرچھائیوں اور رسالت کی تجلیوں سے جو خالی رکھنا نہیں چاہتے، دین کے ان دیوانوں، شمع نبوت کے ان پروانوں کے قرار وسکون کے لئے ایک طرف اگر اتنے عظیم ووسیع پیمانے پر انتظام کر دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی پیغمبر کی امت کو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، اور پیغمبر ہی کیا سچ تو یہ ہے کہ پچھلی نسلوں کے لئے اتنے ہمہ گیر ہمہ جہتی معلومات اگلوں کی کسی چھوٹی یا بڑی شخصیت کے متعلق پیش کرنے سے انسانیت کی پوری تاریخ قاصر ہے لیکن جہاں یہ کیا گیا ہے وہیں ان کوتاہ نصیبوں کو بھی مایوس نہیں کیا گیا جن کا سعادت کی اس لازوال دولت میں کوئی حصہ نہ تھا، یا تھا تو بہت کم تھا،

درس بخاری کی املائی تقریر (فیض الباری مطبوعہ مصر) میں اسی مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ الامام مولنا السید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کا یہ فقرہ جو نقل کیا گیا ہے

ان جمع الحديث في عهد النبي صلى الله عليه وسلم وان كان احسن في بادي الرأي الا ان المرضي	نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں حدیثیں اگر جمع ہو جاتیں تو گو بظاہر یہ زیادہ اچھی بات نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت مقصد ہی یہ تھا

ان ذلک کان اولا تدوین الاحادیث مثل تدوین القرآن ولا یحفظ حفظہ مشتہ ج ۱

کہ حدیثوں کی تدوین ہی اس طریقہ سے نہ ہو جیسے قرآن کی تدوین پر غیر معمولی توجہ صرف کی گئی اور قرآن کی حفاظت میں جو دلچسپی لی گئی، یہ کیفیت حدیث کی تدوین میں نہ پیدا کی جائے

سچ پوچھئے تو اسی اجمال کی یہ تفصیلات تھے جو اس وقت تک آپ کے سامنے پیش کئے گئے۔ شاہ صاحب نے اس کے بعد فرمایا ہے کہ دین میں عام حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی جو ثانوی حیثیت ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ کسی اتفاقی حادثہ کا یہ اتفاقی نتیجہ ہے، بلکہ شروع ہی سے ارادہ ہی یہ کیا گیا کہ حدیثوں کا یہ سرمایہ

لا تنتھی فی الحفظ نھائتہ ولا تبلغ فی الاھتمام بالفاظھا مبلغھا بل تبقی فی مرتبۃ ثانیۃ یمشی فیھا الاجتہاد وتخوض العلماء وغوص الفقھاء وبحث المحدثین

قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے اور نہ اس کے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے جو قرآن کی تدوین میں دکھائی گئی) بلکہ قصداً وارادۃً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا (کہ قرآن کے مقابلہ میں، ان کا درجہ دوسرا ہو گیا ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد اور تحقیق و تدقیق کی فقہاء کی فکر و نظر اور محدثین کی تلاش و جستجو کی گنجائش ان میں پیدا ہو گئی

اور یہ کس لئے کیا گیا شاہ صاحب اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

تینفسح علیھم امر الدین ویتیسع علیھم من کل جانب

تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں ان کو میسر آ جائیں

اور آخر میں وہی بات کہ عام لوگوں کے لئے دین کو آسان بنانے کی یہی شکل تھی اسی کی طرف شاہ صاحب مرحوم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

صدق حیث قال ان الدین یُسرٌ

سچ فرمایا گیا کہ الدین صرف سہولت اور آسانی ہے

تبصرے

نزہۃ الخواطر فی بہجۃ المسامع والنواظر (عربی) از مولانا سید عبدالحئی الحسنیؒ تقطیع کلاں ضخامت ۴۰۲ صفحات ٹائپ جلی مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن قیمت درج نہیں۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی جب کہ اسلام کے آفتاب صداقت کی سرزمین عرب سے بلند ہو کر عجمی ممالک پر اپنی کرنیں بکھیرنی شروع کیں تو ہندوستان کی زمین بھی اس کی نورپاشیوں سے محروم نہ رہی۔ سندھ میں عربوں کے علاوہ ملک کے دوسرے گوشوں میں مختلف مسلمان خاندانوں نے بڑے جاہ وجلال کے ساتھ سلطنتیں قائم کیں صوفیائے کرام نے روحانی تزکیہ وتصفیہ باطن کی خانقاہوں میں طریقت ومعرفت کی شمعیں روشن کیں علماء نے مدارس میں علوم وفنون کی محفلیں گرم کیں۔ شعراء نے شعر وادب کی بزم کو نغمہ سرای سے رونق بخشی ارباب قلم وتصنیف نے صفحہ قرطاس پر موتیوں کی چادریں بچھائیں اوران سب کی کوششوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ چند صدیوں میں ہی مرزوبوم ہند خطۂ بغداد وقرطبہ کا ہم نشین ہو گیا اور کوفہ وبصرہ کے علمی ودینی شہ نشینوں سے دعوائے چشمک زنی کرنے لگا لیکن نہایت افسوس ہے کہ عرب مورخین نے کچھ تو اپنی عربی عصبیت کی وجہ سے اور کچھ اور اسباب کی بناء پر ہندوستان کی ان کوششوں کو اپنی کتابوں میں وہ مرتبہ نہیں دیا جس کا کہ وہ بجا طور پر مستحق تھا چنانچہ حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں امام سخاوی نے الضوء اللامع میں اور قاضی شوکانی نے البدر الطالع میں اور حضرمی نے النور السافر میں ہندوستان کے صرف انھیں چند علماء کا تذکرہ کیا ہے جو یہاں سے ہجرت کر کے

عرب ممالک میں آباد ہوگئے تھے یا ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہے تھے حدیہ ہے کہ امام سخاوی نے اپنی کتاب میں گیارہ ہزار چھ سو گیارہ اصحاب کے تراجم لکھے اور وہ خود اس کے مدعی بھی ہیں کہ انھوں نے کسی ملک کی کسی قابل ذکر شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود علمائے ہند میں ان کو صرف ۴۸ شخصیتیں نظر آئیں جن کو وہ اپنی وسیع و ضخیم مجلدات میں جگہ دے سکے۔ قاضی شوکانی جو نسبتہ ہند کے علماء سے زیادہ واقف تھے انھوں نے تقریباً چھ سو اصحاب کی طویل فہرست تراجم میں ہندوستان کے صرف سات علماء کا ذکر کیا ہے۔

اس بنا پر بڑی ضرورت تھی کہ علمائے ہند میں سے ہی میدان تصنیف و تالیف کا کوئی شہسوار اٹھے اور اپنے ملک کے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرے نہایت مسرت کی بات ہے کہ مولانا سید عبدالحیٔ صاحب الحسینی مرحوم جو ہمارے گذشتہ کاروان علم و ادب کے ایک نہایت نامور اور تیز گام مسافر تھے انھوں نے اس بار گراں کو اپنے ذمہ لیا اور نزہتہ الخواطر کے نام سے آٹھ جلدوں میں ایک محققانہ اور مستند کتاب بزبان عربی تصنیف کر دی مولانا کو سب علوم سے عموماً اور تاریخ و روایت سے خصوصاً بڑا لگاؤ تھا مطالعہ وسیع رکھتے تھے حافظہ بلا کا تھا پھر تنقید کا ذوق بھی بڑا صاف ستھرا اور پاکیزہ پایا تھا اس بنا پر مرحوم کا یہ کارنامہ علمی اور ادبی اعتبار سے کسی طرح ہمارے کسی متقدم مصنف تراجم کے کارنامہ سے کم نہیں ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے مولانا کی وفات ہوگئی اور ان کی زندگی میں اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا کام سر انجام نہیں پا سکا اب ایک مدت کے بعد سرکار آصفیہ کی امداد و توجہ سے اس کی پہلی جلد جو اس وقت زیر تبصرہ ہے چھپ کر آئی ہے اس جلد کے شروع میں مولانا مرحوم کے خلف الصدق مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب

کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جس میں موصوف نے پوری کتاب کا عطر نکال کر رکھدیا ہے اس کے بعد خود فاضل مصنف کے قلم سے ایک مختصر مقدمہ ہے پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں پہلی صدی سے ساتویں صدی تک کے مشاہیر علم و فن کا تذکرہ ہے ان مشاہیر کو صدی وار بیان کیا گیا اور ہر صدی کے علماء کو ایک طبقہ قرار دیا گیا ہے اس طرح یہ کتاب سات طبقات پر مشتمل ہے۔

مولانا نے اس میں صرف واقعات و تراجم کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ممکن الوصول ذرائع و وسائل کی روشنی میں ان کی تحقیق و تنقید بھی کی ہے اور حواشی میں جو تاریخی اور جغرافیائی نوٹس لکھے ہیں، ان میں بعض مثلاً ص ۷ پر تانہ کی تحقیق "بہت کام کے ہیں ان سے قدیم تاریخوں کے بیانات سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو جاتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ معلومات، ترتیب، تحقیق و تنقید اور زبان و بیان ہر اعتبار سے یہ کتاب عربی ادبیات کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے پہلی جلد تو شائع ہو گئی لیکن اب جبکہ "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" کا عالم ہے نہیں کہا جا سکتا کہ باقی جلدوں کی طباعت کا کیا اور کب تک سامان ہوگا۔ اس تصور سے بڑی حسرت ہوتی ہے "دیکھئے" کس کے گھر جائے گا یہ سیلاب بلا۔

..... بعد! (س)

بُرہان

جلد بست و دوم — شمارہ (۵)

مئی سنہ ۱۹۴۹ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

افسوس ہے گذشتہ ماہ کے نظرات ڈاک میں گم ہوگئے اور برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کو باوجود صاحب فراش ہونے کے زحمتِ خامہ فرسائی کرنی پڑی بہرحال مقام اشاعت سے اس قدر دور ہونے کا یہ ناگزیر نتیجہ ہے اور ایک یہ ہی کیا

سر ہے تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

اس کے علاوہ تبصروں کا نظم بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن امید ہے کہ آئندہ ماہ سے تبصرے بھی باقاعدہ شائع ہوں گے قارئین اور ناشرین کتب اطمینان رکھیں۔

مارچ کے نظرات میں اس طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ ملک کے آزاد ہوتے ہی اُردو زبان وادب۔ اور اسلامی علوم وفنون میں تصنیف وتالیف کی گرم بازاری ہونی چاہیے تھی لیکن اس کے برعکس ناگزیر اسباب کی بنا پر ہو یہ رہا ہے کہ ہماری پُرانی مطبوعات بھی بازار سے غائب ہوتی جارہی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر حالات یہ ہی رہے تو شاید پورے ملک میں عربی، فارسی اور اُردو کی ایک قابل ذکر کتاب بھی دستیاب نہ ہوسکے ضرورت ہے کہ مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں اور دلوں سے یاس وتشنگی کو دور کرکے پھر اپنی رگوں میں زندگی کا نیا خون پیدا کرنے کی سعی کریں۔

انھیں یاد کرنا چاہئے کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب آیا تھا اور جس نے مسلمانوں کی حیات

ملی کو سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا اس کا فوری اثر یہ ضرور ہوا کہ تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں پر جمود مطلق طاری ہوگیا لیکن پھر مختلف سمتوں سے چند خدا کے بندے اُٹھے اور انھوں نے علم و ادب کے کالبدِ بے روح میں حرکت ہی پیدا نہیں کی بلکہ بعض اعتبارات سے اسے پہلے سے زیادہ مضبوط اور تندرست و توانا بنا دیا۔ دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلماء۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ دارالمصنفین۔ ندوۃ المصنفین۔ جامعہ ملیہ اور اس طرح کے اور بیسیوں ادارے سب اسی عہد "غلامی" کی یادگار ہیں اور پھر مولانا نانوتوی۔ سید انور شاہ۔ شیخ الہند۔ شبلی حالی۔ اکبر۔ اقبال۔ ابوالکلام۔ حسین احمد۔ اور سید سلیمان ندوی یہ اور ان جیسے اور اکابر و افاضل علم و ادب سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ علمی، ادبی اور ثقافتی اعتبار سے مسلمانان ہند کا یہ دوران کے سابق دورِ حکومت سے بہتر اور عمدہ تر نہیں تھا۔

مسلمانوں نے اس دور میں ایک طرف جدید علوم و فنون حاصل کئے اور ان میں تصنیف و تالیف کی اور دوسری جانب اپنے قدیم سرمایۂ علوم و فنون کی حفاظت کا یہ بندوبست کیا کہ ان کی تعلیم کے لئے مدارس قایم کیے اور پرانی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اسی سلسلہ میں نولکشوری پریس۔ مطبع مجتبائی اور کانپور و کلکتہ کے دوسرے مطابع نے جو اہم اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری نہضتِ قومی کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہیں اگر ان مطابع کے مالک مسلمانوں کی اجتماعی موت کا یقین کر کے پرانی کتابوں کی اشاعت و طباعت کا کام سرانجام نہ دیتے تو کوئی شبہ نہیں کہ آج ہمارے علوم و فنون کا بازار کبھی کا سرد ہوگیا ہوتا اور ہمیں اپنے اسلاف کے کارناموں کی ہوا بھی نہ لگتی۔

یہاں اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئیے کہ ان مطابع کے مالکوں نے صرف علوم و فنون کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی انھوں نے بے شمار منافع حاصل کئے ایک ایک نے لاکھوں روپیے پیدا کئے آج ان لوگوں کی نسلیں اسی زمانہ کی کمائی کے سہارے نوابی کر رہی ہیں۔

پس موجودہ حالات میں ہمیں اس دور سے سبق لینا چاہئے اور پورے عزم و حوصلہ اور ولولہ کے ساتھ علمی و دینی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی ترقی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے اس سلسلہ میں اگر مسلمان ملی تنظیم و تعمیر کا ایک ہمہ گیر پروگرام بنا کر اس کو شروع کریں تو زیادہ اچھا ہوگا ورنہ انفرادی طور پر بھی اس کام کو اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ صورت حال سے مایوس نہ ہو کر متمول ارباب مطابع عربی، فارسی اور اردو کی پرانی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ چھاپنے کا بندوبست کریں۔ ان کا یہ کام ایک بڑی قومی خدمت ہوگا اور امید قوی ہے کہ تجارتی طور پر بھی وہ گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ ایک پرانا اور مشہور تصنیفی ادارہ ہے اور اس نے اسلامی تاریخ و سیر کی خصوصاً اور دوسرے علوم و فنون کی عموماً اردو زبان میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور علمی طریقہ پر جس طرح اسلامیات کی اشاعت کی ہے وہ اردو زبان کا سرمایۂ افتخار ہیں ملک کے حالات اس ادارہ کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہے چنانچہ ابھی حال میں ادارہ کے چند ذمہ دار عمائد کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی ہے جس میں ادارہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس جیسے ادارہ کی نہ صرف بقا بلکہ اس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی سعی کرنا مسلمانوں کا خصوصاً اور ارباب ذوق کا عموماً ایک اہم وقتی فریضہ ہے امید ہے کہ دردمند اصحاب بہ تعداد کثیر اس ادارہ کے ممبر بنیں گے اور اس کو باقی رکھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں گے۔

تدوین حدیث

تدوین حدیث کا ماحول

(۵)

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات
(جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

اس کو بھی جانے دیجئے کہ پیغمبرؐ کی طرف کسی جھوٹ کو منسوب کرنا خود اپنے اندر کن ہولناک نتائج کو پوشیدہ کئے ہوئے ہے ایک کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا، درحقیقت یوں سمجھنا چاہیئے کہ منسوب کرنے والا اس کا انتساب اس خدا کی طرف کر رہا ہے جس کی مرضی کی نمائندگی کرنے کے لئے پیغمبر اٹھایا اور بھیجا جاتا ہے پھر کیا جن بزرگوں کی راہ سے ہم تک حدیثیں پہنچی ہیں، ان کو ہم اتنا بڑا مجرم ٹھیرالیں جس سے بڑا مجرم قرآن کا فیصلہ ہے کہ کوئی دوسرا نہیں ہے، ایک سے زائد جگہوں پر فرمایا گیا ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو خدا پر افترا کرتا ہے اور خدا کی طرف جھوٹ بات منسوب کرتا ہے۔ ان جن کی زندگی ادسر تا پا مجرمانہ ہے کیا خدا کی شان ہے وہی اللہ کے دوستوں، رسول کے جانبازوں کو مجرمین کی اس جماعت میں شریک کرنے کی جسارت کر رہے ہیں

جن سے بڑا مجرم قرآن کی رو سے کوئی نہیں ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان بزرگوں کو مجرم ٹھیرانے کی اس مہم میں چاہتے ہیں کہ سارے مسلمانوں کو گھسیٹ لیں۔ بلا خوف تردید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انکارِ حدیث کے فتنہ پردازیوں کا آخری انجام یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے۔

حدیث اور رواۃِ حدیث کے مقابلہ میں عصری ہنگامہ آرائیوں کا اگر یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ کہنے والے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دین کے بیّنات[1] کی حفاظت و اشاعت کی جو سرگرمیاں میسر آئی ہیں چونکہ صحاح کی عام حدیثوں (یعنی اصطلاحاً جنہیں خبرِ احاد کہتے ہیں) ان کے ساتھ شروع ہی سے یہ سلوک اختیار نہیں کیا گیا اس لئے ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج و احکام کو چاہا جاتا ہے کہ اعتماد و وثوق قطعیت

[1] بیّنات کی یہ اصطلاح قرآن سے ماخوذ ہے دین کے ان عناصر و اجزاء کی یہ تعبیر ہے جن کا تعلق دین سے آدمی کے عقلی احساسات کے آگے اتنا واضح وبیّن اور کھلا ہوا ہو کہ سوچنے والے دین کو ان کے بغیر اور ان کے بغیر دین کو سوچ نہیں سکتے تو ارث و تعامل کی حیثیت بنا ہی میں نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں جو چیزیں آغازِ اسلام سے منتقل ہوتی ہوئی ان متواترات کی شکل اختیار کر چکی ہیں جن کے انکار کی گنجائش آدمی کی فطرت میں نہیں رکھی گئی ہے ان کے انکار کی جرأت اسی قسم کی جرأت ہے کہ کوئی یہ کہنے لگے کہ دنیا اسی وقت سے پائی جاتی ہے جب سے ہم اسے دیکھ رہے ہیں، باقی کہنے والے جو یہ کہتے ہیں اور خبر دیتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی دنیا موجود تھی آفتاب ماہتاب پائے جاتے تھے یہ صرف خبر دینے والوں کی ایک تراشی ہوئی خبر ہے ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو یہی سمجھا جائے گا کہ انسانی فطرت اور اس کے قدرتی اقتضاؤں سے وہ محروم ہو چکا ہے، بالفاظ دیگر پاگل اور دیوانہ ہے۔ بہر حال دین اسلامی کے بیّنات مثلاً قرآن ہی کو لیجئے۔ کیا قرآن کو الگ کر کے کوئی اسلام کو سوچ سکتا ہے اور یہی حال اسلام کی ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی اگلوں سے پچھلوں میں آرہی ہیں جس راہ سے قرآن منتقل ہوتا ہوا آرہا ہے۔ بیّنات اور غیر بیّنات کے مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب تدوین فقہ ۱۲

ویقین کا وہ مقام حاصل نہ ہو جو دین کے بیّنات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کی خصوصیت ہے، اگر واقعی کہنے والے یہی کہنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا منکر کون تھا مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ ماننے والوں نے آج ہی کیا ہمیشہ سے یہی مانا ہے اہمیت میں شرعی قوانین کے ان دونوں سرچشموں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اس کا قائل ہی کون تھا جس کی تردید کی خواہ مخواہ زحمت اُٹھائی جا رہی ہے، مانی ہوئی بات کو منوانے کے لئے بھلا ان بے ہنگام شورشوں کی کیا ضرورت تھی، یہی نہیں بلکہ ان حدیثوں میں بھی کون قائل ہے کہ سب کا درجہ اعتماد میں برابر ہے جن حدیثوں کی سند میں یعنی بیان کرنے والوں کے سلسلہ میں یا متن میں جہاں جہاں کوتاہیاں پائی گئی ہیں۔ ان کوتاہیوں سے کس زمانے میں چشم پوشی کی گئی ہے؟ بندگانِ خدا! آپ نے کیا نہیں سنا ہے کہ حدیثوں کے اسی ذخیرے میں صحیح حدیثوں کے ساتھ حسَن اور ضعیف حدیثوں کی نشاندہی خود محدثین نے کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کے علمی مجاہدات اور جان پر کھیل کر جو معلومات انھوں نے فراہم کئے ہیں ان ہی مجاہدات اور معلومات کی روشنی میں ہم نے ان روایتوں کو پہچانا ہے اور پہچان سکتے ہیں جن کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب درست نہیں ہے الغرض اس سلسلے میں کام کرنے کا کونسا کام تھا جو اٹھار کھا گیا ہے آپ اگر ان سے ناواقف ہیں تو آئیے اور مجھ سے اس داستان کی تفصیل سنئے میں خیال کرتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ مرحومہ اور ملتِ منصورہ کی فکر میں گھلنے والوں پر اس کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گا کہ ان خود ساختہ انکار اور خود آفریدہ اوہام وشکوک میں ان کا گھلنا بھی بے معنی ہے اور دوسروں کو بھی گھلانے کی کوشش

جو ان کی طرف سے مسلسل جاری ہے لاحاصل کوشش ہے بلکہ اگر کہا جاتے تو کہا جا سکتا ہے کہ مجرمانہ کوشش ہے اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ۔ وسیعلمون الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۔

ان لوگوں کے لئے جو نہیں جانتے ہیں یا جانتے ہیں مگر سوچنے کا موقعہ ان کو نہیں ملا ہے، سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں مستحقِ توجہ یہ ہے کہ دین کے لئے "بینات" کو نگرانی و حفاظت، تبلیغ و اشاعت میں جو تاریخی سرگرمیاں میسر آئی ہیں ان سرگرمیوں سے حدیثوں کا وہ ذخیرہ کیوں مستفید نہ ہو سکا جن سے پیدا ہونے والے نتائج و احکام کو تعامل و توارث کی قوت حاصل نہیں ہے یعنی وہی حدیثیں جنھیں خبر احاد کہتے ہیں ان کے ساتھ یہ صورتِ حال کیوں پیش آئی؟ آیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے، یا قصداً و ارادۃً ان کو اس حال میں رکھا گیا ہے؟ اس حادثہ کو اتفاقی واقعہ قرار دینے میں علاوہ دوسرے اسباب و وجوہ کے جو ابھی بیان کئے جائیں گے اگر سوچا جاتے تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی آخر اتفاق کا کیا مطلب ہوگا؟ یہی تو کہ ان کی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری جن لوگوں پر عاید ہوتی تھی، ان لوگوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں اور بجائے اس کے بے اعتنائی اور بے توجہی سے کام لیا، ظاہر ہے کہ یہ کام تو ان ہی لوگوں کا تھا۔ جو دین اسلامی کے سب سے پہلے محافظ اور مبلغ ٹھیرائے گئے تھے۔ پھر کیا العیاذ باللہ صحابۂ کرام بلکہ فالکم بدمن خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان بے مہریوں اور بے اعتنائیوں کو منسوب کر دیا جائے؟

ابتدائی تاسیس و آغاز کی تاریخ اسلام کی بھی اگر وہی ہوتی جو تاریخ دنیا ان اکثر مذاہب و ادیان کی ہے جن سے ہم واقف ہیں، تو شاید اس کے تصور کی ا

حدتک گنجائش بھی پیدا ہو سکتی تھی، یعنی کہا جاسکتا تھا کہ یہ مجبوری کا نتیجہ تھا لیکن کون نہیں جانتا کہ ظہور کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان سیاسی طاقت اسلام کی حیثیت بنا ہی کے لئے اس کی تاسیس و آغاز کی ابتدائی دنوں ہی میں مہیا ہوگئی اور کیسی سیاسی طاقت؟ کل دس پندرہ سے بیس سال کے اندر بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ زمین کی سب سے بڑی قاہرہ حکومت و سلطنت اسلام کی حفاظت و بقاء تبلیغ و اشاعت کو اپنا واحد نصب العین قرار دیتے ہوئے قائم ہو چکی تھی، آخر اسی دین اسلام کے بینات کے متعلق بقول ابن حزم دنیا کی یہی سب سے بڑی طاقتور حکومت جب اس تماشے کو پیش کر چکی تھی کہ

ولی عمرؓ ففتحت بلاد الفرس	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد خلافت
طولاً وعرضاً وفتحت الشام کلھا	کی باگ ہوئی، ان کے زمانہ میں ایران کا سارا
والجزیرۃ ومصر ولم یبق بلد	علاقہ فتح ہوا، اسی طرح شام والجزیرہ (دجلہ
الا وبنیت فیہ المساجد ونسخت	فرات کا درمیانی علاقہ) مصر یہ سارے علاقے
فیہا المصاحف وقرء ائمۃ القرآن	فتح ہوئے، اور ان تمام ممالک میں کوئی ایسا
وعلمہ الصبیان فی المکاتب شرقاً	ملک باقی نہ رہا جس میں مسجد نہ تعمیر ہوئی ہو ہر ملک
وغرباً وبقی کذلک عشرۃ اعوام	میں قرآن کے نسخے لکھے گئے۔ قرآن کے پڑھنے
واشھراً ص ۶۷ ج ۲	والوں نے انہیں پڑھا اور مکتب خانوں کے بچوں
	کو پڑھایا گیا، مشرق و مغرب ہر جگہ یہی کیا گیا حضرت
	عمرؓ دس سال اور کچھ مہینے زندہ رہے، اور اسی
	زمانہ میں یہی حال ان سارے مفتوحہ علاقوں کا تھا

لہ لڑکے تو لڑکے اسی سے اندازہ کیجئے کہ خراسان جیسے دور دراز مقام میں لکھا ہے کہ ابن عباس کے شاگرد
بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اسی دس سال کچھ مہینے کے اندر یہ ہوگیا جیسا کہ ابن حزم ہی نے لکھا ہے کہ

وان لم یکن عند المسلمین اذ مات	جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی
عمر مائۃ الف مصحف من مصر	وفات ہوئی، تو مصر سے لے کر عراق تک اور
الی العراق الی الشام الی	عراق سے شام تک شام سے یمن تک قرآن
الیمن فما بین ذلک فلم یکن	کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے ان کی تعداد اگر
اقل ص ۷	ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

سوال یہی ہے کہ جس حکومت کی طاقت سے یہ کام قرآنی نسخوں کے پھیلانے میں لیا گیا تھا وہی حکومت اگر چاہتی تو پچیس تیس ہزار حدیثوں کے اس مجموعہ کی حفاظت واشاعت کا انتظام اسی پیمانے پر کیا وہ نہیں کر سکتی تھی، جس پیمانے پر قرآن کی حفاظت واشاعت کا فرض انجام دیا گیا جس کے قلمرو کے ایک ایک قطعہ اور خطہ کی آمدنی سے لوگ فرعون اور نمرود کی شان وشوکت کو مہیا کر سکتے تھے، خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس حکومت کے قبضے میں یہ سارے علاقے ہوں وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی میں یہ مبالغہ نہیں کرونگا اگر کہوں جس قاہرہ حکومت کی اضرت وتائید اسلامی دین کو اپنی تاریخ کے ابتدائی دنوں میں میسر آگئی تھی سونے کے پتروں پر جواہرات کے حروف میں بھی ان حدیثوں کو وہی حکومت اگر لکھوانا چاہتی تو یقیناً وہ لکھوا سکتی تھی، یہی الجزیرہ (عراق وعرب) کے حکمرانوں نے ذات ودجلہ کے کنارے سونے کی کتنی گائیں ڈھلوا ڈھلوا کر گڑوا دیے تھے یا مصر کے بادشاہوں نے جو کچھ کیا یا جو کچھ وہ کر سکتے تھے اس کا اندازہ ان کی قبروں سے برآمد ہونے والی چیزوں سے ہو سکتا ہے آخرمہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ضحاک بن مزاحم کے مکتب خانوں میں ہزار ہا لڑکوں کے ساتھ سات سو لڑکیاں پڑھتی تھیں صفحہ مفتاح السعادہ ج ۱ اور یہ حال اسلام کے ابتدائی عہد کا ہے ۱۲

ہی کی تو آمدنی تھی، جس سے سکندریہ میں جیسا کہ کہا جاتا ہے چھ لاکھ کتابوں کا کتب خانہ قایم کیا گیا تھا پھر اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسی آمدنی کی وارث حکومت کو بیس تیس ہزار حدیثوں کے مجموعے کے لکھوانے سے بھی معذور و مجبور قرار دیا جائے، اور یہ حال تو خیر عہد صحابہؓ کا ہے خود نبوت کا جو دور تھا مانا کہ اس وقت کی حکومت کے طول و عرض میں اتنا اضافہ نہ ہوا تھا۔ لیکن جو حکومت اس وقت بھی قایم ہو چکی تھی جیسا ابن حزم ہی کے الفاظ میں اس نے یہ کر کے دکھایا تھا

الاسلام قد انتشر وظهر فی	اسلام (نبوت کے آخری زمانہ میں) پھیل گیا
جمیع جزیرة العرب من منقطع	اور سارا جزیرۂ عرب یعنی بحر قلزم سے جو خط
البحر المعروف ببحر القلزم مارًا	یمن کے ساحل سے گذر کر خلیج فارس کے
الی سواحل الیمن کلها الی بحر	آخری حدود تک پہنچتا ہے اور وہاں سے
فارس الی منقطعه مارًا الی	دریائے فرات پر آکر ختم ہوتا ہے پھر فرات
الفرات ثم علی ضفة الفرات	سے گذرتے ہوئے شام کے آخری حدود
الی منقطع الشام الی بحر القلزم	پر پہنچ کر بحر قلزم سے خط جو مل جاتا ہے
وفی هذه الجزیرة من المدن	اس سارے علاقے میں اسلام غالب
والقری مالا یعرف عدده الا	آگیا ظاہر ہے کہ عرب کے اس جزیرے میں
الله عز وجل کالیمن والبحرین،	شہر بھی تھے اور دوسری آبادیاں بھی تھیں
وعمان ونجد، وجبل طی، بلاد	ایسی آبادیاں جن کی صحیح تعداد اللہ عز وجل
مضر وربیعة وقضاعة والطائف	کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً یمن۔ بحرین
ومکة وکلهم قد اسلم وبنوا المساجد	عمان۔ نجد۔ اجبل۔ طی، مضر و ربیعہ و قضاعہ

لیس منها مدینة ولا قریة ولا حلة لاعراب الاوقد قرء فیها القرآن فی الصلوات وعلم الصبیان والرجال والنساء ص ۹۶ ج ۲	کے علاقے اسی طرح طائف کا شہر مکہ کا شہر (عہد نبوت کے آخری عہد میں) ان علاقوں کے باشندے اسلام قبول کر چکے تھے اور مسجدیں تعمیر کرلی تھیں، پھر ان میں کوئی شہر کوئی آبادی یا بدویوں کی فرودگاہ ایسی نہ رہی تھی جن میں نمازوں کے اندر قرآن نہ پڑھا جاتا تھا، اور مکتب خانوں میں بچوں کو اسی طرح مردوں اور عورتوں کو قرآن نہ پڑھایا گیا تھا۔

کیا عہد نبوت کی اسی حکومت کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا تھا کہ قرآن اور قرآن کے ساتھ دین اسلام کے دوسرے بنیادی عناصر کی اشاعت عام میں اپنی جس طاقت کا مظاہرہ اس شکل میں جیسے اس نے کیا تھا کہ بقول ابن حزم۔

"پانچ وقتوں کی نمازوں میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ مومن ہو یا کافر کسی کے لئے اس شبہ کی گنجائش" ان میں نہ چھوڑی گئی، ان میں ہر ایک جانتا ہے کہ ان نمازوں کو مقررہ اوقات پر پیغمبر اپنے صحابیوں کے ساتھ پڑھتے رہے اور جو بھی جہاں کہیں آپ کے دین میں داخل ہوتے وہ بھی ان نمازوں کو پڑھتے رہے اور آج تک پڑھ رہے ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے اس یقین کو ہر ایک اپنے دل میں پاتا ہے کہ سندھ والے بھی ان نمازوں کو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اندلس والے ان کو ادا کرتے ہیں آرمینیہ کے باشندے ان ہی نمازوں کو پڑھتے ہیں جو یمن والے پڑھتے ہیں یہی حال رمضان کے روزوں کا ہے کہ نہ کسی مومن کے لئے شک کی گنجائش باقی رہی اور نہ کافر کے لئے کہ رمضان میں آنحضرت صلعم نے روزے رکھے اور جہاں کہیں جو لوگ

بھی آپ کے دین میں داخل ہوئے وہ بھی ہر سال ان روزوں کو رکھتے ہیں، اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ رمضان کے روزوں کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے یہی حال حج کا ہے کہ مومن ہو یا کافر سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی حج کیا اور اس کے مناسک کو ادا فرمایا، اور ہر علاقہ کے مسلمان ہر سال ایک ہی مہینہ میں اس کو ادا کرتے ہیں، الغرض یا اور اسی قسم کی وہ ساری چیزیں جن کا قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت، مردار اور سود وغیرہ کی حرمت وغیرہ ملل والنحل ابن حزم صفحہ ۶۸ ج ۲

جس طاقت سے کام لے کر ان دینی عناصر کو قطعیت کا یہ رنگ بخشا گیا تھا کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ قطعیت کے اسی رنگ کو، اسی طاقت اور قوت کو اگر خبر احاد والے احکام ومسائل میں بھی بھرنے کا ارادہ کیا جاتا تھا تو اس مقصد کی تکمیل سے اسی حکومت کو کون روک سکتا تھا، حکومت تو بہرحال حکومت ہی ہوتی ہے ان ہی حدیثوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی انفرادی شخصیتوں نے پچھلے زمانے میں جب چاہا تو واقعۃً ان کو آب زر اور سونے کے پانی سے لکھوایا۔ مفتاح السعادہ میں ابو محمد مزنی ایک عالم کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

امر بکتاب اللہ عز وجل وبصحیح البخاری فکتبوا لہ بماء الذہب من الاول الی آخرہ ص ج ۲	کتاب اللہ یعنی قرآن مجید، اور صحیح بخاری کے متعلق انھوں نے حکم دیا تو لوگوں نے آب زر سے دونوں کتابوں کو اول سے آخر تک لکھا

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اتفاقاً کتابوں میں اس قسم کے واقعہ کا ذکر آگیا ورنہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہوگا، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ طلائی حروف کے

قرآن کے نسخے آج بھی جس کا جی چاہے اوسط درجے کے جس اسلامی کتب خانہ میں چاہے دیکھ سکتا ہے[1] قرآن کے لکھوانے میں جو جذبہ کار فرما رہا ہے حدیثوں کے متعلق کیوں سمجھا جائے کہ وہی جذبہ اثر انداز نہ ہوا ہوگا خیال تو کیجئے تیسری صدی ہجری کا زمانہ ہے، ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب کتاب الاموال لکھی تھی، جس میں "مالیات" کے متعلق عہد نبوت و عہد صحابہ کے آثار جمع کئے گئے ہیں گویا براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل مسند حدیثوں ہی پر یہ کتاب مشتمل نہیں ہے بلکہ حدیثوں کے ساتھ ساتھ صحابہ تابعین کے آثار اور فتوے سب ہی طرح کی چیزیں اس میں پائی جاتی ہیں لیکن بایں ہمہ اندازہ کیجئے مسلمانوں کے جذبات کا، ابن عساکر کا بیان ہے کہ احمد بن مہدی بن رستم اصفہانی محدث المتوفی ۲۷۲ھ خود کہتے تھے کہ میں نے ابو عبید سے عرض کیا۔

یا ابا عبید رحمک اللہ اسایلان	ابو عبید اللہ اپنی رحمت آپ پر نازل کرے
اکتب کتاب الاموال بماء الذھب	دکہ ایسی کتاب آپ نے لکھی) میں چاہتا ہوں
ص ۲۰۱ ج ۲	کہ آپ کی کتاب الاموال کو آب زر سے لکھواؤں

لیکن خود ابو عبید نے ابن رستم کو اس سے منع کیا اور کہا کہ حبر (مائل بسرخی سیاہی) سے لکھوانا بہتر ہوگا، کیونکہ دیر تک اس کا اثر باقی رہتا ہے یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ ابن رستم

---

[1] صوبہ بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں خضر چک میں مولویوں کے گھرانے میں ایک کتب خانہ کے دیکھنے کا موقع مجھے ملا تھا، منجملہ دوسرے نوادر کے میں نے حدیث کی دعاؤں کی کتاب "حصن حصین" کا ایک نسخہ وہاں دیکھا تھا جس کی زمین نیلم کے پانی سے اور دوسرے رنگ سے تیار کی گئی تھی، اور حروف اول سے آخر تک طلائی تھے عنوانات اور فصول حل کردہ موتی کے پانی سے لکھے گئے تھے غالباً ابھی وہ نسخہ خضر چک میں موجود ہوگا۔

نے صرف ارادہ ہی کیا تھا، میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ابو عبید نہ روک دیتے تو ضرور اپنے ارادے کو وہ پورا کر کے رہتے، آخر جس شخص کے متعلق ابن عساکر ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ ان کے پاس حدیث کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا آخر میں بیان کیا ہے کہ

اَنْفَقَ عَلَيْهَا نحواً من ثلثمائۃ الف دراھم	جس پر تقریباً تین لاکھ درم انھوں نے صرف کئے تھے۔

تین لاکھ درم جس نے حدیثوں کی کتابت پر خرچ کر دیا ہو، کیوں تعجب کیجئے اگر ابو عبید کی کتاب الاموال کو وہی آب زر سے، جیسا کہ ارادہ کیا تھا لکھوا دیتے مسلمانوں کے مذاق کا اس باب میں کون اندازہ کر سکتا ہے حکومتیں اور سلطنتیں جو کچھ کر سکتی ہیں ان کو تو جانے دیجئے، تیسری صدی کے محدث حافظ یعقوب بن شیبہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں اپنی مسند وہ تیار کر رہے تھے۔

کان عند منزل یعقوب اربعون	یعقوب کے گھر میں چالیس لحاف رکھے رہتے
لحافا اعدھا لمن یبیت عندہ	تھے تاکہ حدیثوں کے نقل کرنے کے لیے ان
من الوراقین الذین یبیضون	کے ہاں رات کو کاتبوں کی جو جماعت سوتی
المسند ص۱۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۲	تھی اس کے اوڑھنے میں کام آتیں۔

میں تو حیران ہوں کہ پڑھنے والے عام متداول کتابوں میں اس قسم کے واقعات بھی پڑھتے ہیں، مثلاً قرأت اور عربیت کے امام ابو عمرو بن العلاء جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچاس اور پچپن سال یا چند سال اسی کے آگے پیچھے مکہ میں پیدا ہوئے، آخر میں بصرے کو اپنا وطن بنا لیا تھا، بعض صحابہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی استفادہ کا موقعہ ان کو ملا تھا بہرحال کہنا یہ

ہے کہ ان ہی کے حالات میں ابن خلکان الیافعی وغیرہ سبھوں نے لکھا ہے کہ

كانت كتبه التي كتب عن العرب الفصحاء قد ملأت بيتاً له الى السقف ص ۳۲۵ ج ۱ الیافعی	ابو عمرو بن العلاء نے فصحاء عرب کی جن چیزوں کو لکھ کر جمع کیا تھا، ان کی کتابوں سے چھت تک کمرہ بھرا ہوا تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ ابو عمرو مانا کہ کوئی بڑے رئیس آدمی نہ تھے تاہم بعض علوم خصوصاً قرآن کے پڑھانے میں اور ادب عرب کے امام مانے جاتے تھے، عربی ادب میں ان کی واقفیت کا کیا حال تھا، اسی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اصمعی ان کے شاگرد رشید کی اس ذاتی شہادت سے ثابت ہے، یعنی اصمعی کا بیان ہے کہ

"میں دس سال تک ابو عمرو بن العلاء کے حلقہ میں بیٹھا ہوں، لیکن کسی لغوی مسئلہ میں شعر کے پیش کرنے کی جب ضرورت ہوئی تو اس شخص نے کبھی اسلامی شاعر (یعنی عہد اسلام) کے کلام کو پیش نہیں کیا"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قبل اسلام کے جاہلی شعراء کا کلام ہی ابو عمرو کو اتنا محفوظ تھا کہ اسلامی شعراء کے کلام میں اس مسئلہ کے متعلق شہادت ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ کچھ بھی ہو یہ ماننا پڑے گا کہ ابو عمرو کا مکان کوئی معمولی غریبوں کا جھونپڑا نہ ہوگا، بصرہ اور کوفہ میں مسلمانوں کی تعمیری ترقیوں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس حیثیت کے آدمی ابو عمرو[1] تھے ان کے کتب خانہ کا یہ کمرہ کافی طول و عرض

---

[1] ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ابو عمرو کو پھولوں کا خاص شوق تھا، روزانہ گھڑا خریدا جاتا تھا، دوباسی پھولوں کو خشک کر کے منہ دھونے کی چیزوں میں کوٹ کر ملا دیا جاتا تھا گویا خوشبودار صابن بنا لیا جاتا تھا ۱۲

بھی رکھنا ہوگا، اور بلندی بھی اس کی اسی نسبت سے ہوگی یہ کمرہ نیچے سے اوپر چھت تک کتابوں سے پٹا ہوا تھا، خیال کرنا چاہئے کہ ان کتابوں کی اور جتنے اوراق پر وہ مشتمل ہوں گی ان کی تعداد کیا ہوگی اندازہ میں انتہائی سامحت سے کیوں کام نہ لیا جائے، پھر بھی وہ دس بیس کتابیں اور سو دو سو ورق تو کبھی نہیں ہو سکتے، بہرحال اتنا تو یقینی ہے کہ جتنے صفحات میں پچیس تیس ہزار حدیثوں کے متون سند کے ایک دو راوی کے ناموں کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں، ان سے تو ان کی مقدار یقیناً زیادہ ہی ہوگی۔

میں پوچھتا ہوں کہ پہلی صدی ہجری میں بصرے کا ایک خوش باش شہری تو مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ مہیا کر سکتا ہو، لیکن جس حکومت کا وہ ادنیٰ رعیت ہو، اس کو اتنا مجبور و معذور، بے دست و پا فرض کر لینا کس حد تک درست ہو سکتا ہے کہ جاہلی شعرا کے اشعار نہیں بلکہ جس پیغمبرؐ کے صدقہ میں یہ حکومت قائم ہوئی تھی، اس کے ملفوظات گفتار و رفتار سیرت و کردار کے متعلق معلومات کے قلمبند کرنے کا سامان نہیں کر سکتی تھی،

اب میں کیا عرض کروں ابو عمرو بن العلاء کی چھت سے لگی ہوئی ان کتابوں کی صحیح مقدار پر کرے کی صحیح مقدار کے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہنے والے جو کچھ کہہ بھی سکتے ہیں، لیکن اسلام کی ان ہی ابتدائی صدیوں میں اسی حکومت کے ایک عام باشندے ابن عقدہ کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ

تحول من دار کانت کتبه ست مائة جمل الیافعی ص۳۱۱ ج ۲	جہاں پہلے رہتے تھے وہاں سے جب ایک دفعہ منتقل ہوئے تو چھ سو اونٹوں پر ان کی کتابیں لدی ہوئی تھیں۔

تیسری صدی کے ایک محدث ابن عقدہ جن کی وفات چوتھی صدی میں ہوئی ہے ان کے کتابی سرمایہ کا حال بیان کیا گیا ہے کہتے ہیں کہ ہر اونٹ نو من بوجھ لاد لیتا ہے حساب کر لیجئے کہ ابن عقدہ کی ان کتابوں کا مجموعی وزن کتنا ہوا، گو مورخین نے تصریح تو نہیں کی ہے لیکن غالب قرینہ یہ ہے کہ اس کتابی سرمایہ میں زیادہ تر وہی چیزیں تھیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان، آپ کے اصحاب سے تعلق تھا کیوں کہ ابن عقدہ ان ہی چیزوں کے اپنے وقت میں بے نظیر عالم اور حافظ سمجھے جاتے تھے اور اس کو بھی جانے دیجئے زمانہ چونکہ آگے بڑھ گیا ہے اس لئے گفتگو کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ابو قلابہ کا نام حدیثوں کی سند میں آپ کی نظر سے گذرا ہوگا ان کی وفات ہی ہوئی ہے ۱۰۴ھ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ پہلی صدی ہجری کے علماء میں ہیں، سنئے ان کی کتابوں کی مقدار میں الذہبی نے نقل کیا۔

مات ابو قلابہ بالشام فاوصی بکتبہ لایوب السختیانی فجیئ فی عدل راحلۃ تذکرہ ج ۱	ابو قلابہ کا جب انتقال ہوا تو وفات سے پہلے اپنی کتابوں کے متعلق انھوں نے وصیت کی تھی کہ ایوب سختیانی (ان کے شاگرد تھے) ان ہی کے سپرد کر دی جائے کتابیں جب ایوب کے پاس آئیں تو ایک اونٹ کا نصف بار تھیں۔

ساڑھے چار من تو ان کتابوں کا وزن ہونا چاہئے آئندہ بھی کسی موقعہ پر ابوقلابہ کی کتابوں کا ذکر آئے گا، جہاں بتایا جائے گا کہ زیادہ تر ان کی یہ کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر مشتمل تھیں۔

اور قصہ کچھ اسی پر کیا ختم ہو جاتا ہے؟ ابو قلابہ تو بہر حال تابعی ہیں، لیکن ابن عباس تو تابعی نہیں ہیں ان کے مشہور مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کریب بن ابی مسلم کا بیان طبقات ابن سعد میں پڑھیے، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں۔

وضع عندنا کریب بن ابی مسلم	ہمارے پاس عبداللہ بن عباس کے مولیٰ
مولی عبداللہ بن عباس حمل	کریب نے ابن عباس کی کتابیں رکھوائی تھیں
بعیر من کتب ابن عباس	جو ایک بار شتر تھیں۔

ج ۵ ص ۲۱۶ ابن سعد

ابن عباس کی ان کتابوں کا انشاء اللہ آگے بھی ذکر آئے گا، اس وقت تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس حکومت کی رعایا کے افراد ایک ایک بار شتر کتابیں لکھوا سکتے تھے خود اس حکومت کے امکانات کا اس باب میں لوگوں کو اندازہ کرنا چاہیے عہد نبوت اور عہد صحابہؓ کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ عہد جاہلیت سے چونکہ یہ زمانہ بہت قریب تھا اس لئے نوشت وخواند کے ساز و سامان کا اس وقت بسہولت میسر آنا آسان نہ تھا ہم اس کے متعلق پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت کے لفظ کا عوام جو یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ نوشت وخواند سے عرب کے باشندے اسلام سے پہلے قطعاً ناآشنا تھے یہ صحیح نہیں ہے جاہلیت قرآن کی ایک اصطلاح ہے، ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس اصطلاح خاص کا تذکرہ کیا ہے قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے خیالات وعقائد، عادات واطوار کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے ورنہ جہاں تک عرب جاہلیت کے حالات سے پتہ چلتا ہے نوشت وخواند میں اس ملک کے باشندوں کی اسلام سے پہلے

اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب وہی حالت معلوم ہوتی ہے جو اس زمانہ کے عام متمدن ممالک (ایران روم مصر وغیرہ) کی تھی[1] بعضوں میں غلط فہمیاں تدوین قرآن کی ان روایتوں

---

[1] یعنی لازمی تعلیم اس زمانہ میں جہاں تک تاریخی روایات کا اقتضاء ہے کہیں نہیں تھی البتہ چین شاید اس حکم سے مستثنیٰ ہو، دوسری تیسری صدی ہجری کے ان سیاحوں نے جو چین پہنچے ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے لازمی تعلیم کا انتظام اس ملک میں اس وقت جاری تھا بہرحال چین کے سوا ملک میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص طبقہ پایا جاتا تھا اکثریت اس ہنر سے بیگانہ تھی۔ اور یہی حال عرب کا بھی تھا کہ اکثریت یقیناً نوشت وخواند سے ناواقف تھی لیکن ہر شہر میں کچھ لوگ پائے جاتے تھے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے صرف قرآنی وحی کی کتابت کے لیے صحابیوں میں (۴۲) بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے ان کے سوا تلاش اور تتبع سے اس وقت بھی سیکڑوں آدمی کا نام بتایا جا سکتا ہے، ان امور کی تفصیل آپ کو میری کتاب " تدوین قرآن" میں ملے گی جس میں دکھایا گیا ہے کہ عرب ایام جاہلیت میں کتابوں سے بالکلیہ منقطع نہ تھا، یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں میں کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق پائے جاتے تھے عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ان میں پتہ چلتا ہے کہ (۲)، کتابیں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، یہی حال عرب کے یہودیوں کا بھی تھا مدینہ منورہ، خیبر وغیرہ جہاں کہیں وہ تھے یہودی مذہب کی کتابوں کا ذخیرہ بھی وہاں پایا جاتا تھا جن کا ذکر بہ کثرت کتابوں میں کیا گیا ہے۔ عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا عام جاہلی خاندانوں میں "مجلہ" لقمان نامی کتاب کا پتہ چلتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کتاب پیش بھی ہوئی تھی، ایرانیوں کے شاہ نامہ کا عربی ترجمہ کہتے ہیں مکہ لایا گیا تھا ملکہ نضر بن الحارث جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایرانی شاہنامہ کو لکھ کر حیرہ سے لایا تھا اسی کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام سے بھی اسی قسم کا تاریخی لٹریچر وہ مکہ لایا کرتا تھا، ممکن ہے کہ رومیوں کی تاریخ کا کچھ حصہ ہو، ان روایات پر اگر بھروسہ کیا جائے جو درمنثور وغیرہ میں سیوطی نے نقل کی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے قرآن میں بھی اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کا عربی میں ترجمہ کر کرکے عربوں میں اس کی اشاعت کرتے تھے اور یہ تو بخاری میں بھی ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ میں توراۃ وانجیل کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے خلاصہ یہ ہے کہ جاہلیت کا جو ماحول جاہلیت کے لفظ سے سمجھ لیا جاتا ہے یہ درست نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی قسم کا ماحولِ علمی عرب بھی رکھتا تھا، ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حارث بن کلدہ باشندہ طائف نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ جندیسابور میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں ایک طبی کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ خود عربوں کے قصائد بھی مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے ۱۲

سے پیدا ہوتیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ شروع میں قرآن اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کے عسیب یا لخاف (پتھر) یا ادم (چمڑے) وغیرہ پر لکھا جاتا تھا، سمجھ لیا گیا کہ نوشت و خواند کے ساز و سامان کی کمی کا یہ نتیجہ تھا، حالانکہ پہلے ان الفاظ ہی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان سے واقعی مقصد کیا تھا؟ لوگوں نے دماغ پر اتنا زور دینا بھی گوارا نہ کیا کہ بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنے کی شکل ہی کیا ہو سکتی ہے، یا کھجور کی شاخ اور اس درخت کے پتوں میں اتنی وسعت کب ہوتی ہے کہ اس پر کچھ لکھا جا سکے، بس کہہ دیا گیا، اور لوگوں نے مان لیا، آگے بڑھ گئے، حالاں کہ لغت کی کتابوں کا مطالعہ ذرا توجہ سے اگر کیا جاتا تو معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ سارے الفاظ اصطلاحی ہیں ان چیزوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے جو خاص کر کے لکھنے ہی کے لئے مصنوعی تدبیروں سے اس زمانہ میں بنائی جاتی تھیں، آپ ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ اسکولوں میں لوگ پتھر پر لکھتے ہیں، اس بیان میں اور اس میں کہ سلیٹ پر لکھتے ہیں کیا کوئی معمولی فرق ہے، لکڑی پر لکھنا اور تختی پر لکھنا، کیا دونوں ایک ہی بات ہے، درحقیقت ہڈیاں ہوں یا لخاف (پتھر)، یا کھجور کی شاخ عسیب، عربی زبان کے جو الفاظ اس موقعہ پر استعمال کئے گئے ہیں، ان سے یہ قطعاً عام چیزیں مقصود نہیں ہیں، بلکہ سلیٹ کے لفظ سے جیسے لکھنے کی چیز سمجھی جاتی ہے اگرچہ وہ پتھر ہی سے تیار ہوتی ہے، اسی طرح ان الفاظ سے خاص چیزیں مقصود تھیں سنیر دو دو تین تین آیتیں جو نازل ہوتی رہتی تھیں جن کا تعلق مختلف سورتوں سے ہوتا تھا ان آیتوں کو ابتدائی یادداشت کے طور ایسی چیزوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے جو نسبتاً کتابت کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے زیادہ پائدار تھیں، خلاصہ یہ ہے کہ سامان کتابت کی کمی اور قلت

کی وجہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اور مجھے اپنے اس خیال پر اصرار ہے کہ ان چیزوں کا انتخاب قرآن کی تھما تھما نازل ہونے والی آیتوں کو قلم بند کر لینے کے لئے اختیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ واقعہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے گویا یہ خیال کرنا چاہئے کہ شعراء کا جیسے یہ عام قاعدہ ہے کہ مصرعے اور اشعار جیسے جیسے تیار ہوتے جاتے ہیں انکو چھوٹے چھوٹے پرزوں پر پہلے لکھ لیتے ہیں اور بعد کو پوری غزل کے تیار ہو جانے کے بعد کسی بڑے کاغذ پر سب کو ایک جگہ جمع کر کے نقل کرتے ہیں، کچھ یہی صورت ان قرآنی آیتوں کی کتابت کی تھی جو تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہوتی رہتی تھیں، فرق صرف یہ تھا کہ شاعر اپنی ابتدائی یادداشت کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاغذ ہی کے استعمال کرتا ہے اور قرآنی آیات کی اہمیت کی وجہ سے بجائے کمزور چیزوں کے پرزوں کے ایسی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال کئے گئے تھے جو نسبتاً زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار تھیں، مثلاً پتھر، ہڈی، کھجور کی شاخ سے لکھنے ہی کے لئے یہ ٹکڑے یا رقعے بنائے جاتے تھے، اسی لئے چوبیس پچیس سال بعد عہد صدیقی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لکھوائی ہوئی ساری ابتدائی یادداشتیں محفوظ حالت میں مل گئیں صرف سورۃ برأت یا سورۃ احزاب کی چند آیتوں والا رقعہ نہ مل سکا[1] تقریباً ربع صدی تک ان تمام یادداشتوں کا محفوظ رہ جانا حیرت انگیز بات ہے، ان امور کی پوری تفصیل آپ کو میری کتاب تدوین قرآن میں ملے گی اس وقت تو یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن کی کتابت کی متعلقہ روایتوں کا اثر چونکہ حدیث کی کتابت پر بھی پڑا ہے، سمجھنے والوں نے سمجھ لیا

---

[1] یعنی راوی کو یہ یاد نہیں رہا کہ ایک ٹکڑا ابتدائی یادداشت کے اس مجموعہ میں جو نہ ملا تھا اس میں براۃ کی آخر کی دو تین آیتیں تھیں یا سورۃ احزاب کی ۱۲

ہے اور دوسروں کو بھی وہ یہی سمجھاتے ہیں کہ ابتدا میں حدیثوں کے مکتوب نہ ہونے کی وجہ سامانِ کتابت کی کمی تھی حالانکہ یہ قطعاً غلط خیال ہے، مان لیا جائے کہ عرب میں مصر کا کاغذ یا چین کا کاغذ نہ بھی میسر آتا ہو، پھر بھی اس زمانے میں لکھنے کی جو عام چیز تھی، یعنی رق (یا پارچمینٹ) جو جانوروں کے معدے کے پاس کی باریک جھلیوں سے بنایا جاتا تھا اس کے قحط کی عرب میں کیا وجہ ہوسکتی تھی عرب کی عام خوراک گوشت تھی، گوشت کھانے والے ملک میں جتنی آسانی کے ساتھ یہ جھلیاں فراہم ہوسکتی ہیں کیا اس پر تقریر کرنے کی ضرورت ہے یا رق شتر مرغ، یا خرگوش وغیرہ کی باریک کھالوں سے تیار کرتے تھے سو ظاہر ہے کہ عرب میں ان چیزوں کی قلت کے بھی کوئی معنی نہیں ہوسکتے اور میں تو جو کچھ کہہ رہا ہوں اس حکومت کے امکانات کے متعلق کہہ رہا ہوں، جو دینِ اسلامی کی پشت پناہی کے لئے ٹھیک اس دین کی ابتداءِ ظہور ہی کے دنوں میں قائم ہوچکی تھی کیا ایسی حکومت جس کا اقتدار سارے عرب پر قائم تھا، اگر چاہتی تو تیس چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعے کے لکھوانے کا بھی بندوبست نہیں کرسکتی تھی، اس حکومت کے زیرِ اقتدار سارا عرب عہدِ نبوت ہی میں آگیا تھا، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اتنا بھی نہیں کرسکتے تھے حقیقت تو یہ ہے کہ جانبازوں کا جو گروہ صحابہ کرام کی شکل میں آپ کے اردگرد جمع ہوگیا تھا، جان مال اور ہر وہ چیز جو ان کے امکان میں تھی سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں پر جب وہ نثار کر رہا تھا تو سوچنا چاہیے کہ ان سرفروشوں کے لئے بھلا یہ بھی کوئی بڑی بات تھی؟ منشاءِ مبارک کا ہلکا سا احساس بھی یقین مانئے کہ ایک مجموعہ کیا ایسے سینکڑوں مجموعے کے لکھوانے کے لئے کافی ہوسکتا تھا، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھ دس سال کے بعد ہی کیا مصر اسلامی محروسہ میں شریک نہیں ہوچکا تھا مصر اور مصر کے مشہور کاغذ بردی یا پیپرس

کے تاریخی تعلقات سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ حدیثوں کے لکھوانے کے لئے اس کاغذ کی جتنی بڑی مقدار حکومت چاہتی مصر سے فراہم کر سکتی تھی[1]۔

بہرحال بات ذرا طویل ہو گئی لیکن کیا کیا جائے غلط فہمیوں کی گتھیاں بھی تو کافی دراز اور لمبی ہیں گرہوں پر گرہیں پڑتی چلی گئی ہیں جب تک ساری گرہوں کو صبر سے کام لیتے ہوئے کھول نہ لیا جائے۔ جس واقعہ کو پیش کرنا ہے شاید آسانی سے لوگوں کے دماغ میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ دین اسلامی کے لحاظ سے جن امور کی حیثیت البینات کی نظر آتی ہے، ان کی حفاظت واشاعت، تبلیغ ونگرانی میں غیر معمولی اہتمام شروع ہی سے جو کیا گیا، اور یہ کیفیت اس غیر بیناتی حصہ میں جو نظر نہیں آتی ہے جس کا عام حدیثوں (یعنی خبر احاد) سے تعلق ہے تو یہ نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے اور نہ قرن اول کی

---

[1] اس مصری کاغذ کی تاریخی تفصیل پر مستقل مضمون ہمارے مرحوم رفیق مولوی جمیل الرحمٰن عفر اللہ لہٗ نے ایک مقالہ کی شکل میں جامعہ عثمانیہ کے تحقیقاتی مجلہ میں شائع کرایا تھا، جو پُرمغز معلومات سے معمور ہے یہ کاغذ مصر میں کب سے بن رہا تھا، کیسے بنتا تھا، اس کی خصوصیت کیا ہوتی تھی، مصر کے سوا اور دوسرے ممالک میں بھی یہ صنعت پائی جاتی تھی یہ سارے مباحث آپ کو اس مقالے میں ملیں گے مسلمانوں نے مختلف مقامات میں مختلف ملکوں سے اس صنعت کو حاصل کیا۔ لکھا ہے کہ ۸۸ھ ہجری میں قطن (روئی) سے کاغذ بنانے کا کارخانہ یوسف بن عمرو نے مکہ میں جاری کیا اسی طرح موسیٰ بن نصیر نے مغرب کے علاقہ میں کتان وغیرہ سے کاغذ بنانے کا طریقہ مروج کیا۔ ریشم سے بھی کاغذ بنایا جاتا تھا۔ ان ہی دنوں میں ایسے چکنے کاغذ تیار ہونے لگے تھے جس میں لکھا ہے کہ آدمی کو اپنا چہرہ تک نظر آ سکتا تھا، دیکھو وفیات الاسلاف للشہاب المرجانی ص ۳۴۲ مسلمانوں نے کاغذ کی طرف اتنی توجہ کی کہ ملک بہت جلد کاغذ سے بھر گیا سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ تک کاغذ کی اتنی کثرت ہو چکی تھی کہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لئے الگ الگ مراسلہ دفاتر سے جاری کیا جاتا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسراف قرار دیا۔ اور حکم دیا کہ ہر چیز کے لئے الگ الگ مراسلے کی ضرورت نہیں بلکہ چند ضرورتوں کا ذکر ایک ہی مراسلہ میں ممکن ہو تو خواہ مخواہ کاغذ ضائع نہ کیا جائے۔ نیز آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ خوش خطی کے لئے موٹے موٹے حروف کا لکھنا غیر ضروری ہے، باریک حروف سے کام نکل سکتا ہے تو اسی سے کام لیا جائے ۱۲

مسلمانوں کی بے اعتنائی اور بے توجہی کا نعیاذ باللہ اسے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسباب حفاظت مثلاً کتابت و اشاعت وغیرہ کے ساز و سامان کی ابتداء اسلام میں کمی تھی، بلکہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے میرا دعویٰ ہے کہ ہوا نہیں بلکہ کیا گیا ہے قصداً و ارادۃً کیا گیا ہے، ایسی صورتیں اور ایسے حالات جان بوجھ کر اختیار کئے گئے جن کا لازمی نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکل آیا، یعنی دین کے "بینات" کی حیثیت تو یہ ہو گئی ہے کہ ان کا انکار خود دین کا انکار رہے گویا کسی کُل کے ان اجزار کا انکار رہے جن کے نکل جانے کے بعد کل کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے، یوں سمجھنا چاہئے کہ جسدِ انسانی کے ساتھ جیسے ان اجزاء کا تعلق ہے جن کو نکال لینے کے بعد آدمی زندہ ہی نہیں رہ سکتا، اور ان ہی کے مقابلہ میں وہ چیزیں جو مذکورۃ بالا حدیثوں سے پیدا ہوتی ہیں گو دینی زندگی کی تعمیر میں ان سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن حیثیت ان کی ایسے اجزاء کی ہے جن کے نکل جانے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا، گویا جو نسبت جسدِ انسانی سے ان اجزاء کی ہے جن کے کٹ جانے اور نکل جانے کے بعد بھی آدمی زندہ رہتا ہے یا رہ سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اپنی تیسری اور سہولت پسندانہ خصوصیتوں پر جو ناز ہے[1]، اور یہ سمجھا جاتا ہے دیکھا جا رہا ہے کہ کسی دین میں وہ سہولتیں نسلِ انسانی کو نہیں عطا کی گئی ہیں،

---

[1] مسند احمد میں اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے جس میں ہے کہ حبشیوں کے حربی رقص کا تماشا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ صدیقہؓ کو دکھار ہے تھے تو اس میں یہ بھی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لتعلم یھود ان فی دیننا فسحۃ (یہود کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے دین میں کتنی وسعت و فراخی ہے) در منثور ص۱۹۳ ج۱

جن آسانیوں سے اس آخری دین میں بنی آدم کو سرفراز کیا گیا ہے، سچ پوچھیے تو ہ[ما]رے ان ہی ابواب میں ایک بہت بڑا اساسی اور اصولی باب وہ امتیاز بھی ہے جو دین اسلامی کے بیناتی اور غیر بیناتی حصہ میں قصداً وارادۃً پیدا کیا گیا ہے ابتدا[ء] سے ایک ایسا محتاط حکیمانہ طرز عمل دین کے ان دونوں شعبوں کے متعلق اختیار گیا کہ علاوہ بیناتی حصہ کے جو چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹوں کو نمونہ[ٔ] کبری کے ان مقدس نمونوں سے معمور رکھیں جنہیں محبوبیتِ حق کی آسمانی سند حا[صل] ہے، تو ان کے لئے بھی انتہائی سیر چشمی کے ساتھ راہیں بالکل کھلی رکھی گئی ہیں یہ مم[کن] نہیں واقعہ ہے کہ صرف دینی مشاغل اور مذہبی کاروبار کی حد تک نہیں بلکہ سو[تے] جاگتے میں، اٹھنے میں بیٹھنے میں کھانے میں پینے میں، الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں ا[ن] ہی نمونوں کے مطابق جینے والے چاہیں تو جی سکتے ہیں، اور مرنے والے چاہیں [تو] مر سکتے ہیں، جن سے بہتر نمونے ارتقاء وعروج کے لئے انسانیت کے آگے نہ ان سے پہلے رکھے گئے اور نہ ان کے بعد پیش ہوئے یا ہو سکتے ہیں۔

اور جہاں ایجابی وسعت دامانیوں کا یہ حال ہے، وہیں ان بیچاروں کے جو ان نمونوں کی پیروی سے محروم رہ جانے والے تھے، ان کے لئے یہ کتنی عظیم ا[ور] وسیع سلبی سہولت ہے کہ نہ دینی زندگی ہی کے ان نتائج سے ان کو محروم ٹھیرایا گیا جن کا استحقاق مذہب کے بیناتی حصہ کی تعمیل سے ہر تعمیل کرنے والے کو حاصل ہو[تا] ہے اور نہ ان لوگوں کو بغاوت کے جرم کے مجرم ہونے کا موقع دیا گیا ہے جو بدبخت[ی سے] ان معلومات ہی کے انکار پر آمادہ ہو جائیں، جن سے قدرت کے ان محبوب نمونوں کا علم حاصل ہوتا ہے اف اگر معلومات کے اس حصہ کو بھی "بیّنات" ہی کی شکل عطا

کردی جاتی، اور چاہا جاتا تو عرض کر چکا ہوں کہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، "بینات" کو بینات بنانے میں جس قوت سے کام لیا گیا تھا کونسی چیز مانع ہوتی اگر اسی قوت سے کام لے کر ان معلومات کو بھی "بینات" کے قالب میں ڈھال دیا جاتا، لیکن سوچئے تو سہی کہ ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانے والوں کا انجام اس کے بعد کیا ہوتا۔ خود ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانا ہی محرومی کیا کم ہے اور جبکہ ایسی صورت میں دین کے "بینات" سے کترانے اور ہٹنے کے بھی یہ محروم بن جاتے تو ان خمیازوں سے ان کو کون بچا سکتا تھا جو اس جرم کے لازمی نتائج ہیں، لیکن آپ سن چکے ہیں کہ ان معلومات کی جو موجودہ کیفیت ہے یعنی خبر آحاد کی شکل میں ان کا ہونا محض اسی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا تارک ہی نہیں بلکہ سرے سے ان معلومات کے انکار کرنے والوں کو بھی دین کے دائرہ سے باہر کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ دینی زندگی کے ان ثمرات ونتائج سے بھی ان کو محروم نہیں ٹھیرایا گیا ہے جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے آنے والی زندگی میں رکھتا ہے، علماء نے تصریح کی ہے کہ

وافعاله خارج الصلوٰة من المشي واللبس والاكل فان العبد لا يطالب باقامتها ولا يأثم بتركها ولا يصير مسيئا	نماز سے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے افعال مثلاً آپ کی رفتار آپ کے لباس آپ کے کھانے کے طریقے، تو بندوں سے نہ ان امور کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نہ ان امور کے چھوڑنے والے گنہ گار ٹھیرائے جائیں گے نہ ان کو برائی کا مرتکب
کشف بزدوی ج ۲ ص ۲۱۲	

قرار دیا جائے گا۔

اور اسی قسم کی چیزیں نہیں بلکہ اسی کتاب میں ہے کہ یہی حکم ان چیزوں کا بھی ہے جن کا نماز ہی سے تعلق کیوں نہ ہو مثلاً

تطویل الصلوٰۃ فی حالۃ القیام والرکوع والسجود	نماز کے قیام ورکوع وسجود میں دیر تک مشغولیت کا یہی حال ہے)

حتیٰ کہ جن سنتوں کا نام سنن الہدیٰ رکھا گیا ہے مشہور اصولی امام ابو الیسر بزدوی کے حوالہ سے صاحب کشف نے ان کا فتویٰ نقل کیا ہے یعنی یہ فرمانے کے بعد کہ

کل نفل واظب علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل التشہد فی الصلوٰۃ والسنن الرواتب فحکمھا انہ یندب الی تحصیلھا ویلام علی ترکھا مع لحوق اثم یسیر	ہر ایسی نفلی عبادت جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالالتزام پابندی فرماتے تھے مثلاً نماز میں تشہد (یعنی التحیات)، اور فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں پڑھی جاتی ہیں جنھیں سنن رواتب کہتے ہیں تو ان چیزوں کا بھی حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی تعمیل پر آمادہ تو کرنا چاہیئے اور چھوڑنے والوں پر ملامت ونفرت بھی کی جائے گی تھوڑا سا گناہ کا پہلو بھی اس میں پیدا ہوتا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دنیا میں اسلامی حکومت الیسوں پر تعزیری کارروائی نہیں کر سکتی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی پر ملامت

کی جاتے اور اس کے طرزِ عمل کو موجب نفریں ٹھیرایا جائے، رہا آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، صدر الاسلام ابو الیسر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا بہت گناہ اس کو ہوگا، لیکن خود یہ گناہ کس نتیجہ کو پیدا کرے گا، گو انھوں نے اس کی تعیین نہیں کی ہے، لیکن بعض روایتوں کی بنیاد پر فقہاء کا خیال ہے کہ

حرمان الشفاعة فی العقبیٰ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے آخرت میں محرومی۔
ص۳۰ ج ۲ کشف	

کے انجام کو اس کا یہ گناہ اس کے سامنے لائے گا لیکن یہ تو "سنن الہدیٰ" کے ترک کا نتیجہ ہو سکتا ہے، باقی

کل نفل لم یواظب علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بل ترکہ فی حالة کالطہارة لکل صلوٰة وتکرار الغسل فی اعضاء الوضوء والترتیب فی الوضوء فانہ مندوب الی تحصیلہ ولکن لا یلام علی ترکہ ولا یلحق بترکہ وزر	ہر ایسا نفلی فعل جس کی باضابطہ پابندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی بلکہ کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیتے تھے، مثلاً ہر نماز کے لئے تازہ وضوء یا وضوء میں ہر ہر عضو کو بار بار دھونا (یعنی بجائے تین دفعہ کے ایک ہی دفعہ دھو لیا جائے) اور وضوء کرنے میں اعضاء کی ترتیب (یعنی پہلے منہ پھر کہنی تک ہاتھ پھر مسح پھر پاؤں دھونا) تو اس قسم کے امور کی تعمیل چاہتے تو یہی کہ لوگ کریں، لیکن ان کے چھوڑنے پر نہ وہ ملامت اور نفرت ہی کے مستحق ہیں اور نہ اس کی بازپرس کا بار ان پر عائد ہوگا
ص۳۱ ج ۲	

بہر حال ان حدیثوں سے جو عام احکام و نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا یہی حال ہے۔ البتہ بعض ایسی چیزیں جن میں اپنے خصوصی حالات کی وجہ سے خاص قوت پیدا ہو گئی ہے اگرچہ تواتر کے درجہ تک پہنچ کر "بینات" کا رنگ ان میں نہ پیدا ہوا ہو، مثلاً صاحب کشف نے امام محمدؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ماکان من اعلام الدین فالاصرار علی ترکہ استخفاف بالدین فیقاتل	ایسے امور جن کا شمار دین اسلامی کی نشانیوں میں کیا جاتا ہے، تو ان کے چھوڑنے پر اصرار درحقیقت دین کے وزن کو سبک کرنا اور اس کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔

مثال میں لوگ اذان یا اقامت یا عیدین کی نماز کو پیش کرتے ہیں کہ گو ان کا شمار فرائض و واجبات میں نہیں ہے اور سنن ہی میں ان کو داخل سمجھا جاتا ہے مگر پھر بھی فتوٰی یہی دیا گیا ہے امام محمد ہی سے منقول ہے کہ۔

اذا اصر اھل مصر علی ترک الاذان والاقامۃ امروا بھا فان ابوا قوتلوا علی ذلک	اگر کسی شہر کے باشندے اذان یا اقامت کے چھوڑنے پر اصرار کرنے لگیں تو ان کو ان اعمال کی بجاآوری کا حکم دیا جائے گا۔ اگر اس حکم کی تعمیل سے وہ انکار کریں تو پھر ان سے لڑائی کی جائے۔

مگر ذرا ان دقیقہ سنجیوں کا اندازہ کیجئے کہ گو ان افعال کے صرف ترک پر نہیں بلکہ ترک پر اصرار، اور حکم دینے کے بعد اس حکم کے ماننے سے انکار پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے، یعنی فوجی طاقت حکومت ان کے تعمیل کرانے پر استعمال

کرے لیکن فوج کس قسم کے آلات استعمال کرے لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف کا فتویٰ تھا کہ ہتھیار سے فوج ان پر حملہ نہ کرے، بلکہ عام تادیبی کارروائیاں کی جائیں، البتہ امام محمدؒ کہتے تھے کہ ہتھیار کی قوت ایسے موقعہ پر استعمال کرنی چاہیے قاضی ابو یوسف اس کے جواب میں کہتے تھے کہ

المقاتلة بالسلاح عند ترك الفرائض والواجبات واما السنن فانما يؤدبون على تركها لا يقاتلون على ذلك ليظهر الفرق بين الواجب وغيره ص۳۱	ہتھیار سے فوجی کارروائی فرائض اور واجبات کے ترک پر کی جائے گی، باقی جو باتیں سنت سمجھی جاتی ہیں تو ان کے چھوڑنے والوں کے خلاف صرف تادیبی کارروائی کی جائے گی سنت کے ترک پر فوجی کارروائی نہ کی جائے گی تاکہ واجب و فرض اور جو چیزیں واجب و فرض نہیں ہیں دونوں میں فرق واضح ہو

خلاصہ یہ ہے کہ بعض چیزیں گو ثابت ہیں وہ حدیثوں ہی سے اور گو تواتر کے درجہ تک وہ نہ پہنچی ہوں لیکن دوسرے حالات نے ان میں کافی قوت پیدا کر دی ہو، جیسے زانی کی سزا رجم، یا موزوں پر مسح اگرچہ ان کے منکر کو بھی کافر نہیں قرار دیا جا سکتا

ولكن يخشى عليه الاثم	مگر گناہ کا اندیشہ اسکے متعلق ضرور کیا جائیگا

مگر ایسی چیزیں بہت تھوڑی ہیں باقی ان کے سوا حدیثوں کا جو عام ذخیرہ ہے، شمس الائمہ سرخسی نے مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

مثل الاخبار التي اختلف فيها الفقهاء في باب الاحكام	مثلاً وہ ساری حدیثیں جن کا احکام سے تعلق ہے اور فقہاء کا جن کے متعلق اختلاف ہے

مثلاً آمین، رفع یدین، اور اسی قسم کے مباحث کی متعلقہ حدیثیں سو ترک تو ترک شمس الائمہ نے فتویٰ نقل کیا ہے۔

لا یخشی علی جاحدہ المائم ان حدیثوں کے انکار کرنے والوں کو بھی گنا ہگار ہونے کا ڈر نہیں ہے۔

شمس الائمہ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک فریق دوسرے فریق کی تائیدی حدیثوں کو جو مسترد کردیتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ الزام قائم کرکے کہ وہ پیغمبرؐ کی حدیثوں کا انکار کر رہا ہے اس کو گنہ گار ٹھہرانا قطعاً بے معنی ہے، بلکہ ان ہی اختلافی مسائل کی طرف اشارہ کرکے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تو یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ

ان اکثر صور الخلاف بین الفقہاء لا سیما فی المسائل التی ظہر فیہا اقوال الصحابۃ فی الجانبین کتکبیرات العیدین وتکبیرات التشریق ونکاح المحرم وتشہد ابن عباس وابن مسعود والاخفاء والجہر بالبسملۃ وبآمین والاشفاع والایتار فی الاقامۃ ونحو ذلک انما ھو ترجیح احد القولین وکان السلف لا یختلفون فی اصل المشروعیۃ وانما کان خلافھم فی اولی الامرین ونظیرہ اختلاف القراء فی وجوہ القرأت ص انصاف

ترجمہ:- فقہاء اسلام کا جن مسائل میں نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کی اکثر صورتیں خصوصاً جن مسائل میں صحابہ کے اقوال ہر فریق کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین کی زائد تکبیروں کی تعداد کا اختلاف، یا تشریق کی تکبیریں یا محرم (یعنی حج کا احرام باندھے ہوتے جو ہو) اس کے نکاح کے جواز و عدم جواز میں جو اختلاف ہے۔ اسی طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستہ (نمازوں میں) پڑھا جائے یا زور سے یا آمین کے آہستہ کہنے یا زور سے کہنے میں یا اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہے جائیں یا ایک ایک دفعہ، الغرض یہ یا اسی قسم کے دوسرے اختلافات اسی نوعیت کے ہیں تو ان میں اختلاف کا مطلب صرف یہ ہے کہ، ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر صرف ترجیح دی جاتی ہے (یعنی سمجھا جاتا ہے کہ بہتر اس میں فلاں پہلو ہے) ورنہ سلف کا اس میں اختلاف نہ تھا کہ ان اختلافی پہلوؤں میں سے کوئی پہلو شریعت کے دائرے سے قطعاً خارج ہے، بلکہ مشروعیت (یعنی شرعاً دونوں پہلو جائز ہیں اس پر سب کا اتفاق تھا) ان اختلافات کی نوعیت وہی ہے جو قرآنی آیات کی قرأت میں قراء کے اختلافات کا تھا

(باقی آئندہ)

خلیفۃ الاعظم

امیر المومنین عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ

از جناب سید انوار الحق صاحب حقی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی لکچرر
(تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(۲)

کیونکہ ملکی آزادی اور قومی حکومت جس تحریک کے شعاری الفاظ تھے اس نے اب مذہبی جوش و جنون اور صلیبی رنگ اختیار کر لیا تھا ابن حفصون کے غیر سیاسی ارتداد نے تحریکِ بغاوت کی کمر توڑ دی۔ عام اسپینی باشندے اور خاص کر سرفوں کی اولاد مسیحیت کے عروج اور پادریوں کے اقتدار سے خائف و لرزاں تھی۔ انھیں فکر و اندیشہ تھا کہ دوبارہ عیسائی حکومت قائم ہوتے ہی وہ تمام حقوق و املاک جو مسلمانوں کے دور حکومت میں حاصل ہوتے تھے ضبط ہو جائیں گے اور ان کی انفرادی آزادی ختم ہو کر انھیں پھر اپنے بزرگوں کی طرح جاگیرداروں کا غلام اور ان کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننا پڑے گا عربوں کی فتوحات اور حکمرانوں کی تبدیلی سے جو معتدبہ فرق اور فائدہ اسپین کے عام باشندوں کو ہوا، اس کے سب مورخ مقر اور مداح ہیں جس نرمی، رواداری اور دانائی سے عرب فاتحوں نے اندلس پر حکومت کی وہ عدیم المثال ہے۔ لین پول کے الفاظ میں جہاں تک مفتوحین کا تعلق تھا عربوں کا اندلس کو فتح کرنا بہ حیثیت مجموعی نفع بخش تھا۔ اس نے بڑے بڑے امراء اور کلیسا والوں کی

حد سے بڑھی ہوئی زمینداریوں کو مٹایا اور ان کی چھوٹی چھوٹی ملکیتیں بنا کر متوسطین کے سروں سے بھاری بوجھ اٹھا دیا اور محصولوں کو محدود کر کے صرف کافروں سے جزیہ اور مسلمانوں اور عیسائیوں سے مساوی طور پر خراج لینے پر اکتفا کیا اور غلاموں کی کثرت سے آزاد کرنے کی ترغیب دلائی اور جو آزاد ہوئے ان کی حالت بہت زیادہ سدھاردی اس لئے کہ یہ لوگ اب اپنے غیر کاشتکار مسلمان آقاؤں کی ملازمت میں بھی خود مختار اجارہ دار کی حیثیت رکھتے تھے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عوام محسوس کرنے لگے تھے کہ حکمرانوں کی تبدیلی سے وہ نفع میں رہے انھیں اجازت ہوگئی کہ خود اپنے قوانین اور احکام باقی رکھیں۔ خود انھی کی قوم کے عامل اضلاع کا انتظام محصولوں کی تحصیل اور ان کے آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ کرتے تھے۔"

خانہ جنگی کی تکلیفوں اور تحریکِ آزادی کی ناکامیابی نے ہمتوں کو پست اور دلوں کو سرد کرنا شروع کر دیا تھا۔ عوام میں جوش وخروش کی کمی اور باغیوں کی خستگی اور پست ہمتی کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ ۹۵۹ء میں ابن حفصون نے عبیداللہ شیعی کی تائید حاصل کرنے کے لئے اس کی امارت و سرپرستی کو قبول کر لیا تھا عام پبلک ان ٹیکسوں سے جو مرہٹوں کی چوتھ کے مترادف تھے اور ابن حفصون کے مطلق العنان ساتھیوں کی چیرہ دستی سے جنھیں مذہب یا قانون کا کوئی لحاظ نہ تھا عاجز اور پریشان تھی جیان اور البیرا کے پہاڑی سرداروں کی عیش پرستی اور قزاقانہ طرز عمل ضرب المثل ہو رہا تھا اپنے مخصوص انداز میں پروفیسر ڈوزی نے ان کی زندگی کا خاکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

پہاڑوں کی ابر آلود اور بلند چوٹیوں کے قلعوں میں اب ان کی حیثیت محض

قزاقوں کی رہ گئی تھی۔ مذہب یا قانون سے اب ان کو کوئی واسطہ نہ تھا قلعوں کی فصیلوں پر مسافروں کی تاک میں بیٹھے رہتے اور جب کوئی قافلہ یا کارواں نظر آتا تو اس پر ایسے گرتے جیسے شکاری پرند شکار پر گرتا ہو۔ پھر دوست دشمن کسی میں فرق نہ کرتے۔ انھیں لوٹنے اور مار ڈالنے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ کوئی گاؤں اور شہر نہ تھا جہاں کے آدمی ان ظالموں کے حق میں دل سے بددعا نہ کرتے ہوں جو شخص ان قزاقوں کے برجوں اور قلعوں کی فصیلوں کو گرا دے وہ مظلوموں کے شکریہ کا مستحق تھا لیکن یہ کام سوائے امیر اندلس کے دوسرے کے بس کا نہ تھا۔"

جب یہ احساس پختہ ہو گیا کہ حکومت کی بنیاد خالص جبر و قوت، عیاری اور ناانصافی پر قایم ہے اور حکمراں بے ایمان اور کمزور ہیں تو وہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور بنوامیہ کو اسپین سے خارج اور برطرف کرنے کی جدوجہد میں تیس برس لگ گئے لیکن نتیجہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ عبدالرحمٰن کی عادلانہ اور مدبرانہ پالیسی کے بعد رعایا کو کوئی قرار واقعی شکایت نہ تھی حکومت و ریاست کی بنیاد حق و انصاف پر تھی۔ اور رعایا کی مرفہ الحالی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ قانون و انصاف کی عملداری کو سارے ملک میں پھیلانے کی جدوجہد ہو رہی تھی ان حالات کے تحت ہر امن پسند اور محب وطن شہری نے اس کو اپنا فرض سمجھا کہ امیر کے دشمنوں کے خلاف اس کی اطاعت و حمایت کرے تاکہ ملک میں امن و انصاف قایم ہو۔

اس ذہنی انقلاب اور باہمی نفاق و شقاق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ امیر کی مساعی جمیلہ بار آور ہوں ۳۱۲ھ میں ارجذونہ، البیرا، جیان، منت لیون اور رفیانہ نے بآسانی امیر کی اطاعت قبول کرلی ۳۱۴ھ میں قرمونہ اور ۳۱۶ھ میں مشرق میں اور تولہ اور مغرب میں لبلہ

فتح کرتے گئے۔

۹۳۰ء میں سب طرف سے مطمئن ہو کر عبدالرحمٰن نے طلیطلہ کی طرف رُخ کیا جہاں کے باشندے سرکشی اور خودسری کے لئے اندلس میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے عرب مورخین کے متفقہ بیان کے مطابق اس وقت کی دنیائے اسلام میں کسی جگہ کی رعایا میں اس قدر جذباتِ بغاوت نہیں ہیں جتنے طلیطلہ کی رعایا میں کہ وہ ہر وقت شمشیر بکف ہی بیٹھے رہتے ہیں۔" جغرافیائی اعتبار سے طلیطلہ بہت مستحکم اور محفوظ تھا۔ چونکہ شہر سنگِ خارا کی ناہموار پہاڑی پر واقع تھا اور تین طرف سے دریائے تاجہ شہر کو گھیرے ہوئے تھا اس لئے وہاں کے باشندے اپنے کو محفوظ اور اپنے قلعے کو ناقابلِ تسخیر تصور کرتے تھے۔ اور طلیطلہ دراصل نسبتاً بہت محفوظ تھا۔ باغیوں نے نہایت بہادری اور بجگری سے مقابلہ کیا۔ لڑائی نے طول پکڑا۔ عبدالرحمٰن بھی مستقل مزاج اور اپنی بات کا دھنی تھا۔ اس نے شہر کے مقابل ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام 'الفتح' رکھا۔ گویہ اس بات کا اعلان اور الٹیمیٹم تھا کہ جب تک محصورین اطاعت نہ قبول کریں گے محاصرہ کی سختی میں کوئی کمی نہ ہوگی بالآخر محاصرہ کی تنگی اور تکالیف سے مجبور ہو کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے اور شاہی فوجوں کے لئے اپنے دروازوں کو کھول دیا۔

خارجی پالیسی خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں کے ساتھ ساتھ نئے امیر کو دو طاقتور اور خطرناک بیرونی دشمنوں سے بھی پالا پڑا۔ شمال میں لیون کی عیسائی حکومت اور جنوب میں بنو فاطمہ کی للچائی ہوئی نظریں زرریز و شاداب اندلس پر پڑ رہی تھیں دوراندیشی اور موقعہ شناسی سے کام لیتے ہوئے عبدالرحمٰن نے فوراً فیصلہ کیا کہ جب تک ملک میں امن وامان قایم نہ ہو جائے اسے مدافعت ہی پر قانع رہنا چاہیئے چونکہ حکومت لیون سے فی الحال فیصلہ

کُن جنگ کرنا ناممکن اور ناموزوں تھا اس لیے اس نے صرف حفاظتی تدابیر کو کافی اور بہتر خیال کیا۔ اور شمالی سرحدوں کی مورچہ بندی کا مناسب انتظام کیا۔ تاکہ دشمنوں کی ناکہ بندی ہو سکے اور ان کے مسلسل اور بے پناہ حملوں سے ممالک محروسہ محفوظ و مامون رہیں، داخلی مشکلات کے علاوہ اس کو اس وقت سب سے زیادہ اور فوری خطرہ جنوب کی جانب سے افریقہ کی اسماعیلی حکومت سے تھا کیونکہ تاریخی روایات انھیں قرطبہ پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے لئے ابھارتی اور اکساتی تھیں۔ فاصکر فقیہ عبد الملک بن حبیب کی پیشینگوئی کی وجہ سے اسپین میں کافی لوگ بنو فاطمہ کے ہوا خواہ اور معتقد ہو گئے تھے یہ پیشینگوئی ۲۵۰ھ میں کی گئی تھی جبکہ بنو فاطمہ کی خلافت وجود میں بھی نہ آئی تھی اور اس لئے اب جبکہ افریقہ میں ان کی حکومت قایم ہو چکی تھی لوگوں کو اس وقت کا انتظار تھا جب ابن حبیب کے قول کے مطابق " حضرت فاطمہ کی اولاد سے ایک شخص اسپین پر حکومت کریگا " اور وہ قسطنطنیہ کو بھی فتح کرے گا۔ یہ بادشاہ قرب وجوار کے ملکوں کے تمام مردوں کو قتل کرے گا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو بیچ ڈالے گا۔ یہاں تک کہ ایک لڑکا ایک چابک اور ایک لکڑی ایک ھھبنیر کے بدلے میں فروخت ہو جائے گی "۔

عبد الرحمٰن تلوار کا دھنی اور تدبیر کا ماہر تھا۔ اس کا یہ اصولِ سیاست تھا کہ جب تک ناخنِ تدبیر سے کام نکل سکے سیاسی گتھیوں کو تلوار کی نوک سے نہ سلجھایا جائے۔ افریقہ کے بربروں کی جاہلیت اور اُن کے مذہبی جوش وجنوں سے وہ بخوبی واقف تھا اس لئے موقع اور وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے حزم واحتیاط اور تدبیر سے کام لینے کا فیصلہ کیا وہ جانتا تھا کہ جاہل مگر مذہب کے دیوانے بربروں میں مذہب کے ذریعہ ایسی آگ لگائی جا سکتی تھی جو کسی سے بجھائے

نہ بنے۔ مذہبی فساد کی کھلبلی چھوڑ کر اس نے شاہان بنی فاطمہ کی توجہ اور فتنہ انگیز تبدیلیوں کو اندلس سے ہٹا کر افریقہ کی طرف منعطف کرا دیا۔

شرفائے عرب کے اقتدار کا زوال | عرب امراء کی مستقل سرکشی اور بغاوت سے امیر عبدالرحمٰن ان سے سخت ناراض اور نالاں تھا۔ قبائلی عصبیت کی بنا پر ان عرب امیروں اور سرداروں میں رقابت چلی آتی تھی اور ان کے اختلاف صرف زبانی بحث و مباحثہ اور لفظی مخالفت ہی تک محدود نہ رہتے تھے بلکہ معمولی باتوں پر قیامت برپا ہو جاتی تھی اور تلوار سے فیصلے ہوتے تھے اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب کبھی بھی عنانِ حکومت کمزور یا عیش پرست فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں آئی تو ان امرا نے اس سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور حکومت کی قوت و طاقت میں خلل پیدا کیا غرور قومی کی بنا پر یہ عرب امرا بقیہ تمام لوگوں کو حقارت و تذلیل کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی باہمی رشک و رقابت نے اندلس کی زمین پر بارہا خون کے بادل برسائے امیر اندلس کے سب سے زیادہ مخالف دراصل یہی امرا تھے کیونکہ امیر کے منتظم اور صاحبِ جبروت ہونے سے ان کی عظمت و اقتدار اور ہمہ گیر اثر کو صدمہ پہنچتا تھا ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ اگر انصرامِ سلطنت اور انتظامِ حکومت مضبوط ہاتھوں میں ہوگا تو ان کی مطلق العنانی کا خاتمہ ہو جائے گا جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا اسی قدر مخالفت میں وہ زیادہ سرگرم تھے بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل قسم کی بداخلاقیوں کے مرتکب تھے۔ ملک میں امن و اماں اور امیر قرطبہ کی فرمانروائی کے لئے یہ لازمی اور ضروری تھا کہ ان خود غرض اور خودسر اربابِ جاہ کے اعمالِ شنیعہ کی روک تھام کے لئے سخت داروگیر کی جائے۔ ممکن تھا کہ عرب سرداروں کی اصلاح کے لئے وہ کوئی

نرم طریقہ اختیار کرتا لیکن مدت کی قبائلی عصبیت، عربی نخوت، دولت واقتدار کا فخر اور بے جا حکومت وریاست کا زعم ہوتے ہوئے وہ آسانی سے راہ راست پر آنے والے لوگ نہ تھے۔ اس لئے اس نے وسیع اختیارات اور امتیازات جو اب تک شرفاء عرب کو حاصل تھے منسوخ کر دئے۔ اور "ان کی قوت واقتدار کو اس بری طرح کچلا کہ وہ جزیرہ نما اندلس میں تکلیف دہ عنصر نہ رہے"۔ انہیں اور دوسرے سرداروں میں کوئی خاص فرق وامتیاز نہ تھا۔ جس کی بنا پر وہ فخر کر سکتے۔ ان کی جگہ ایک نیا طبقہ امراء کا قایم ہوا جو مصر کے "مملوک" اور ہندوستان کے ترکی غلاموں سے مشابہت رکھتا ہے"۔

نئے اصول حکومت تخت نشین ہوتے ہی عبدالرحمٰن کو یہ واضح ہوگیا تھا کہ امن وامان قائم رکھنے اور انصرام سلطنت کے لئے یہ ضروری ہے کہ انتظام حکومت کی اصلاح کی جائے امرا اور عمال کو جو آزادی اور غیر محدود اختیارات حاصل تھے ان پر پابندی عاید کی جائے۔ اور کل قلمرو میں امیر کے علاوہ کسی کو شاہی اقتدارات عمل میں لانے کا اختیار وقدرت نہ ہو۔ اب جبکہ اٹھارہ برس کی جاں توڑ اور مسلسل کوششوں کے بعد وہ اپنے اور ملک کے دشمنوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا تھا اور ساری بغاوتوں اور شورشوں کا قلع قمع کر چکا تھا وہ انتظام حکومت کی اصلاح اور درستگی کی طرف متوجہ ہوا اور حکومت کے نئے اصول مرتب کئے۔ تلخ تجربہ کی بنا پر عبدالرحمٰن کو عربی امرا اور پرانے عہدیداروں سے شکایت ونفرت تھی اس لئے پرانے رؤسا کا اقتدار واثر توڑنے کے لئے اس نے مطلق العنانی کو اپنا شعار بنایا۔ اور انتظام حکومت وانصرام سلطنت کلیۃً اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اپنے طرز حکومت اور نظریہ کی وضاحت

کرتے ہوئے ایک مرتبہ اس نے اڈوڈی گریٹ کے سفیر سے کہا کہ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہارا بادشاہ بڑا دانشمند اور صاحب فراست ہے۔ لیکن اس کے طریقۂ حکمرانی میں ایک بات ایسی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ اور وہ یہ ہے کہ حکومت کو کلیتہً اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے وہ اپنے ماتحتوں کو حکومت میں شریک و سہیم کرتا ہے بلکہ ان کے قبضہ میں ملک کا انتظام دیدیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے بادشاہ کا اعتبار ان کے دلوں میں قایم ہو جائیگا۔ مگر یہ سخت غلطی ہے امرائے سلطنت کے اختیارات میں وسعت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتے کہ ان کا غرور بڑھ جائے۔ اور ان کی اولاد بغاوتیں برپا کرے" عنانِ حکومت امیر کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔ اور اس کی ذات سلطنت کا محور و مرکز تھی۔ جملہ سردار و رئیس اس کے نائب کی حیثیت سے صرف انھی اختیارات کو عمل میں لا سکتے تھے جو ان کو امیر کی جانب سے عطا ہوتے تھے۔ ان کی بیجا حرکات اور ظلم و ستم کے انسداد کے واسطے ان کی طاقت اور آزادی کو سلب کر لیا گیا اہم امور میں ان کو امیر کی رائے اور اجازت حاصل کرنی ضروری اور لازمی تھی یہاں تک کہ اہم مسئلوں میں وزراء تک کو امیر کی اجازت کے بغیر کسی فیصلہ یا اقدام کا حق و اختیار نہ تھا۔ بڑے بڑے عہدوں پر صرف وہی لوگ فائز ہو سکتے تھے جن کی لیاقت اور وفاداری پر امیر کو اطمینان و اعتبار تھا۔ شاہانہ رعب و اقتدار قایم کرنے کی نیت سے عبدالرحمن نے اپنی فوجِ خاص کی تعداد میں اضافہ کیا اور اپنی ذاتی حفاظت کے لئے باڈی گارڈ مقرر کیا جو اس کے اپنے غلاموں یا "مملوک" پر مشتمل تھا ان غلاموں کا تعلق براہ راست امیر کی ذات سے ہوتا تھا۔ وہ اپنی لیاقت و قابلیت کی بنا پر منتخب اور مقرر کیے جاتے تھے۔ اطاعت و فرمانبرداری، جانفشانی اور کارگذاری کے لحاظ

سے ان کی ترقی ہوتی تھی اور بہ اعتبار لیاقت وکارگزاری سلطنت کے تمام شعبوں میں اہم عہدے انھیں کو تفویض ہوتے تھے چونکہ نسلی ولسانی حیثیت سے یہ لوگ اندلس میں اجنبی اور پردیسی تھے اس لئے انھیں سلطنت کے دوسرے باشندوں سے کوئی خاص تعلق یا لگاؤ نہ ہوتا تھا اور نہ عوام سے کوئی ہمدردی۔ ان کی عظمت واقتدار خلیفہ کی ذات وحکومت سے وابستہ ہوتی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ وفادار ہوتے تھے ان کی حیثیت شاہانِ مصر کے مملوک اور ہندوستان کے چہل گانیوں کے مشابہ اور مترادف تھی۔ اگرچہ وہ خود غلام تھے لیکن ان کی حیثیت جاگیردارانہ اور زندگی رئیسانہ ہوتی تھی ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کی تعدا د رفتہ رفتہ بڑھ کر تین ہزار سات سو پچاس (۳۷۵۰) سے تیرہ ہزار سات سو پچاس (۱۳۷۵۰) ہوگئی تھی۔

بنو فاطمہ اور افریقہ ملک میں امن وامان قائم کرنے اور باغیوں کی سرکوبی سے اسے فراغت نہ ہوئی تھی کہ اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ اور ایک نیا دشمن نمودار ہوا۔ شمالی افریقہ کے ساحل پر بنی اغلب کو نکال کر بنی فاطمہ نے اسماعیلی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی ماری ٹانیا سے لے کر مصر تک تمام زرخیز اور شاداب علاقہ پر وہ قابض ہو چکے تھے ان کا دعویٰ اور عقیدہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام کی قیادتِ عظمٰی کے وہی جائز اور واحد حقدار تھے۔ ان کے جاسوس اور ایجنٹ ملک کے ہر حصہ اور ہر طبقہ میں مختلف بھیسوں میں اپنے خیالات اور عقائد کی تبلیغ کرتے تھے۔ ذہین ودوربیں، جاسوس، سوداگر، سیاح اور درویشوں کے لباس میں اسپین کے جملہ حالات کی مفصل ومکمل اطلاع اپنے قیروانی آقاؤں کو پہنچاتے تھے۔ ابن حوقل کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اسماعیلی جاسوس اسپین کی ایک ایک بات نوٹ کرتے تھے وہ لکھتا ہے کہ "جو چیز غیر ملک والوں کو

اس جزیرہ میں قدم رکھتے ہی متعجب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک ابھی تک اسی بادشاہ کے قبضہ میں ہے جو اس پر حکومت کرتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے مردہ دل اور غلاموں کی سی طبیعت رکھتے ہیں وہ نامرد ہیں۔ گھوڑے کی سواری نہیں جانتے اور ہرگز اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ایک تربیت یافتہ فوج کے مقابلہ میں تابِ مقاومت لاسکیں۔ تاہم ہمارے آقا (فاطمی خلیفہ مصر) خدا ان پر اپنی برکتیں نازل رکھے۔ اس ملک کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ملک کی آمدنی کس قدر زیادہ ہے اور اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں؛" اصلاحِ مذہب کے لباس میں اسماعیلی ایجنٹ اپنی ریشہ دوانیوں اور خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے سیاسی شورشوں اور انقلابی سازشوں میں سرگرم رہتے تھے اندلس کی پُراضطراب سیاسی حالت اور عبدالرحمٰن کے محدود وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ بنی فاطمہ سے براہ راست نپٹنے کی کوشش کرے لیکن بنی فاطمہ کے سامراجی منصوبوں اور دست برد سے محفوظ رہنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی روز افزوں ترقی کو روکا جائے خاص کر ایسی حالت میں جبکہ اسپین کے بربریوں کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اسماعیلیوں کا افریقہ میں قوت و اقتدار حاصل کرنا عبدالرحمٰن کے لئے نہایت مخدوش تھا۔ اس لئے پہلے کی طرح دور اندیشی اور تدبر سے کام لیتے ہوئے مقامی سرداروں اور حکمرانوں کو ہر طرح کی غیر مشروط مالی اور اخلاقی مدد دی تاکہ وہ اپنی ہستی اور آزادی قائم رکھ سکیں۔ اور بنی فاطمہ کے قبضہ و اقتدار کی سیلابی موجوں کے تھپیڑوں سے اموی سواحل محفوظ و مامون رہیں۔ اپنے محدود فوجی و مالی ذرائع اور بنی فاطمہ کی شہنشاہیت سے مجبور ہو کر نکور کے شاہزادوں نے امیر اندلس کی سرپرستی قبول کر لی۔ اس طرح اپنی فیاضی، سیاسی تدبر اور بیدار مغزی سے امیر عبدالرحمٰن نے نہ صرف بنی فاطمہ کی تباہ کن ترقی اور

تشویشناک پیش قدمی کا سدِ باب کیا بلکہ سواحل افریقہ پر بھی بنوامیہ کا اثر و اقتدار قائم کر دیا۔

عیسائیوں سے جنگ | شمال میں لیون اور نوار کی عیسائی ریاستیں امیر اندلس کے لیے ایک مستقل دردسر کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی طاقت اور تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا پلیو کا جوش و خروش ان میں اب بھی موجود تھا۔ اور یہ برانگیختہ کرنے والا خیال ان کے لئے مہمیز کا کام کرتا تھا کہ ہم خود اپنے ملک کو پھر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ تخت نشین ہوتے ہی عبدالرحمٰن نے شمالی سرحدوں کی حفاظت کے واسطے متعدد موزوں دفاعی تدابیر اختیار کی تھیں تاکہ سرحدی علاقے لیون اور قشتالہ کے "کھٹر لوٹیروں" کی بے پناہ اور پیہم تاخت و تاراج سے محفوظ و مامون رہیں عیسائی حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا اور وہ اندلس کی ایک انچ زمین پر بھی مزید قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن وہ بزدل یا ہمت ہارنے والے آدمی نہ تھے ہر شکست کے بعد پہلے سے بھی زیادہ تیار اور نڈر ہو کر چڑھائی کرتے اس لئے ۹۲۰ء میں جب عبدالرحمٰن کو اندرونی خلفشار سے کچھ مہلت اور آزادی ملی تو وہ اسلامی حکومت کے ازلی مخالفین اور اپنے پرانے خاندانی دشمنوں کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوا ان کی گوشمالی اور سرکوبی کے لئے اس نے نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر لیون اور نوارا کے عیسائیوں کے خلاف فوج کشی کی۔ اوسمہ۔ کلونیہ۔ سن الیس ٹیوان وغیر مقامات کو فتح کرتے ہوئے نوار پر حملہ کیا جہاں کے بادشاہ سنیکو نے نہایت پامردی اور بہادری سے مقابلہ کیا مگر سخت گھمسان کی لڑائی کے بعد بری طرح شکست کھائی اور فرار ہو کر پناہ اور مدد کے لئے شاہ ارڈون کے پاس گیا۔ وادی جن کیورا میں پھر ایک بار سخت مقابلہ ہوا لیکن عیسائیوں کو پھر شدید شکست ہوئی ہ میلوں تک ان کی لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے عیسائیوں کا ایسا قتل عام پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ فیصلہ کن

جنگ کے بعد عبدالرحمٰن کی فوجوں نے ارڈون کے ملک کو روند ڈالا۔

جُن کیورا کی ہولناک شکست کے باوجود عیسائیوں کی ہمتوں اور ارادوں میں کوئی خاص فرق نہ آیا اور سینکو اور ارڈون دونوں نے مل کر اسلامی عملداری میں پھر ڈاکہ ڈالنے کی جرأت کی اور ناجرہ وبقیرہ دو شہروں پر قبضہ کر کے وہاں کی بیشتر آبادی کو قتل کر دیا اپریل ۹۲۴ء میں عبدالرحمٰن کچھ اس تیاری اور طیوروں سے عیسائیوں کے ظالمانہ افعال کی روک تھام اور انتقام کے لئے نکلا کہ ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ مسلمانوں کا کسی مقام پر بھی جم کر مقابلہ کریں اور بغیر کسی مقابلہ و مزاحمت کے سینکو کے دارالخلافہ پاتی لونہ (منبلونہ) پر قبضہ کر لیا گیا ان لوگوں کو سزا دینے کی نیت سے اس دفعہ عبدالرحمٰن نے اپنی فوج کو لوٹ مار اور آگ لگانے کی اجازت دے دی۔ آخر مجبور ہو کر سینکو کو جو بقول پروفیسر ڈوزی بہت مغرور تھا امیر عبدالرحمٰن کے سامنے گردن جھکانی پڑی اور آئندہ ایک مدت کے لئے وہ اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتا۔ عبدالرحمٰن کی خوش قسمتی سے اس عرصہ میں ارڈون شاہ لیون کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں میں تخت سلطنت کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جو ۹۳۰ء تک جاری رہی۔ عبدالرحمٰن کو اب شمالی علاقوں کی طرف سے جو فکر و پریشانی لاحق رہتی تھی وہ رفع ہو گئی اور اسے اطمینان و سکون کا موقع ملا کہ وہ اپنی سلطنت میں فتنہ و فساد کے شعلوں کو ٹھنڈا کر کے امن و اطمینان قایم کرے۔

خلیفہ | تخت نشینی کے وقت عبدالرحمٰن نے اندلس کو ناگفتہ بہ حالت میں پایا تھا ہر طرف بغاوت کی آگ لگی ہوئی تھی۔ امن و امان۔ تہذیب و تمدن۔ ہر چیز فتنہ و فساد کے شعلوں کی نذر ہو رہی تھی۔ اٹھارہ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد اندلس میں امن و سکون قایم ہوا۔ اب تک اسپین کے فرمانروا ملک، امیر یا ابن الخلفاء کہے جاتے تھے اور عباسیوں سے

سیاسی اختلافات وعداوت کے باوجود انھوں نے "امیرالمومنین" کا لقب نہ اختیار کیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ حرمین شریفین کے محافظ و مالک ہی اس اعزاز کے مستحق ہیں لیکن اب جبکہ عباسی خلفاء کی حیثیت کٹھ پتلیوں اور وظیفہ خواروں سے زیادہ نہ تھی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر بھی ان کا قبضہ و اقتدار نہ تھا۔ عبدالرحمٰن نے مناسب و ضروری خیال کیا کہ وہ امیرالمومنین کا خطاب اختیار کرے۔ ۱۶ر جنوری ۹۲۹ء سے اس کا نام "امیرالمومنین حامی دین عبدالرحمٰن الناصرلدین اللہ" خطبوں اور سرکاری کاغذات میں لکھا اور پڑھا جانے لگا دسویں صدی عیسوی میں کوئی دوسرا اس خطاب ولقب کے لئے موزوں ومستحق بھی نہ تھا یہ اسی کی کوششوں کا ثمرہ ونتیجہ تھا کہ اسپین میں پھر ایک مرتبہ عربوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور بنوامیہ کی سلطنت کو نئی زندگی اور پورا عروج حاصل ہوا۔ بقول لین پول "یہ اس کی مدت اپنی مملکت کے اندر عاقلانہ انتظام کرنے اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ہر سال جہادی فوجیں بھیجنے میں صرف ہوئی۔ اس لئے وہ عیسائیوں کے مقابلہ میں بجاطور اپنے مذہب کا ناصر یعنی پشت پناہ تھا۔"

اعلان جہاد خلیفہ ناصر کو خبر ملی کہ زیراگوزا کے گورنر نے شمال کے عیسائیوں سے امیر کے خلاف سازباز کی اس نے فوراً ہی اس سازش کے تدارک کے لئے زیراگوزا پر چڑھائی کی اور اس کو تسخیر کرنے کے بعد نوارا پر حملہ کیا۔ نائب السلطنۃ ملکہ طوطہ نے شکست مان کر صلح کی درخواست کی اور خلیفہ کو نوارا کا سرپرست وبالادست تسلیم کرلیا مگر رومیر ثانی شاہ لیون نے اس معاہدہ اور خلیفہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کردیا اب جبکہ بنوامیہ کا آفتاب اقتدار نہایت آب وتاب سے آسمان اندلس پر ضو فشانی کررہا تھا خلیفہ ناصر نے فیصلہ کیا کہ روز روز کی چھیڑ چھاڑ اور مسلسل سالانہ سرحدی جھڑپوں کے استیصال

کے لئے شمال کی عیسائی ریاستوں کو فتح کر کے اس کانٹے کو ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے اوران کی سرفروشانہ مذہبی جنگوں سے جو خدشہ و خطرہ اسلامی حکومت کو تھا اسے ہمیشہ کے لئے ..... ختم کر دیا جائے اس کو معلوم تھا کہ کس طرح قرطبیوں کے سردار بلیو نے تین سو آدمیوں کے ساتھ استور یاد کے پہاڑی علاقے میں پناہ لی تھی اور کو دے ڈونگا کی پہاڑی کھو میں ان عیسائی ریاستوں کی بنیاد ڈالی تھی جنہوں نے آہستہ آہستہ ترقی کرکے اب یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ حکومت قرطبہ کی مدمقابل تھیں اور مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے کے لئے ہمیشہ کوشاں و سرگرداں۔ چنانچہ فیصلہ کن جنگ کی نیت سے اس نے جہاد کا اعلان کیا تاکہ اندلس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے مسلمان بھی اس میں شریک ہوسکیں۔

یوم الخندق | سرحد کے عیسائی حملہ آوروں کا مقابلہ اور قلع قمع کرنے کے لئے خلیفہ نے ہر ممکن تیاری کی۔ اور ایک لاکھ کی زبردست فوج جو ہر قسم کے آلات حرب و سامانِ رسد رکھتی تھی اس معرکہ وجہاد کے واسطے قرطبہ سے روانہ ہوئی۔ اس فوج میں مصر، شام، ماری ٹانیا تک سے لوگ آکر شامل ہوتے تھے تاکہ "کفار کی ذلت کا تماشا دیکھیں، اور ان کے کھیتوں، گرجاؤں اور محلوں کو لوٹیں" ۔ اپنے باڈی گارڈ کی معیت وجلو میں خلیفہ نے بنفسہٖ فوج کی قیادت کی لیکن کل فوج کا سپہ سالار نجدۃ الحمیری کو مقرر کیا۔ چونکہ نجدہ صقالبہ یعنی شاہی غلام تھا اس لئے عرب امیروں اور سرداروں کو سخت ناگوار خاطر ہوا۔ ان کی مطلق العنانی اور نئے اصولِ حکومت سے وہ پہلے ہی نالاں اور بددل تھے۔ نجدہ کے سپہ سالار ہونے سے ان کی بددلی نفرت و کینہ میں تبدیل ہوگئی اور "غصہ کی حالت" میں انھوں نے اپنی اس تذلیل کا بدلہ لینے کا قطعی ارادہ کر لیا اور سوچ لیا کہ اس جنگ میں

ناصر کو ایسی شکست دلوائیں گے جسے وہ کبھی نہیں بھولے گا"

بغیر کسی مقابلہ یا مزاحمت کے خلیفہ کی فوج زمورا تک پہنچ گئی یہ شہر نہایت ہی محفوظ تھا۔ شہر کی سات فصیلیں تھیں، اور وہ نہایت مضبوط اور مستحکم تھیں ہر ایک فصیل کے درمیان فاصلہ اور ایک وسیع خندق تھی اور ہر ایک خندق میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بیرونی فصیلوں کو پار کرکے جب عرب آگے بڑھے تو انھیں تیروں اور نیزوں کی موسلا دھار بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن عربوں نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے لڑائی جاری رکھی اور اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر خندق کو پار کیا اس قیامت خیز معرکہ میں عرب سرداروں نے غداری کی اور اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹا لیا اس حماقت کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ کو شکست فاش ہوئی۔ خلیفہ کی محافظ فوج نے نہایت بہادری اور ثابت قدمی سے جنگ کے پانسہ کو پلٹنا چاہا مگر ناکامیاب رہی۔ ایسی ہولناک شکست مسلمانوں کو اندلس میں کبھی نہ ہوئی تھی تمام لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کا فاتحوں نے نہایت بے دردی سے قتل عام کیا۔ امیہ بن اسحاق عیسائیوں سے شروع ہی میں جا کر مل گیا تھا۔ اس نے دشمنوں کو خلیفہ کی پوشیدہ باتوں اور کمزوریوں سے آگاہ کر دیا تھا اور علامہ مقری کے بیان کے مطابق یہ امیہ بن اسحاق ہی تھا جس نے رومیر کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کو باوجود طالب امان نہ دے علامہ مقری کا خیال تھا کہ "اگر یہ بات (غداری) نہ ہوتی تو مسلمانوں پر جو کچھ مصیبت پڑی وہ ہرگز نہ پڑتی" ابن خلدون، مسعودی اور مقری کے تخمینہ کے مطابق اس معرکہ اور قتل عام میں پچاس (۵۰۰۰۰) ہزار مسلمان کام آئے۔ بڑے بڑے فوجی افسر گرفتار ہوئے۔ سالار اعظم مارا گیا۔ اور خلیفہ بمشکل اپنی جان بچا کر قرطبہ پہنچا۔

اندلس کے مسلمانوں کو ایسی شکست کبھی نہ ہوئی تھی۔ اگر عیسائیوں نے اپنی فتح

وکامیابی سے پورا فائدہ اٹھایا ہوتا تو اسپین کی تاریخ کا نقشہ بدل گیا ہوتا اور غزوۂ خندق کا شمار دنیا کی اہم ترین اور فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا خلیفہ کی خوش قسمتی سے لیون اور قشتالہ کے عیسائیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ ان کے اندرونی جھگڑوں اور باہمی عداوت اور کشت وخون کی بدولت خلیفہ ناصر کو مہلت مل گئی کہ وہ جنگ خندق کی مصیبت کی تلافی اور عیسائیوں سے بدلہ لینے کی مکمل تیاریاں کرے۔

عیسائیوں کی باہمی مخالفت وعداوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلیفہ نے متعدد بار لیون کے خلاف اپنی فوجیں بھیجیں اور ہر طرف عیسائیوں کو شکست ہوئی خاص کر ۹۴۴ء اور ۹۴۸ء کی مہموں کی کامیابی سے اس کا وقار از سر نو قائم ہوگیا۔ اور جنگ خندق کی شکست کی کافی تلافی ہوگئی خلیفہ نے اس قسم کی تعزیری مہموں کا برابر سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ مجبور ہو کر انھوں نے ہتھیار ڈال دئے اور صلح کے لئے درخواست کی۔ ۹۵۵ء میں ردمیر فاتح خندق کے بیٹے اور جانشین اردون ثالث سے ان شرائط پر صلح ہوگئی کہ اس نے خلیفہ ناصر کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرلیا۔ اور وعدہ کیا کہ قرطبہ کی سرحدوں پر اپنے قلعوں کو خالی یا منہدم کردے گا نیز وہ آئندہ کبھی اندلس پر حملہ نہ کریگا لیکن اردون ثالث کی وفات پر اس کا بھائی اور حریف سینکو تخت نشین ہوا اور اس نے معاہدہ کی شرطوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اس لئے جولائی ۹۵۷ء میں خلیفہ کے حکم کے مطابق احمد بن یعلی، گورنر طلیطلہ کو سینکو کے خلاف چڑھائی کا حکم دیا اور شکست فاش دی۔

(باقی آئندہ)

ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی

(۲)

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

روہیلوں میں بےچینی | بادشاہ کے مذکورالذکر واقعات نے روہیلوں میں عام بےچینی پیدا کردی اور مشورہ ہونے لگے کس طرح مرہٹوں کے پنجے سے اس بے سمجھ بادشاہ کو چھڑایا جائے اور رہی سہی جو حکومت ہے وہ بچالی جائے نواب ضابطہ خاں نے اپنے وقار کی خاطر سکھوں سے ساز باز کیا حتیٰ کہ شہرت یہ اڑی کہ وہ سکھ ہوگیا آخرش نجف خاں کے ہاتھ سے اس کی تدبیریں خاک میں مل گئیں۔ اُس کا بیٹا غلام قادر تھا یہ مرہٹوں کے ساتھ غوث گڈھ کی تباہی کے بعد سے تھا مرہٹے ضابطہ خاں کے بیوی بچے پکڑ لائے تھے بادشاہ نے غلام قادر خاں کو قتل کرا دینا چاہا مگر منظور علی خاں ناظر کی سفارش سے جان بخشی ہوئی عمر اس وقت ۹-۱۰ سال کی تھی یہ شاہت خوبصورت اور حسین تھا۔ بادشاہ نے اسے منظور نظر بنا کر خصی کرادیا اور قدسیہ باغ میں رکھا گیا بادشاہ بھی اب رنگ رلیوں کے نذر ہوگئے تھے دن رات ناچ گانا ہوتا چنانچہ غلام قادر کو زنانے کپڑے پہنا کر سامنے بلایا جاتا جب تک نادان رہا سب بادشاہ کے ظلم سہے ہوشیار ہونے پر راہ فرار اختیار کی اور اپنے باپ سے جا ملا[1]

---

[1] واقعات اظفری و عجیب التواریخ صفحہ ۱۰۵ (قلمی)

واقعات نواب غلام قادر ضابطہ خاں کے انتقال کے بعد غلام قادر جاگیر پر قابض ہوا اس کو بادشاہ سے ایک گونہ دشمنی تھی مگر اس سے زیادہ اس جماعت سے تھی جس نے غوث گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجائی چنانچہ منظور علیخاں ناظر قلعہ معلی جو مرہٹوں کی سخت گیری سے تنگ آچکا تھا غلام قادر سے مشورہ کرکے طے کیا کہ مرہٹوں کو دہلی سے باہر کرکے نئے طور سے مغلیہ سلطنت کا وقار قایم کیا جائے۔ مادھو سندھیا گوالیار گیا ہوا تھا۔ موقعہ پاکر کچھ جان نثار روہیلوں کو ہمراہ لے کر غلام قادر دلی پر چڑھ دوڑا منظور علیخاں ناظر نے بلا مزاحمت دہلی پر اس کا قبضہ کرا دیا اور غلام قادر نے اپنا آبائی منصب امیرالامرائی حاصل کرلیا۔ دربار کے امراء بادشاہ کی حرکتوں سے دل برداشتہ تھے وہ سب غلام قادر کے ساتھی ہوگئے۔

غلام قادر نے علی گڈھ کا قلعہ مرہٹوں سے چھین لیا اس کے بعد اسمٰعیل بیگ کی مدد سے آگرہ کا محاصرہ کرلیا ۱۴ رجب ۱۲۰۱ھ کو زبردست جنگ ہوئی اس میں مسلمانوں نے داد شجاعت دی۔ اس اثنا میں سہارنپور سے اطلاع آئی یہاں کے علاقہ میں سکھوں نے چیرہ دستی شروع کردی اس خبر پر نواب غلام قادر خاں کو اپنے علاقہ کو واپس جانا پڑا

امرا کی کشیدگی آغاز ۱۲۰۲ھ میں غلام قادر خاں دلی آیا شاہ عالم نے پھر سندھیا کو کمک کے لئے خفیہ طور پر طلب کیا اس حرکت سے بادشاہ کے تمام امرا بگڑ بیٹھے اور غلام قادر کے شریک اور ہمنوا ہوگئے حتیٰ کہ ساری مغل سپاہ بادشاہ کی مسلم کش پالیسی سے ٹوٹ کر غلام قادر سے مل گئی بادشاہ گھبرا گیا اور اس نے منظور علی کی معرفت غلام قادر خاں سے میل کیا اور پھر امیرالامرا اس کو بنا دیا۔

نواب غلام قادر نے شاہ عالم سے کہا آپ کے پاس جو خزانہ شاہی ہے اس

میں سے اس قدر روپیہ مرحمت فرمائے تاکہ نئے سرے سے فوج بھرتی کی جاتے اور اتنی طاقت آپ کی ہو جاوے کہ آپ کا وہ ملک جو آپ نے خود اپنے ہاتھوں مرہٹوں کو دیا ہے وہ واپس لے کر حکومت مغلیہ کی آبرو بچا لی جاوے تمام اہل کار غلام قادر کی رائے کے موئد تھے مگر سیتل داس خزانچی نے روپیہ دینے سے انکار کیا[1]۔

شاہ عالم کے اعمال کا ثمرہ | غلام قادر کو پتہ لگ گیا کہ یہ بادشاہ کی حرکت ہے یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان امرا کو وقار حاصل ہو اور اس نے وہ خط نکال کر سامنے بادشاہ کے ڈال دیا خود بادشاہ نے مادھو سندھیا کو غلام قادر کے مقابلہ میں مدد کے لئے لکھا تھا[2] اس نے شاہ عالم سے کہا اگر اس وقت ان حرکتوں سے درگذروں اور فوج کا انتظام کر لوں تو مرہٹہ قوت کو توڑ کر رکھ دوں گا مرے دادا نے آپ سے کیسی رفاقت کی اور حکومت مغلیہ کے بچاؤ میں اپنا خون پسینہ ایک کیا آپ اپنے ہاتھوں اس حکومت کو مرہٹوں کو سپرد کر رہے ہیں مگر بادشاہ نے اس کی التجا کی کوئی شنوائی نہ کی آخرش اپنی جان اور حکومت مغلیہ کو بچانے کے لیے یہ کیا کہ پہلے شاہ عالم کو معزول کیا اور ۲۲ رشوال ۱۲۰۲ھ کو احمد شاہ کے بیٹے بیدار بخت کو تخت پر بٹھایا چونکہ اس کو شاہ عالم کی مرہٹہ پرستی اور ان کے لکھنے پر روہیلوں سے لڑنے اور انھیں تباہ و برباد کر ڈالنے کا بہت ملال تھا بادشاہ کو مرہٹوں کا حامی پا کر قلعہ معلیٰ کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ غوث گڈھ کی لوٹ کے وقت اس کے خاندان پر جو کچھ گذری تھی کچھ اس سے بڑھ کر ہی شاہی خاندان پر گذر گئی[3]۔ غلام قادر کا جوش انتقام بہت بڑھا ہوا تھا۔

بادشاہ شاہ عالم کا نابینا ہونا | ۷ ر ذلقعدہ ۱۲۰۲ھ کو شاہ عالم کو دیوان عام میں بلا کر اس

---

[1] نادرات شاہی صفحہ ۲۸ [2] تاریخ ہندوستان مذکورہ ۳۳ [3] نادرات شاہی صفحہ ۲۹

سے روپیہ طلب کیا انکار کرنے پر انھیں نیچے گرا کر بیش قبض سے آنکھیں نکال لیں غلام قادر کی اس حرکت قبیح پر تمام امرا اور ارکان سلطنت اس سے بگڑ بیٹھے اور تمام ہمدردیاں اس سے جو تھیں جاتی رہیں یہ چند شہزادوں کو ساتھ لے کر میرٹھ چلتا ہوا سندھیا نے رانا خاں کی سرکردگی میں فوج بھیجی اور اس کو موقع پھر مل گیا کہ بادشاہ کو قابو میں لائے مرہٹہ فوج نے غلام قادر کو گھیر لیا اور ربیع الاول ۱۲۰۳ھ میں گرفتار کر کے بادشاہ کے انتقام میں تکا بوٹی کر ڈالی مرہٹوں کی اس کار فرمائی سے شہادت کا درجہ تو اسے مل ہی گیا سندھیا نے مصلحت سے دوبارہ بادشاہ کو تخت پر بٹھلیا مگر کل اختیارات چھین لئے اور اخراجات کے لئے ۹ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دے۔

اب بادشاہ مرہٹوں کے آلہ کار تھے کوئی روہیلہ سردار باقی نہ بچا تھا کہ ان کی معاونت کرتا اور مرہٹوں کے لئے خوف کا سبب ہوتا۔

مرہٹوں کے مظالم | کچھ عرصہ کے بعد سے ہی مرہٹوں نے وحشیانہ طور سے شاہ دہلی اور دلی والوں کو ستانا شروع کیا مغل بچوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے جو چاہتے کرتے اور جو کچھ ان کا جی چاہتا قلعہ میں دست اندازی کر کے شاہ کا دل دکھاتے شاہ عالم کی پانچویں بیوی زبدۃ النساء بیگم عاقلہ عورت تھی اُس نے مرہٹوں کا یہ رنگ دیکھا کہ وہ مقررہ رقم کے دینے میں الجھن پیدا کرتے ہیں محل کے اخراجات کو سخت تنگی سے پورا کیا جاتا ہے شاہ عالم سے کہا لارڈ ولزلی کے نام خط روانہ کرو اور اب انگریزوں کے ذریعہ ان مرہٹوں کے پنجہ سے رہائی پاؤ چنانچہ بادشاہ نے لارڈ ولزلی کو اپنی مصیبت کی داستان لکھی کہ " میری مرہٹوں کی قید میں اور بھی حالت بدتر ہے وہ وزیر بن کر رہتے ہیں لیکن اُلٹی مجھ پر حکومت کرتے ہیں مابدولت کی دلی خواہش ہے کہ میں اپنا دستور تمہیں بناؤں یا

اُس شخص کو جسے تم پسند کرو مری آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں تم بہت جلد آؤ اور مجھے مرہٹوں کی قید سے رہائی دلاؤ۔[1]

لارڈ ولزلی | جونہی لارڈ ولزلی نے یہ شقہ سلطانی دیکھا بہت خوش ہوا اس کے جواب میں لارڈ موصوف نے بادشاہ کا اطمینان خاطر کر دیا کہ

"آپ گھبرائیں نہیں عنقریب مرہٹوں کی قید سے آپ کو ہم لوگ رہائی دیتے ہیں۔"[2]

مگر ڈاکٹر جتیندر کمار مجمدار ایم اے پی ایچ ڈی دیباچہ "راجہ رام موہن رائے" میں لکھتے ہیں کہ

"مرہٹوں کے ہمنوا فرانسیسی تھے اور وہ سندھیا کے پردے میں روز بروز اقتدار قائم کر رہے تھے پیرن کا توپ خانہ اور فوج اور فرانسیسی مقبوضات جو شمالی مغربی ہندوستان پر سندھیا کی حمایت میں مغلیہ حکومت کے کھنڈرات پر قائم تھے اس بڑھتی ہوئی حالت سے انگریز خوف زدہ تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرہٹوں کی آڑ لے کر فرانسیسی بادشاہ کو اپنا آلہ کار بنالیں گورنر جنرل نے کمانڈر انچیف کو اختیارات دے دئے کہ وہ شاہ عالم سے معاہدہ کرلے کہ اگر بادشاہ سلامت حکومت برطانیہ کی حفاظت میں آنا چاہیں شرائط کے تحت آ سکتے ہیں چنانچہ بادشاہ کو گورنر جنرل کے نیک ارادوں سے مطلع کرنے کے لئے مارکوئز آف ولزلی نے اس مضمون کا خط ۲۳ر جولائی ۱۸۰۳ء کو بادشاہ کو لکھا کہ اگر کسی وقت حالات نازک ہو جائیں تو آپ فوراً ہماری حفاظت میں آسکتے

[1] تذکرہ عالم صفحہ ۲۵۶ از مولوی رحیم بخش دہلوی [2] تذکرہ عالم صفحہ ۲۵۶

ہیں اور اس امر کا بھی یقین دلایا کہ اگر آپ ہماری پناہ میں آجائیں تو ہر اعتبار سے برطانوی حکومت آپ کا اعزاز قایم رکھے گی اور ایک معقول وظیفہ آپ کے اور آپ کے خاندان والوں کے لئے دے گی ...... اعلیٰ حضرت اس کو خوشی سے منظور کرلیں گے۔[1]

کمانڈر انچیف کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ یہ پیغام رازداری کے ساتھ خفیہ طور سے بادشاہ تک پہنچایا جائے تاکہ فرانسیسی آفیسر کو جو دولت راؤ سندھیا کی طرف سے بادشاہ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے یہ موقع نہ ملے کہ وہ انگریزوں کو بادشاہ سے نہ ملنے دے اور اس طریقہ سے ان کی تجویز کو کامیاب نہ ہونے دے۔ سعید رضا خاں جو دہلی میں دولت راؤ سندھیا کے ریذیڈنٹ کا ایجنٹ تھا اس کام کے کرنے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔ مذکورہ خط کے متعلق بادشاہ کا جواب جو سعید خاں کی معرفت بھیجا گیا بہت امید افزا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے بصد شوق اس کا بھی اظہار کیا کہ وہ برطانوی حفاظت میں آنے کو تیار ہیں۔[2]

دہلی پر انگریز اور مرہٹہ جنگ

پہلی مرہٹہ جنگ میں انگریزوں نے جان توڑ کر لڑائی لڑی اور انھیں شکست دی۔

دوسری جنگ دہلی پر ہوئی اور یہ خونخوار جنگ تھی انگریزوں نے لارڈ لیک

---

[1] مقدمہ "راجہ رام موہن رائے" مترجم مولوی سراج الحق بی۔ اے علیگ رسالہ مصنف مارچ ۱۹۴۳ء

[2] رسالہ مصنف علی گڈھ مارچ ۱۹۴۳ء صفحہ ۹۰

کو اس جنگ کے لئے مقرر کیا تھا وہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر حملہ آور ہوا دولت راؤ سندھیا کی طرف سے اس کا فرانسیسی جنرل بوکین تھا، مرہٹہ اس جنگ کو دل لگی کی جنگ سمجھ رہے تھے اس لئے انھوں نے اس میں اتنا ندرہی نہیں دیا صرف جنرل بوکین صف آراء تھا جب خونریزی کے ساتھ جنگ شروع ہوئی تو مرہٹوں نے شاہ عالم کو مجبور کیا کہ آپ مل کر جنگ کریں زبدۃ النساء نے ہر چند چاہا کہ بادشاہ انگریزوں کے مقابلہ میں نہ جائے لیکن مرہٹے بضد رہے آخرش زبدۃ النساء شاہ کے پیچھے خود ہاتھی پر بیٹھی اور ہاتھی میدان جنگ کی طرف چلا شاہ کے ہاتھ میں تیر و کمان تھی وہ بحالت عدم بینائی کیا تیر چلاتے مرہٹوں کا مجبور کرنا تھا چنانچہ زبدۃ النساء پیچھے سے کہتی جاتی تھی تیر ہاتھ بلند کر کے ملرے جاییے اسی اثناء میں بیگم نے لارڈ لیک کے نام شاہ کی مہر سے ایک شقہ بھجوا دیا جس میں اپنی مجبوری کا اظہار تھا آخرش مرہٹہ لارڈ لیک کے مقابل شکست یاب ہوئے ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی فتح ہوئی لارڈ لیک نے بادشاہ کے حضور میں آکر عرض کیا حضور اب مرہٹوں کی قید سے آج آزاد ہوگئے زبدۃ النساء نے شاہ کی طرف سے کہا شاہ آپ کو فرزند دلبند کا خطاب عطا فرماتے ہیں اور آپ کو اس نمایاں فتح پر مبارک باد دیتے ہیں لارڈ لیک نے یہ سن کر ٹوپی اتار کر سلام کیا شاہ کے خطاب عطا کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ گوروں کی پلٹنوں نے لارڈ لیک کے حکم سے شاہ عالم کی سلامی اتاری اور پھر بڑے جاہ و جلال سے شاہ قلعہ میں داخل ہو کر تخت پر رونق افروز ہوئے[1]۔

انگریزی قبضہ ۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو برطانوی فوجوں نے جمنا عبور کر کے دار السلطنت پر قبضہ کر لیا

---

[1] تذکرۂ عالم صفحہ ۲۵۶

۱۴ کو کمانڈر انچیف جنرل لیک شہر میں داخل ہوئے دہلی کے سارے باشندہ جو مرہٹوں کے مظالم کا شکار رہے تھے دولت اُن کی لُٹی تھی عزت و آبرو خاک میں مل رہی تھی وہ اس واقعہ سے بے حد خوش ہوئے ادھر جنرل لیک نے ہر ایک کی دلجوئی اور تشفی کی جس پر دہلی کے باشندے اور بالخصوص مسلمان اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کا احاطہ تحریر سے باہر ہے[1]۔ جنرل کو سلطنت کا دوسرے نمبر کا خطاب ملا تھا کیونکہ پہلا خطاب سندھیا کو دیا جا چکا تھا اب شمالی مغربی صوبوں میں ان کی کامیابی سے فرانسیسی اثر و اقتدار پر بڑا اثر پڑا اور دوآبہ کا علاقہ برطانیہ کے لئے محفوظ ہو گیا[2]۔

بادشاہ کی سخاوت | باوجودیکہ بادشاہ کی بہت زبوں حالت تھی جس وقت دہلی کے قلعہ میں گئے ہیں شکستہ حالی میں گرفتار۔ ضعیفی۔ غربت۔ عدم لبصارت ایک بوسیدہ شامیانہ کے نیچے بیٹھے ہوئے۔ اپنی گزشتہ عظمت پر آنسو بہا رہے تھے۔" معلوم ہوا دولت راؤ سندھیا کا ۶ لاکھ روپیہ فرانسیسی کمانڈر دہلی کے پاس تھا جو اس کے خزانچی شاہ نواز خاں کے پاس موجود ہے کمانڈر انچیف کو بھی اس کی اطلاع ملی انھوں نے ایک مودبانہ درخواست بادشاہ کے حضور میں گذار دی کہ یہ رقم ہم کو عطا ہو بادشاہ نے اپنی فراخدلی سے بنظر عنایت وہ رقم کمانڈر انچیف کے خیمہ میں بھیجدی اور اس کو پیغام بھیجا کہ یہ رقم بطور شاہانہ عطیہ قبول فرمائی جائے[3]۔

ریذیڈنٹ کا تقرر | شاہ عالم اب انگریزوں کی حفاظت میں تھے" کمانڈر انچیف دہلی سے روانہ ہونے لگے لفٹننٹ کرنیل اکڑلونی کو جو ڈپٹی ایجوٹنٹ جنرل تھے برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے دربار مغلیہ میں ریذیڈنٹ بنائے گئے[3]۔

---

[1] مقدمہ راجہ رام موہن رائے صفحہ ۸۹ [2] ایضاً [3] دیباچہ راجہ رام موہن رائے صفحہ ۱۷

دو سال جوں توں کر کے گذرے اس اثنا میں ریواڑی پر برطانیہ کی فتح ہوئی تھی بادشاہ نے کمانڈر انچیف کو اس فتح کے صلہ میں اعزازی خلعت دے کر اپنی مسرت اور جانبداری کا اظہار کیا:-

افسران برطانیہ میں مشورہ ہوا کہ شاہ دہلی مدت ہوئی اپنا شاہی وقار کھو چکے ہیں اور اس کو از سرِ نو زندہ نہ کیا جائے۔ اس بنا پر شاہی رتبہ اور وظیفہ کے متعلق اختلاف رونما ہوا[1]۔

۲۳ رمئی ۱۸۰۵ء کو ریذیڈنٹ متعینہ دہلی کی معرفت بادشاہ کو مطلع کیا گیا ہمارے اور آپ کے تعلقات کن شرائط پر ہوں گے اور اقرار نامہ بھیجا گیا جس کی مختصر شرطیں یہ ہیں

" وہ خاص علاقہ جو دہلی کے نواح میں دریائے جمنا کے داہنی طرف واقع ہے شاہی خاندان کی کفالت کے لئے بموجب شرائط اقرار نامہ دیدیا جائے اور یہ علاقہ دہلی ریذیڈنٹ کے ماتحت رہے گا۔ مالیات کا وصول کرنا اور انصاف کا قایم کرنا مطابق قوانین گورنمنٹ برطانیہ شاہ عالم کے نام سے ہوگا۔ بادشاہ کو اختیار ہے ایک دیوانی کا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے افسر کلکٹر کے دفتر میں رکھیں جن کا کام یہ ہوگا جانچ پڑتال کریں اور بذریعہ رپورٹ بادشاہ کو اس امر کا اطمینان دلاتے رہیں کہ وصول شدہ رقوم مالیات اور وصول مالگذاری میں جو خرچہ ہو رہا ہے اس کا کوئی حصہ خرد برد نہیں کیا جارہا ہے دو عدالتیں دیوانی اور فوجداری کی اسلامی قانون کے مطابق دہلی شہر اور اس اراضی کے باشندوں کے لئے جو بادشاہ کے نام منتقل کر دی گئی تھی قایم ہونی

[1] مقدمہ راجہ رام موہن رائے صفحہ ۹۳ (مصنف)

چاہیئں اور فوجداری عدالتوں کے سزائے موت کے حکم کی تعمیل اس وقت تک نہیں کی جائیگی جب تک کہ بادشاہ سے منظوری نہ لے لی جائے اور اس کے سامنے اس قسم کے مقدمات کی روئیداد بھی پیش کی جائے گی۔ کسی عضو کے کاٹنے کا حکم نہ دیا جائے گا۔[۱]

ڈاکٹر مجمدار لکھتے ہیں کہ

بادشاہ اور ان کے خاندان کی فوری ضرورت پوری کرنے کے لئے نوّے ہزار روپیہ کا مشاہرہ منظور کیا گیا۔ اگر منتقلہ آراضی کی آمدنی اجازت دے تو یہ رقم ایک لاکھ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا رقم کے علاوہ دس ہزار روپیہ سالانہ ہندو مسلمانوں کے خاص تہواروں کے موقعہ پر قدیم رواج کے مطابق دے جائیں گے

مغلیہ حکومت کا آخری دور

سر جے ڈبلو کہتا ہے کہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر قیام سلطنت (مغلیہ) کی تجویز لارڈ ولزلی جارج بارلو اور مسٹر ریڈ جانسٹن جیسے قابل اور تجربہ کاروں کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔"

ڈاکٹر مجمدار لکھتے ہیں

یہ اسکیم تھی جس سے شاہ عالم کی حیثیت ایک پنشن خوار کٹھ پتلی سے گو کچھ بڑھ جاتی تھی مگر اس کے ساتھ اس کے پاس کچھ اختیارات شاہی نہ تھے وہ بادشاہ تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہ تھا۔[۲]

---

[۱] مقدمہ راجہ رام موہن رائے مصنف صفحہ ۹۲ [۲] مصنف مذکور صفحہ ۹۳

غرضکہ شاہ عالم مدبران برطانیہ کے ایک معزز آلہ کار بنے ہوئے تھے اب "یہ قید ایسی نہ تھی کہ اس سے جیتے جی چھوٹنا نصیب ہوتا۔"

وفات | چنانچہ نومبر ۱۸۰۶ء، ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ کو اس بادشاہ نے حکومت مغلیہ کا بیڑا غرق کر کے دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا۔ قطب صاحب میں بہادر شاہ اوّل کے قبر کے برابر دفن کئے گئے۔

ان کی حکومت کی کل مدت ۴۸ سال ہے جس میں سے بارہ برس بہادر الہ آباد میں اور ۱۷ برس بینائی کے ساتھ اور ۱۹ برس آنکھیں کھو کر دلی میں گذارے[2]۔

ولی عہد اوّل

جہاں دار شاہ۔ شاہ عالم کے بڑے صاحبزادہ اصلی نام مرزا جواں بخت تھا ۱۱۶۲ھ میں نواب تاج محل کے بطن سے پیدا ہوئے جو مکرم الدولہ سید علی اکبر خاں بہادر مستقیم جنگ کی حقیقی بہن تھیں[3]۔

مولوی نظام الدین دہلوی سے تعلیم پائی شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا اردو فارسی میں کہتے اور جہاں دار تخلص کرتے تھے۔ جہاں دار شاہ سخی، خلیق، با مروت، شوخ طبع اور رنگین مزاج تھے جرأت اور ہمت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن شکار گاہ میں ہاتھی بگڑ گیا چاہا سونڈ سے پکڑ کر وار کرے انھوں نے اتنی مہلت نہ دی اور تلوار کے ایک ہی وار میں کام تمام کر دیا۔

۱۱۷۵ھ میں احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کے پیچھے انھیں نائب سلطنت بنا کر

---

[1] مقدمہ نادرات شاہی از مولانا امتیاز علی خاں عرشی صفحہ ۳۲ [2] وقائع عالم شاہی

نجیب الدولہ کی سرپرستی میں دے دیا تھا دس بارہ برس تک نہایت حسن و خوبی سے کاروبار سلطنت انجام دیتے رہے ۱۱۸۵ھ میں شاہ عالم دلی واپس آئے تو یہ ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے زندگی گذارنے لگے۔ مرہٹوں کے پنجے سے باپ کو چھڑانا چاہا مگر افراسیاب امیر الامراء کے ڈر سے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۸ھ کو رات کو محل سے نکل کر رام پور گئے پھر لکھنؤ آصف الدولہ کے پاس آ گئے اس نے آداب اور خدمت گذاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی آخر میں دلوں میں کدورت پیدا ہوئی جہاں دار شاہ بنارس چلے گئے وارن ہسٹنگز نے آصف الدولہ سے ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار نذرانہ مقرر کرا دیا تھا اسی میں گذر بسر کرتے تھے۔ مرزا محمد علاؤ الدین بہادر معروف مرزا بابا کی صاحبزادی جینا بیگم سے عقد کیا۔ ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ میں انتقال ہوا مرزا بابا شاہ عالم کے چچازاد بھائی تھے اور بہنوئی بھی تھے جینا بیگم کے بطن سے مرزا مظفر بخت تھے جو بنارس ہی رہے شاہ عالم کے دوسرے صاحبزادہ اکبر شاہ ثانی تین صاحبزادیاں تھیں۔

شاعری اور شاہ عالم شاہ عالم کو گو تمام عمر مصائب کا سامنا رہا مگر طبعی رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا فارسی اردو میں شعر کہتے آفتاب تخلص تھا بھاشا میں شاہ عالم تخلص کرتے تھے فارسی کلام کی اصلاح مرزا محمد فاخر مکیں سے لی اردو میں مشورہ مولوی نور احمد ممتاز سے کیا

شاہ عالم کے عہد میں شاعری کی ترقی گو سلطنت مغلیہ مٹ رہی تھی پر "اردو زبان سنورتی جاتی تھی "اردو کے جتنے بڑے بڑے استاد ہیں وہ اس زمانہ میں پھلے پھولے"[1]

کلیم، میر، سودا، مصحفی گو جب شاہ عالم دلی آئے یہ لوگ جا چکے تھے۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق شاگرد میر درد۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ شاہ ہدایت۔ میاں شکیبا

---

[1] واقعات اظفری دیباچہ نادرات شاہی صفحہ ۵۳)

مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا۔ میر قمر الدین منت شیخ ولی اللہ محب سے حضرات کا دور دورہ تھا۔ "پورفعت شاعری کے علاوہ شاہی دربار میں خاندانی اعزاز بھی رکھتے تھے۔"

یہی زمانہ تھا سید انشاء اللہ خاں دلی آئے دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ سے مناسبت رکھتا تھا جس کے سجادہ نشین شاہ عالم خود تھے۔ حضرت نے شاعرانہ قدردانی کے لحاظ سے اس نوجوان پر خلعت وعزت کے ساتھ شفقت کا دامن ڈالا اور سید انشاء اہل دربار میں داخل ہوئے اپنے اشعار کے ساتھ لطائف و ظرائف سے کہ ایک چمن زعفران تھا، گل افشانی کر کے محفل کو لٹا دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ دلی سے چلتے ہوئے[1]

آزاد دہلوی نے لکھا ہے کہ شاہ عالم بڑے مشاق شاعر تھے[2]

مولانا عرشی رام پوری لکھتے ہیں کہ۔

ان کے شعروں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں پیچدار خیالات مشکل فقرے یا لفظ اور دور از کار تشبیہیں نہیں ملتیں۔ اُن کی شاعری جذبات کی شاعری ہے جو کچھ دل پر گذرتی ہے خوشی ہو یا رنج آرام ہو یا تکلیف اسے سادہ طریقے سے بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شان و شکوہ کم مگر اثر زیادہ ہے۔ طرز ادا کی سادگی اردو فارسی، ہندی تینوں زبانوں کے اشعار میں یکساں پائی جاتی ہے اور یہی حال اُن کے خیالات کی صفائی کا ہے" رہ گئی زبان تو وہ قلعہ معلی کے ممتاز رکن تھے ان سے زیادہ ستھری اور پاک صاف اُردو کون لکھ سکتا تھا" جو سند کا درجہ رکھتی ہے"[3]

تصانیف مغل بادشاہوں اور شاہزادوں کو تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ بابر اعظم

---

[1] دیباچہ نادرات شاہی صفحہ ۳۹ - الہ [2] آب حیات ۲۶۳ [3] ایضاً

مرزا کامران جہانگیر۔ داراشکوہ عالمگیر ثانی جن کی دو کتابیں مجموعہ روزگار منتخب عزیزی یادگار سے ہیں شاہ عالم کی تصانیف دیوان فارسی ۔ دیوان اردو۔ منظوم اقدس (مثنوی) قصہ شاہ شجاع الشمس (قاسم نے لکھا ہے کہ یہ نثر ریختہ میں تھا مولوی ذکاء اللہ کی رائے یہ ہے اس کی عبارت چار درویش سی نہیں ہے۔ نادرات شاہی۔ اردو فارسی، ہندی پنجابی شعروں کا مجموعہ ہے" مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری نے معہ دیباچہ کے اس کتاب کو مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے۔

علمائے عہد اور شاہ عالم | شاہ عالم کے زمانہ میں علماء اور مشائخ مسلمانوں کی زبوں حالت کی اصلاح میں لگے ہوئے تھے شاہ فخر الدین بادشاہ کو اس کی اصلاح کے لیے ارشاد کرتے ہیں چنانچہ مناقب فخریہ میں ہے

سلطان عصر (شاہ عالم) تابذات خود بہ امور ملک ستانی و ملک داری متوجہ نشود و اختیار محنت و مشقت نہ کند ہند نسبت بہ ہیچ وجہ صورت نگیرد

حکومت امیروں کے سپرد کرنے کے خطرناک نتائج سے شاہ صاحب بادشاہ کو آگاہ فرماتے ہیں۔

اگر مامور و مختار و نائب سلطنت نماید امرائے دیگر ناخوش می شوند و سر بہ طاعت او نمی نہند و بے خبری بردگی با سلطان می گردد و رعب سلطان ہر کہ و مہ نمی ماند و فوج پادشاہی کہ محتاج بہ آں امیر شد او را می شناسد و سر رشتہ تعلق شان از سلطان منقطع می گردد و در دماغ امر ہوائے انا ولا غیری می پیچد دگاہ باشد کہ بر سر می آرد و در سلف اکثر ہمچنیں شدہ است[1]۔

---

[1] صفحہ ۳۵ و ۳۶ (باقی آئندہ)

ادبیات

منزل

(جناب روشن صدیقی)

وہ تاریخی نظم جو بنارس کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں پڑھی گئی یہ مشاعرہ آنریبل حافظ محمد ابراہیم کی صدارت میں ۲۶ر فروری ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوا تھا اس مشاعرے میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے بھی چند مشاہیر شعرا نے شرکت کی تھی نظم اپنے تاثر کے لحاظ سے علمی، ادبی حلقوں میں بیحد پسند کی گئی۔

خود فراموش تجھے امکانِ خبر ہے کہ نہیں
جادہ پیما کوئی مقصودِ سفر ہے کہ نہیں
آخر اس شامِ تحیر کی سحر ہے کہ نہیں
کسی فردا کا ترے دل میں گذر ہے کہ نہیں

لے گئی تجھ کو پریشانیٔ افکار کہاں
ہوگئی سرد تری آتشِ کردار کہاں

حق پرستی تری جرأت کی قسم کھاتی تھی
مصلحت آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی تھی
تیری کشتی سرِ گرداب اگر آتی تھی
نبض، امواجِ تلاطم کی لرز جاتی تھی

آج سیلاب حوادث تجھے ٹھکراتا ہے
اور تو صورتِ خاشاک بہا جاتا ہے

تو نے فرمانِ تغیر کو حکایت سمجھا
فکرِ تعمیر کو ہنگامۂ فرصت سمجھا
تو نے اک گوشۂ محدود کو جنت سمجھا
آہ سمجھا بھی تو کیا رازِ سیاست سمجھا

منصب ہمّت عالی نہ رہا یاد تجھے
تیری محدود نظر کرگئی برباد تجھے

زندگی صرف متاعِ سر و ساماں تو نہیں — آرزو خواب سہی خوابِ پریشاں تو نہیں
دردِ ہستی کا تقاضا غمِ درماں تو نہیں — منزلِ راہِ طلب اس قدر آساں تو نہیں

سخت دشوار مراحل سے گذرنا ہے تجھے
اسی طوفانِ حوادث سے اُبھرنا ہے تجھے

ارتقا کیا ہے؟ تغیر کی پذیرائی ہے — عزمِ انساں کی یہ سب انجمن آرائی ہے
زندگی کے کسی گوشے میں جو رعنائی ہے — کیا یہ خود ہی کسی گردوں سے اُتر آئی ہے

رفعتِ فکر نہ پروازِ نظر سے پیدا
حسن ہوتا ہے ترے خونِ جگر سے پیدا

تیری منزل ترے دل میں ہے ستاروں میں نہیں — رنگ و بو تیرے لہو میں ہے بہاروں میں نہیں
تیرے دامن میں یہ شعلے ہیں شراروں میں نہیں — زندگی کیا انھیں مبہم سے اشاروں میں نہیں

تو ہی خود اپنی روایاتِ کہن بھول گیا
بوئے گل یاد رہی خاکِ چمن بھول گیا

خیر جو کچھ بھی ہوا وقت ابھی باقی ہے — تجھ میں اک جرأتِ آزاد جو تھی باقی ہے
نکہتِ شوق کی دیوانہ گری باقی ہے — زندگی کا وہی حسنِ ابدی باقی ہے

اُٹھ جگاتی ہے وہی صبحِ بہاراں تجھ کو
یاد کرتا ہے ابھی تیرا گلستاں تجھ کو

برہان

جلد بست وسوم — شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۴۹ء مطابق جمادی الثانیہ ۱۳۶۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل کو لکھنؤ میں جمعیۃ علماء ہند کا سولہواں سالانہ اجلاس ہو رہا ہے۔ مختلف اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم پرور مسلمانوں کے اس سب سے بڑے آرگنائزیشن کا یہ مذہبی اور تمدنی اجتماع اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم بھی ہوگا اور شاندار بھی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے ملک میں جس قسم کی ہوائیں چلیں اور فرقہ پرستی کے زہر نے جس تیزی سے اہل ملک کے دل و دماغ کو متاثر کیا اُس سے قدرتی طور پر تمام حالات کا نقشہ بدل گیا۔ جمعیۃ علماء نے بھی جس کی اصابتِ رائے اور پختگیِ فکر و عمل مسلمات کا درجہ رکھتی ہے پوری احتیاط سے ان بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیا اور گزشتہ اپریل کے اجلاسِ بمبئی میں سیاسیات سے کنارہ کشی کا غیر مبہم اعلان کر دیا، حالانکہ جہاں تک اس موقر جماعت کی تاریخ اور روایات کا تعلق تھا اس کی سیاست کے بنیادی عناصر پر کبھی اور کسی وقت بھی فرقہ پرستی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی۔ اس کے بزرگوں نے استخلاصِ وطن کی مہم سر کرنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں جو راہ اختیار کی تھی، نہ ختم ہونیوالی صعوبتوں اور ہمت توڑ دینے والے حالات کے باوجود یہ جماعت سرِمو اس سے منحرف نہیں ہوئی۔ اس کے صدر محترم نے اب سے گیارہ سال پہلے اسی دہلی سے ڈنکے کی چوٹ یہ ہنگامہ خیز اعلان کیا تھا "موجودہ زمانہ میں قومیں مذہب سے نہیں وطن سے بنتی ہیں"

پھر یہی جماعت تھی جس نے اپنے ہم مذہبوں کی بھاری اکثریت کی یورشوں اور جارحانہ حملوں

کے بالمقابل سینہ سپر ہو کر آخری لمحوں تک ملک کی تقسیم کی مخالفت کی یہاں تک کہ کانگریس نے حالات سے مجبور ہو کر تقسیم ہند کا فارمولا قبول کیا تو قوم پروری اور قومیتِ متحدہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی یہ جماعت اُس نازک وقت میں بھی نہایت استقلال سے اپنے مسلک پر جمی رہی۔

لیکن اس عظیم الشان تاریخ کے باوجود اس کے اربابِ کار نے زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور محسوس کیا کہ جس جماعت کے دروازے صرف کسی ایک مذہب کے فرقے کے لیے کھلے ہوئے ہوں اور دوسرے مذہب کے لوگ اس میں باقاعدہ شامل نہ ہو سکیں اُس جماعت کا پارلیمنٹری سیاست میں حصہ لینا فرقہ پرستی کو جنم دینے کے ہم معنی ہو سکتا ہے، چنانچہ اجلاسِ بمبئی کے بعد جمعیۃ کا دائرۂ عمل مسلمانوں کی مذہبی تعلیمی اور تمدنی سرگرمیوں میں محدود ہو گیا، تاہم ملک میں جو ہوائیں چل چکی تھیں اُن کا اثر یہ ہوا کہ ابنائے وطن کا ایک طبقہ جمعیۃ علماء کی پچھلی پوری شاندار تاریخ فراموش کر بیٹھا اور اُسے جمعیۃ کی تنظیم میں مسلم لیگ کے جراثیم نظر آنے لگے۔

لکھنؤ میں اس اجتماع کا مطلب یہ ہے کہ "انڈین یونین" کے سب سے بڑے صوبے کے دار السلطنت سے جمعیۃ کی یہ آواز ملک کے کونے کونے تک پہنچ جائے اور غلط فہمیوں اور غلط اندیشیوں کے تمام پردے چاک ہو جائیں۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ اس موقع پر کم سے کم دو چیزیں ضرور صاف ہو جائینگی۔

ملہ مذہبی اور تمدنی حدود کی کسی حد تک نشاں دہی، یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر مذہب کو ایک بہت ہی محدود اور مخصوص معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے اور عام ذہنوں کا رجحان یہی ہے کہ مذہب انسان کا ایک ذاتی معاملہ ہے جس کو اجتماعی زندگی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، فی الحقیقت یہی تخیل تمام غلط فہمیوں کا سرچشمہ ہے، جو افراد اور فرقے مذہب اسلام کی جامعیت و خصوصیت سے واقف نہیں ہیں اُن کو اس مذہب کا ہر شعبہ سیاست کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے اور وہ نادانستہ طور پر ایک باطل نظریہ قائم کر لیتے ہیں، وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے۔ ملہ مسلمانوں کی اقتصادی مشکلوں کا حل۔ جہاں تک مسلمانوں کی اقتصادی

اسی طرح اس غلط فہمی کا تعلق ہے کہ جمعیت کا مسلک انڈین یونین کا صحیح ہے

الحمدللہ کہ ندوۃ المصنفین کے اجڑے اور بکھرے ہوئے کاموں کے سرے پھر سے جڑنے شروع ہوگئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گردشِ ایام کی لپیٹ میں آئے ہوئے اس مرکزِ تالیفی سے ابھی قدرت کو کچھ اور خدمت لینی ہے۔

قدیم مطبوعات کے جدید ایڈیشن بھی نکل رہے ہیں اور جدید تالیفات کی ترتیب طباعت کا کام بھی خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔ غلامانِ اسلام، قصص القرآن سوم، قرآن اور تصوف، سرمایہ اور لغات القرآن جلد اول کے نئے ایڈیشن تیار ہو چکے ہیں، اخلاق اور فلسفۂ اخلاق اور قصص القرآن چہارم زیر طبع ہیں نئی کتابوں میں ادارے کی مہتم بالشان کتاب ترجمان السنۃ جلد ثانی کے بڑے حصہ کی کتابت ہو چکی ہے اور امید ہے ان شاء اللہ اس جلد میں کم سے کم پانچ سو حدیثیں مع ترجمہ اور تشریحی نوٹوں اور ضروری بحثوں کے سما جائیںگی، جن اصحاب کو ترجمان السنۃ جلد اول کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ جلد ثانی کی خصوصیتوں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں، دوسری اہم اور مفید کتاب لغات القرآن جلد چہارم کی ترتیب کا کام بھی اب قابلِ اطمینان طریقے پر ہو رہا ہے اور یقین ہے یہ جلد سال رواں کے کسی حصہ میں تیار ہو کر پریس سے آجائیگی سلسلۂ تاریخ ملت کی تسوید برسوں سے چھوٹی ہوئی تھی، شکر ہے کہ اب یہ کام بھی تیزی سے ہو رہا ہے۔ تاریخ ملت حصہ چہارم (خلافت ہسپانیہ) زیر طبع ہے اور باقی حصص زیر ترتیب ہیں امید ہے اس سال اس مفید سلسلے کے کئی حصے قدردانوں کے ہاتھوں میں آجائینگے۔

ادارے کے کاموں کو مالی امداد دینے کے لیے "مکتبہ برہان" کے نام سے جو کتب خانہ قائم کیا گیا تھا ہمہ قسم کے تلخ و ترش حالات کے باوجود یہ مکتبہ بھی اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہے۔ مکتبہ کی طرف سے $\frac{22\times29}{8}$ تقطیع پر ایک شاندار مترجم قرآن مجید شائع ہوا ہے اس کے متن کا قلم نہایت روشن اور ترجمہ حضرت مولانا تھانوی کا ہے۔ دوسرا قرآن مجید $\frac{20\times26}{8}$ سائز پر بلا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کا قلم بھی بہت صاف ہے اور ہر صفحہ پر آیت ختم ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے قرآن کریم کا یہ نسخہ بہت مفید سمجھا جا رہا ہے۔ ۴

۴ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی مشہور آفاق کتاب "اشاعتِ اسلام" کئی سال سے مکتبہ کے پچھلے آرڈر میں شامل تھی الحمدللہ کہ اب یہ بھی پریس سے بہت جلد آنے والی ہے۔

تدوین حدیث

تدوین حدیث کا ماحول

(۴)

از حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات
(جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

اسی طرح علم حدیث اور اسماء الرجال سے جو اشتغال رکھتے ہیں وہ صحابیوں کے متعلق بھی جانتے ہیں کہ تابعین میں فلاں فلاں صحابی سے زیادہ خصوصیت تھی اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے اساتذہ اور تلامذہ کے خصوصی تعلقات کا عام علم فن کے جاننے والوں کو پہلے ہی سے ہوتا ہے، پس اسماء تو یونہی یاد رہتے ہیں، حافظ کو ہر حدیث کے متعلق اتنا کام پڑتا ہے کہ ان ناموں میں سے کس نام کا کس حدیث کی سند سے تعلق ہے پس اس کو مستحضر رکھنا چاہئے سچ پوچھئے تو اس کی وجہ سے ناموں کے یاد کرنے میں بھی حافظہ کا کام آدھا رہ جاتا ہے اسی طرح متون حدیث کا حال ہے کہ اصل حدیث تو ایک ہی ہے دوسرے طرق پر لفظ دو لفظ کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی اضافہ کی وجہ سے حدیث کے نمبروں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی حافظہ پر جو کچھ بار پڑتا ہے وہ لفظ دو لفظ ہی کے یاد کرنے کا پڑتا ہے۔ بہرحال اکثر ابواب

کی حدیثوں کا یہی حال ہے کہ سند یا متن میں لفظ دو لفظ کو بدلتے چلے جائیے حدیثوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی مسئلہ کے متعلق ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ابن راہویہ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، بیان یہ کیا ہے کہ مشہور امام فن علل ابو حاتم رازی کی مجلس میں ابن راہویہ اور ان کی غیر معمولی قوت یادداشت کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب جن کا نام احمد بن سلمہ تھا، انھوں نے ابو حاتم سے کہا کہ ابن راہویہ صرف عام ابواب ہی کی حدیثیں نہیں بلکہ تفسیری روایتیں بھی شاگردوں کو زبانی بغیر کتاب سامنے رکھنے کے لکھوایا کرتے ہیں ابو حاتم جو فن کے گر سے واقف تھے۔ احمد سے یہ سن کر سنبھل گئے اور تعجب کے ساتھ کہنے لگے کہ

هذا اعجب لان ضبط الاحادیث المسندة اسهل واهون من ضبط اسانید التفاسیر والفاظها	(تفسیری روایات کا زبانی لکھوانا) بلاشبہ بہت زیادہ عجیب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی حدیثوں کا یاد رکھنا تفسیری روایتوں کی سندوں اور ان کے الفاظ کے یاد کرنے کے حساب سے بہت زیادہ آسان اور سہل ہے۔
ج ۲ ص ۴۱۳	

سمجھا آپ نے ابو حاتم کیا کہہ رہے ہیں قصہ یہ ہے کہ تفسیری روایات کے ذخیرے میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کا سرمایہ بہت کم پایا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر وہ صحابہ اور صحابہ سے بھی زیادہ بہت زیادہ ان لوگوں کے اقوال اس ذخیرے میں شریک ہیں جو صحابہ کے بعد تھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے زیادہ روایت کرنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے زیادہ تر روایتیں عموماً کثیر بین صحابہ (ابوہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم) حضرات سے مروی ہیں اکثر حدیثوں کے لئے صحابہ کے طبقہ میں ان چند ناموں کا یاد کر لینا کافی ہے پھر ان بزرگوں کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ یعنی حدیث کی آخری کڑیوں میں زیادہ تر یہی لوگ ہیں جو اپنے استاذوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے لحاظ سے مشہور ہیں، حدیث کا ابتدائی طالب العلم ان محدود شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے، گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہزار ہا ہزار حدیثوں کی سندوں کے لئے چند محدود اسماء جن کی تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ ہوگی ان کو یاد رکھنا ان ساری سندوں کے رجال کا یاد رکھنا ہے اور متون میں بھی اختلاف زیادہ تر لفظ دو لفظ ہی کے حساب سے ہوتا ہے مگر تفسیری روایات کی سندیں بھی لامحدود اور ان کے متون کے الفاظ بھی زیادہ تر ایک دوسرے سے کم ملتے جلتے ہیں، اسی لئے تفسیری روایتوں کے یاد رکھنے اور زبانی بیان کرنے پر ابو حاتم کو تعجب ہوا، اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حدیثوں کی عددی کثرت کو دیکھ کر گھبرانے اور بدکنے کی ضرورت نہیں ان کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ان مہیب اور مدہش اعداد و شمار کو سن کر بہ ظاہر فن کے نہ جاننے والے باور کیے بیٹھے ہیں، آدمی کی قوت یادداشت اس قسم کے مؤثرات سے شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر امداد حاصل کرتی رہتی ہے۔

بات بہت طویل ہو گئی، حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو سال وقفہ کی جو درمیانی مدت ہے اس میں اگر حدیثوں کے قلم بند کرنے کا جیسا کہ عام طور

پر پھیلا دیا گیا ہے رواج نہ بھی ہوا ہو، اور یاد کرنے والوں کی یاد ہی پر اس زمانے میں حدیثوں کے محفوظ رکھنے کا دار و مدار رہا ہو تو واقعات اور حالات سے جو واقف ہیں ان کے نزدیک ہلکی سے ہلکی بے اعتمادی کی وجہ محض یہ واقعہ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ سچی اور ٹھوس بات یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ، معلومات کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ جیسے لکھ کر معلومات کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یاد کر کے بھی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے قرآن ہی موجود ہے، مکتوبہ قرآن میں یا قرآن کی کسی آیت یا سورۃ کو پڑھئے یا کسی حافظ سے اسی آیت یا سورۃ کو سنئے کیا دونوں کے اعتماد میں کسی قسم کا فرق آپ پا سکتے ہیں؟

پس مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان میں کون معلومات کے محفوظ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور کون نہیں بن سکتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ و یادداشت دونوں میں سے جس کسی سے بھی کام لیا جائے، کام لینے والے پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کی جیسا کہ چاہئے اگر تکمیل کی گئی ہے اور حزم و احتیاط کے لحاظ سے جن باتوں کی نگرانی کی ضرورت ہے ان سے لاپرواہی نہیں اختیار کی گئی ہے تو ان میں جس ذریعہ سے بھی کام لیا جائے گا قدرتاً انسانی فطرت اس ذریعہ سے محفوظ کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر اعتماد کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے خواہ یہ کتابت کا ذریعہ ہو یا یاد کرنے کا طریقہ لیکن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اگر غفلت اور لاپرواہی برتی گئی ہو تو خود بخود اعتماد کی ضمانت مشتبہ ہو جاتی ہے خواہ لکھنے سے کام لیا گیا ہو یا یاد کرنے سے، جو واقعہ ہے وہ بھی اور صرف یہی ہے نہ سوچنے والوں نے

یہ شور برپا کر رکھا ہے کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار جو کئی سو سال بعد قلم بند ہوئیں۔ اس علمیاتی نوعیت کی جو غلطیاں ہیں ان کو تو جانے دیجئے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انھوں نے یہ کیسے باور کر لیا ہے کہ قید کتابت میں آ جانے کے بعد اشتباہات و شکوک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟ کیسی عجیب بات ہے ایک طرف اس کا ہنگامہ مچایا جاتا ہے کہ عالم معنی میں مظالم کے جو پہاڑ کاتبوں کے ہاتھوں سے ٹوٹے ہیں عالم صورت پر یہ ظلم چنگیز خاں کے ہاتھوں بھی نہ ہوا تھا عصر حاضر میں طباعت اور ٹائپ اور ٹائپ کی بھی بوقلموں اقسام کے باوجود معمولی سی بے احتیاطیاں عبارتوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں منفی کی جگہ مثبت اور مثبت کی جگہ منفی بن جانا معمولی بات ہے روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے[1]۔ ہندوستان کا مشہور مطبع نولکشور تقریباً ایک صدی سے اس کی شہادتیں فراہم کر رہا ہے اور ذہن کیجئے کہ بے چارہ کاتب کتابت کی ذمہ داریوں کو نباہ بھی لے گیا ہو لیکن اس کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں ٹھوکر دل سے کیا بالکلیہ محفوظ ہو جاتی ہیں، بیسیوں لطائف اس سلسلہ کے عوام میں مشہور ہیں[2]۔ اور ان لطائف کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا کہ آیا

---

[1] اس مشاہدے کا جسے شوق ہو، ہمارے زمانے کے مشہور اخبار صدق لکھنؤ کا مطالعہ کر سکتا ہے ورق ورق اور صفحہ صفحہ میں کتابت کے اعاجیب اس کے سامنے آتے چلے جائیں گے صدق کے کاتب کو اس کا کمال سوجھتا گیا ہے کہ آسمان کو بیک گردش قلم جب جی چاہے زمین بنا سکتے ہیں اور زمین کو چند شوشوں کے ایر پھیر سے آسمان کا قالب عطا کر سکتے ہیں۔ [2] کہتے ہیں کہ "لمولفہ" کو پڑھنے والوں نے لمولفہ پڑھا۔ اور جب حوالہ کی ضرورت پیش آئی فرماتے کہ "لمولفہ" کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے نسخ منسوخہ دانہ الانجبی شربت بنفشہ دانہ الائچی کے نسخے کے پڑھنے والے اسی ہندوستان میں پائے گئے ہیں خود اس فقیر کے ایک مرحوم دوست انجمن ترقی اردو کے مشہور رسالے "اردو" کو پڑھتے تھے۔ خاکسار ذرا دور کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا دہی حضرت یکایک مجھے مخاطب بناتے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

تراشیدہ اور خود آفریدہ ہیں یا واقعی پڑھنے والوں نے وہی پڑھا تھا جو مشہور ہوگیا
لیکن خود "تدوین حدیث" کی تاریخ ہی میں جن لطائف کا ذکر مسلسل سند کے ساتھ مح
نے کیا ہے وہی کیا کم تعجب انگیز ہیں اصل فہرست تو ان لطائف کی بہت طویل ہے
بطور دلچسپی اور عبرت کے لئے چند نمونے نقل کئے جاتے ہیں حاکم نے اپنی کتاب
علوم الحدیث میں نقل کیا ہے کہ علی نامی کسی صاحب کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ "علی
یعنی علی کم عقل آدمی تھے پڑھنے والے صاحب نے پڑھا کہ (علی رجل عنین) یعنی
نامرد آدمی تھے) حاکم نے حافظ ابو زرعہ کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک شخ
جس نے استادوں سے حدیث پڑھی نہ تھی کتاب کھول کر حدیث پڑھانے بیٹھ گ
مشہور حدیث آئی یعنی حضرت انس رضؓ کے بھائی جن کا نام ابو عمیر تھا، بچے تھے۔ آنح
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور طیبت خوش مزاجی) کے فرمایا تھا یا اباعمیر ما
النغیر (ابو عمیر نغیر کیسا ہوا) نغیر ایک چڑیا کا نام ہے جسے ابو عمیر ہاتھ میں لیے ہو

(بسلسلۂ صفحہ گذشتہ) ہوئے فرماتے ہیں کہ مولانا یہ "نثر" کا لفظ کس زبان کا ہے اس کے معنی کیا ہ
میں بھی چکرایا۔ قریب آیا، لفظ کو دیکھا نظم کے بعد نثر کا لفظ لکھا ہوا تھا ہمارے مرحوم دوست اس
"نرثہ" پڑھ رہے تھے اس وقت ان کی عمر ساٹھ سے کم نہ تھی اور صبح و شام پڑھنے کے سوا کوئی
مشغلہ نہ تھا ۱۲ کہتے ہیں کہ "بلبل" کو "نغیر" کہتے تھے یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے، آنحضرت ص
اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے مسائل اور احکام کے پیدا کرنے میں علماء اسلام نے جو کوششیں کی ہ
کی ایک مثال یہ روایت بھی ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ ایک بچے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ا
فرمائے تھے الکتانی نے لکھا ہے کہ ابو العباس بن القاص نے صرف اس حدیث سے سو مسئلے پید
کئے۔ اسی طرح ابن صباغ نامی ایک مراکشی عالم کے متعلق لکھا ہے کہ چار سو فوائد اس حدیث
سے انھوں نے پیدا کئے (دیکھئے الکتانی صفحہ ۱۵۱ اور نفح الطیب ج ۴ ترجمہ ابن صباغ ۱۲

ے، غالباً اُڑ گئی یا مر گئی تھی، حضور نے ان کے ہاتھ میں چڑیا کو نہ دیکھا تو یہ فرمایا حدیث
پڑھانے والے صاحب ان تفصیلات سے ناواقف تھے اور "نغیر" کا لفظ بھی کچھ غیر
مشہور ہے اس لئے آپ نے بجائے نغیر کے یہ قرار دیا کہ یہ لفظ "بعیر" کا ہے اور
شاگردوں کو مطلب یہ سمجھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو عمیر سے پوچھ رہے
کہ اونٹ کیا ہوا ان ہی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ دوسری حدیث جس میں ہے
لا تصحب الملائکۃ رفقۃ فیہا جرس جس کا مطلب یہ تھا کہ اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں
باندھنے کی جو عادت عرب میں تھی اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ ملائکہ کی
پسندیدگی سے وہ قافلہ محروم رہ جاتا ہے جس کے جانوروں کے گلے میں گھنٹی (جرس)
محدث صاحب نے "جرس" کو "خرس" پڑھا اور فرمایا کہ دیکھو جو لوگ قافلہ کے
چوکیداروں کو مطلع کیا گیا ہے کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے محروم ہو جاتے ہیں
جس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "البزاق" یعنی تھوک کو مسجد
کی دیوار پر دیکھا، محدث صاحب نے فرمایا کہ "البراق" کو دیکھا اور سب سے زیادہ
عجیب لطیفہ الحاکم نے اس سلسلہ میں مشہور محدث ابن خزیمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ اثر جو کتابوں میں منقول ہے کہ
من ماء فی جر نصرانیۃ (یعنی حضرت عمر نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے کے پانی سے
وضو کیا) پڑھنے والے صاحب نے جر کے لفظ کو حر پڑھا۔ اب کیا بتاؤں کہ انھوں نے
پڑھا، لغت میں دیکھ لیجئے کہ حر کے کیا معنی ہیں[1]؟ دیکھا آپ نے بات کہاں سے
کہاں پہنچی، یہ ہے حال اس کتابت کا جس کے متعلق لوگوں نے غلط توقعات قائم کر لیئے ہیں

---

[1] عورت کی شرمگاہ ۱۲

لطف تو اس وقت آتا ہے جب پڑھنے والے اپنی غلط بینی یا غلط فہمی کی تصحیح و توجیہ شروع کر دیتے ہیں ایک صاحب جن کا نام محمد بن علی المذکر تھا، غالباً وعظ گوئی کا پیشہ کرتے تھے ایک حدیث پڑھی۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم زرعنا تزداد حنّاً"

لوگ حیران ہو گئے کہ مطلب کیا ہوا؟ الحاکم نے لکھا ہے کہ تب محدث صاحب "قص قصتہ طویلتہ" یعنی ایک طویل قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ کسی علاقہ کے لوگ اپنی زرعی پیداواروں کا عشر اور صدقہ ادا نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرتے ہوئے پہنچے کہ ہم لوگوں نے کھیتی کی لیکن سب کی سب "حنا" یعنی مہندی کا درخت بن گئی۔ اسی قول کو رسول اللہ نے گویا نقل کیا۔

سیوطی نے تدریب[۱] میں لکھا ہے کہ یہ دراصل مشہور حدیث

زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا ناغہ کر کر کے ملاقات کیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے۔

کی خرابی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی غلطیاں ان ہی لوگوں سے صادر ہوئی ہیں یا آئندہ صادر ہو سکتی ہیں جن کے متعلق حضرت عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے کہ

لم یکن الحدیث بیشتهم ص۱۴۹ حدیث کا فن ان کا پیشہ نہ تھا۔

معرفۃ علوم الحدیث للحاکم

لیکن بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو فن کے ساتھ خاص تعلق

---

[۱] تدریب ص۱۹۶

رکھتے تھے، مثلاً مصر کے قاضی ابن لہیعہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مشہور حدیث احتجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹائی وغیرہ سے مسجد میں ایک جگہ گھیر لی تھی۔ ابن لہیعہ نے بجائے احتجر کے اس کو "احتجم" پڑھا یعنی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا، ابن صلاح نے لکھا ہے کہ اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ

اخذہ من کتاب بغیر سماع　　　　ابن لہیعہ نے (استاذ سے سنے بغیر اس حدیث کو کتاب میں دیکھ کر) روایت کرنا شروع کیا تھا،

صفحہ ۱۱۴ مقدمہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث مکتوبہ شکل میں ابن لہیعہ کے سامنے پیش ہوئی لیکن زبانی استاد سے حدیث کے الفاظ ابن لہیعہ نے چونکہ نہیں سنے تھے اس لیے کتاب ان کو غلطی سے نہ بچا سکی اور اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں محدثین نے جمع کی ہیں بعض لوگوں نے اسی قسم کی غلطیوں کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں امام مسلم کی کتاب التمیز اور دار قطنی وابو احمد عسکری کی کتابوں کا لوگوں نے خاص طور پر تذکرہ کیا ہے، ایک پرلطف قصہ اسی سلسلہ کا یہ بھی ہے ایک محدث صاحب نے عام مجمع میں حدیث بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذین یشققون الحطب دراصل الحطب جس کے معنی لکڑی ہیں اس کی جگہ حدیث میں الخطب کا لفظ تھا درحقیقت تقریر اور وعظ میں لفاظی سے کام لینے والوں کو خدا کی نگاہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود ٹھیرایا تھا لیکن محدث صاحب نے گویا یہ پڑھا کہ لکڑی چیرنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ لکھا ہے کہ وعظ سننے والوں میں ملاحوں کا بھی ایک گروہ تھا، ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے اور بولے کہ

فکیف نعمل والحاجة ماسة — آخر ہم لوگ کیا کریں ضرورت تو لکڑی چیرنے

ص۱۱۵ تدریب — کی ہر حال ہوتی ہے

یعنی بے چاروں کا روزگار ہی کشتی چلانے پر موقوف تھا، اور کشتی ظاہر ہے کہ لکڑی چیرے بغیر کیسے بن سکتی ہے لوگوں نے یہ نہیں لکھا کہ پھر محدث بے چارے نے اس کا کیا جواب دیا تعجب ہے کہ ابن صلاح نے اس قصہ کو ابن شاہین جیسے آدمی کی طرف منسوب کیا ہے اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ وہی بے چارے کیا اس قسم کی غلطیوں کا تجربہ اکثروں کو کرنا پڑتا ہے۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ کا قول سیوطی نے نقل کیا ہے کہ

ومن یعری عن الخطاء والتصحیف — عام غلطی یا غلط خوانی سے کون محفوظ رہ

ص۱۹۲ تدریب — سکتا ہے۔

اسی لئے میری غرض ان تصحیفی غلطیوں کے ذکر سے خود ان غلطیوں کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ان حضرات سے میرا خطاب ہے جنھوں نے اس زمانے میں حفظ اور یادداشت کی تحقیر کرتے ہوئے "کتابت" "کتابت" کا اتنا ہنگامہ مچا رکھا ہے، کہ میں نے جیسا کہ عرض کیا ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب ہو جانے کے بعد پھر شکوک و شبہات کی گویا گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ حالاں کہ دونوں باتیں غلط ہیں اور صحیح بات وہی ہے کہ چیزوں کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، کام لیتے ہوئے جن احتیاطوں کی ضرورت ہے اگر ان کی پابندی کی جائے گی تو دونوں ہی ذرائع قابل اعتماد ہیں اور ان احتیاطوں سے جب لاپروائی برتی جائے گی تو شک و شبہ کی گنجائش دونوں میں پیدا ہو سکتی ہے، محدثین اس کو خوب سمجھتے تھے کہ محض کسی چیز کا قید کتابت میں آجانا، اس کو قابل اعتماد بنا دینے کے لیئے قطعاً کافی نہیں ہے۔ لکھنے کے بعد اسی لئے ہمیشہ اپنے

شاگردوں کو شدید تاکید کیا کرتے تھے کہ اصل صحیح نسخے سے اس کو ملا لیا کریں۔ اس سلسلہ میں ان کے شدید تاکیدی الفاظ کتابوں میں منقول ہیں پچھلے زمانے ہی میں نہیں، بلکہ لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے صاحبزادے عروہ بن الزبیرؓ نے اپنے لڑکے ہشام بن عروہؒ سے پوچھا کہ جو حدیثیں میں نے بیان کیں تم نے ان کو لکھ لیا۔ ہشام کہتے کہ جی ہاں لکھ لیا۔ عروہ نے کہا اس کا اصل سے مقابلہ بھی کر لیا، ہشام نے کہا جی نہیں یہ سن کر عروہ نے کہا کہ

لم تکتب الکفایہ ص۲۳۷ تم نے ہرگز یا لکھا ہی نہیں

قریب قریب اسی کے دوسرے محدثین سے الفاظ اس باب میں منقول ہیں اور یحییٰ بن ابی کثیر تو عموماً اپنے تلامذہ سے فرماتے کہ

من کتب ولم یعارض کمن دخل الخلاء ولم یستنج کفایہ ص۲۳۷ جس نے لکھا لیکن اصل سے اس کا مقابلہ نہ کیا تو اس کی حالت اس شخص کی مانند ہے جو بیت الخلاء گیا اور استنجا کے بغیر نکل آیا۔

اور ایک مقابلہ ہی کیا کتابت حدیث کی ذمہ داریوں کی وہ فہرست جو ہمارے محدثین نے بنائی ہے، کافی طویل ہے انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس کی تفصیل کی جائے گی اس وقت میرا خطاب صرف ان مسکینوں کی طرف ہے جنہوں نے کتابت کے متعلق کچھ یہ باور کر لیا ہے کہ کسی چیز کا مکتوب ہو جانا گویا معصوم ہو جانا ہے نہ لکھنے والوں سے غلط نویسی اور بھول چوک ہو سکتی ہے اور نہ پڑھنے والے کبھی غلط پڑھ سکتے ہیں یا غلط سمجھ سکتے ہیں اسی کے مقابلہ میں یاد کی ہوئی چیز کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اپنی اصلی حالت میں اس کا یاد رہ جانا گویا ناممکن ہے پھر ان ہی مفروضات پر تیسرے فرض کی

بنیاد کھڑی کی گئی کہ ابتدائی عہد میں حدیثوں کے چونکہ صرف زبانی یاد کرنے کا رواج تھا اور ان کے قلمبند کرنے کا خیال بعد کو کئی صدی کے گزرنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس لئے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ حدیثوں کا موجودہ ذخیرہ جو کتابوں میں ہے قطعاً کسی حیثیت سے قابل اعتماد نہیں ہے اسی کا نام بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں ہر مقدمہ فاسد اور محض ایک خود تراشیدہ فرض ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ ابتدائی صدیوں میں حدیثوں کے قلم بند نہ ہونے کا افسانہ صرف افسانہ ہے اور ابھی تو اس سلسلہ میں صرف عہد صحابہ کی چیزیں پیش کی گئی ہیں بعد کے قصے تو انشاء اللہ آپ آئندہ سنیں گے اسی طرح کتابت کی اتنی غیر معمولی اہمیت اور حفظ و یادداشت کی حد سے گذری ہوئی تحقیر و توہین جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، واقعات سے ان کا کچھ بھی تعلق ہے؟ نہ صرف گزشتہ تجربے بلکہ روز مرہ کے مشاہدات سے جو بات صحیح ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ دونوں ذریعے معلومات کے محفوظ کرنے کے طبعی طریقے ہیں، ان میں سے جس ذریعہ کو ذمہ داریوں کی تکمیل کرتے ہوئے لوگ اختیار کریں گے اور جس حد تک اختیار کریں گے، اسی حد تک اعتماد کے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوں گے اور جتنی زیادہ لاپروائیوں سے کام لیا جائے گا اعتماد اور بھروسہ بھی اسی نسبت سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

تفصیل تو آگے آتی گی، سردست بطور دعوی کے اتنا تو پھر بھی اسی وقت کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اور شاید پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار و رفتار، سیرت و کردار عادات و اطوار تین مختلف راہوں سے منتقل ہوتے ہوئے پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچے ہیں یعنی تعامل روایت و کتابت، تعامل اور توارث کی راہ سے منتقل ہونے والی چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا، کہہ چکا ہوں کہ جس

راہ سے قرآن کی منتقلی اگلوں سے پچھلوں میں ہوتی چلی آرہی ہے۔ اسی راہ سے جو چیزیں منتقل ہوئی ہیں، ان میں شک و شبہ کی کھلا گنجائش ہی کیا ہے، البتہ صرف روایت اور کتابت کی راہوں سے جو چیزیں منتقل ہوتی ہیں قطعیت میں ان کی یہ کیفیت تو نہیں ہے جو توارث اور تواتر کی راہ سے منتقل ہونے والی چیزوں میں قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے لیکن آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس نوعیت کی چیزیں بھی، یہ عجیب بات ہے کہ ابتداء عہد اسلام سے اس وقت تک جب کتابیں مدون ہو کر متواتر ہو گئیں عموماً کتابت و روایت کی دونوں راہوں سے ساتھ ساتھ وہ منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ روایت کی کوتاہیوں کی تلافی کتابت سے اور کتابت کی کوتاہیوں کی تلافی روایت سے ہوتی چلی گئی۔ محدثین جانتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک طریقہ پر قناعت کر لینے کے بعد باہمی کوتاہیوں کی تلافی ایک دوسرے سے جو ہو رہی ہے، یہ فائدہ جاتا رہے گا۔ بلکہ تجربہ الفاظ کے نہ سننے کی وجہ سے دیکھا جا رہا تھا کہ جو لوگ صرف لکھی ہوئی حدیثوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں اس قسم کی فاحش غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کے چند نمونوں کا ابھی آپ ذکر سن چکے نہ صرف عوام بلکہ فن سے تعلق رکھنے والوں کو بھی پایا گیا کہ ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اور کیسی غلطیاں؟ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن لکھتے ہوئے ایک کاتب صاحب آیت خر موسیٰ صعقا پر جب پہنچے ٹھٹھک کر فرماتے ہیں، ہیں یہ کیا؟ میں نے ہمیشہ لوگوں کو دیکھا کہ خر عیسیٰ کا ذکر کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ میرے پیش رو کاتب نے غلطی سے بجائے "عیسیٰ" کے "موسیٰ" لکھ دیا آپ نے قرآن میں بھی اصلاح دی، اور اصلاح کے بعد لوگوں سے اس کی داد بھی چاہی کہ وقت پر عیسیٰ کا مجھے خیال آگیا۔ ورنہ رو میں ممکن تھا کہ میرا قلم بھی "موسیٰ" ہی لکھتے ہوئے آگے نکل جاتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

واقع میں یہ واقعہ پیش بھی آیا ہے۔ لیکن خطیب نے اپنی متصل سند کے ساتھ حدیث کے متعلق یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ میں پہلے تو تعلقات اچھے تھے لیکن بعد کو دونوں کے درمیان کچھ سوءِ مزاجی پیدا ہو گئی، پھر عید کی نماز میں اذان اور اقامت کے مسئلہ کا ذکر ہے، یہاں جس چیز کا ذکر مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے تعلقات پہلے اچھے تھے اسی مفہوم کو عطا واقعہ کے راوی نے عربی کے ان الفاظ میں ادا کیا تھا کان الذی بینھما حسنا (دونوں کے تعلقات اچھے تھے)

مگر جیسے "قر" کے لفظ کو دیکھ کر قرآن کے کاتب صاحب کا ذہن بجائے حضرت موسیٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اسی طرح عطاء کے مذکورۂ بالا الفاظ میں "حسن" کا جو لفظ تھا یہ سمجھ کر کہ ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کا جب تذکرہ ہو رہا ہے سننے والے کا ذہن امام حسن علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گیا، اور اہل بیت کے ساتھ نیازمندی کے تعلقات کو ظاہر کرنے کے لئے جوش عقیدت میں "حسنا" کے لفظ کے بعد "علیہ السلام" کا اضافہ کر دیا ظاہر ہے کہ اس غلطی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ یہی تو ہوئی کہ لفظ صرف مکتوبہ صورت میں سامنے آیا ورنہ روایت کی راہ سے بھی یہی لفظ ان کے کان میں اگر پڑتا تو اولاً بجائے "حسن" کے ان کا کان اس لفظ کو "حسُن" کی شکل میں سنتا پھر بھی کچھ کھٹکا دل میں رہ جاتا تو پوچھ سکتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہوا، استاد سامنے ہوتا تو بتا دیتا لیکن صرف کتابت پر بھروسہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بے چارے امام حسن علیہ السلام کو ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کے درمیان کھینچ کر لے آئے۔

جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تفصیل سے یہ بتایا جائے گا کہ صحیح راہ روایتوں کی

حفاظت کی یہی ہے کہ کتابت اور روایت دونوں طریقوں کو مسلسل جاری رکھا جائے تاکہ ایک کے نقص کی تکمیل دوسرے سے ہوتی رہے، اور محدثین نے یہی کیا بھی ہے لیکن بایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تو لوگ کتابت ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں، اور روایت کی کوئی اہمیت دلوں میں باقی نہیں رہی ہے لیکن یہ اُن کا حال ہے جن بے چاروں کو اس قسم کی چیزوں کے تجربہ کرنے کا ذاتی طور پر موقع نہیں ملا ہے ورنہ محدثین اپنے طویل تجربوں کی بنیاد پر اس زمانے میں اس نتیجہ تک پہنچے تھے کہ کسی چیز کے متعلق ان دونوں ذرائع میں سے کسی ایک ہی ذریعے کے اختیار کرنے کا موقع آجائے تو وہ سمجھتے تھے کہ نتائج کے لحاظ سے روایت کے طریقہ میں صحت کی توقع بہ نسبت کتابت کے زیادہ ہے نقد رجال کے امام جلیل علی بن مدینی اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ

حافظ متقن احب الی من اصل	حدیثوں کو زبانی یاد رکھنے والے جنہوں نے
غیر متقن علا۲ کفانہ	اتقان اور بیدار دماغی کے ساتھ یاد کیا ہو
	میرے نزدیک، حدیث کے ایسے نسخے سے
	بہتر ہیں جن کے لکھنے میں زیادہ توجہ نہ کی گئی

حافظ کے ساتھ "متقن" کا لفظ ابن مدینی نے جو بڑھایا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کسی چیز کے یاد کرنے میں جن احتیاطوں کی ضرورت ہے، ان کی ذمہ داریوں کا محسوس کرنے والا ہو، اور نہ یاد کرتے ہوتے ان کا پورا پورا خیال رکھتا ہو وہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایسا حافظ اور زبانی یاد رکھنے والا میرے نزدیک اس کتاب اور نسخے سے بہتر ہے جس کے لکھنے میں اتقان کا خیال نہ کیا گیا ہو، یعنی لکھنے والے نے لاپروائیوں سے کام لیا ہو۔

خیال تو کیجئے یہ تو خیر حدیث کا معاملہ ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ روایت کس حد تک صحیح ہے، کسی معمولی آدمی کا بیان ہوتا تو کم از کم میرے لئے اس کا باور کرنا آسان نہ تھا، بہر حال دار قطنی کی "کتاب التصحیف" سے سیوطی نے تدریب میں نقل کیا ہے کہ ایک مشہور عالم تفسیر پڑھا رہے تھے، جب سورۂ یوسف کی آیت "جعل السقایۃ فی رحل اخیہ" پر پہنچے جس کے معنی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے سفری سامان میں شاہی پیمانے کو رکھوا دیا لیکن مفسر صاحب نے اسی آیت کو تلاوت کرتے ہوئے پڑھا کہ "جعل السفینۃ فی رحل اخیہ" یعنی بجائے شاہی پیمانے کے یہ مطلب ہوا کہ حضرت یوسفؑ نے "کشتی" اپنے بھائی کے ساز و سامان میں رکھوا دی۔ سننے والوں نے جنھیں قرآن زبانی یاد تھا، اور نہ بھی یاد ہوتا تو ایسی فاحش غلطی پہ کون صبر کر سکتا تھا، بہر حال جب پوچھا کہ لفظ "السفینہ" نہیں بلکہ "السقایہ" ہے تو ملاحظہ فرمایئے اس دیدہ دلیری کو اللہ علم کے فتنے سے آدمی کو محفوظ رکھے کہ بجائے غلطی کو مان لینے کے فرماتے ہیں:۔

"کہ یہ عاصم کی قرآۃ ہوگی، اور میرے بھائی قرآن کو ان کی قرأت پر نہیں پڑھتے ہیں۔"[1]

دیکھا پھر اپنی غلطی کا ان کو احساس ہوا۔ لیکن پڑھنے والوں کے سامنے رسوائی نہ ہو، ایک بات بنا دی گئی، اسی کتاب کے حوالے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سورۂ "الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل" جس کا نام سورۂ فیل ہے ان ہی صاحب نے پڑھاتے ہوئے الم تر کے شروع میں جو "الم" ہے۔ اس کو سورۂ بقرہ کے ابتدائی حروف الف لام میم تر کیف فعل ربک پڑھ دیا تھا۔[2]

---

[1] تدریب الراوی صفحہ ۱۹۷ ۱۲ [2] ایضاً

آپ دیکھ رہے ہیں خدانخواستہ اگر قرآن کے معاملہ میں صرف "کتابت" ہی پر بھروسہ کر لیا جاتا۔ اور کتابت کے ساتھ زبانی یاد کرنے کا دستور مسلمانوں میں شروع سے مروج نہ رہتا۔ تو جس تروتازہ حال میں اس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہے کیا پڑھا جا سکتا تھا علی الخصوص اسلام کے ابتدائی دنوں میں جب عربی حروف خصوصاً جن کی شکلیں باہم ملتی جلتی تھیں مثلاً ج ح خ د ذ ص ض وغیرہ میں نقاط کے ذریعہ امتیاز کا طریقہ بھی جاری نہ ہوا تھا۔ گو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حلقہ خاص کے آدمی ابوالاسود دؤلیؒ نے عہد صحابہ میں ہی نقاط کے ذریعہ ان مشتبہ حروف کی شناخت کا طریقہ ایجاد کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا لیکن جب تک نقاط کا یہ طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا، ان مشتبہ حروف میں تمیز کے لئے لوگوں کو

---

[1] دؤلی کی وفات ۶۹ھ میں ہوئی ہے۔ اس لئے یہ کام ۶۹ھ سے بہت پہلے پورا ہو چکا تھا بعض لوگ حجاج کے سر اس کا سہرا باندھتے ہیں لیکن میرے نزدیک بنی امیہ کے سیاسی ہتکنڈوں کا ایک جز یہ بھی ہے ان ہی سیاسی اغراض کے تحت قرآن کا جامع حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشہور کر دیا تھا حالانکہ واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہے حضرت عثمانؓ کا کام قرآن کے متعلق صرف اس قدر ہے کہ لکھنے کی حد تک آپ نے سارے مسلمانوں کو قریشی لہجے کے مطابق شکل پر جمع کر دیا تھا ورنہ پڑھنے میں پھر بھی آزادی تھی اور وہ کسی کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو جامع الناس علی القرآن فی الکتابۃ کہا جا سکتا ہے بہرحال میری تحقیق یہی ہے کہ نقطہ اندازی کے جس مسئلہ کو حجاج کی طرف منسوب کر دیا ہے، روایات کی تنقیح وتحقیق سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ درحقیقت اس کے موجد یہی ابوالاسود دؤلی تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص آدمی تھے۔ نحو کے ابتدائی کلیات ابوالاسود ہی نے حضرت علیؓ سے سیکھے تھے۔ ان امور کی تفصیل تدوین قرآن کی تاریخ میں ملے گی جسے میں لکھ چکا ہوں لیکن طبع نہیں ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو حجاج ہی کو اگر قرآنی حروف کے نقاط کا بانی مانا جائے تو جب بھی یہ کام عہد صحابہ ہی میں سمجھنا چاہئے کہ انجام پایا۔ حجاج کے زمانے میں بکثرت صحابہ موجود تھے ۱۲

کتنی دشواریاں اٹھانی پڑتی تھیں، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کوئی طریقہ ان حروف میں تمیز کا پایا جاتا تھا جیسے رقش کہتے تھے ابن عساکر اور مرزبانی کے حوالہ سے حضرت معاویہؓ کی روایت کتابوں میں جو نقل کی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجئے (تدریب ص۱۵۲) لیکن پھر بھی کوئی کلی اطمینان بخش طریقہ ان حروف کی شناخت صحیح کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں نہ تھا بلکہ لوگ اپنی ذاتی تجویزوں سے کام لیا کرتے تھے الذہبی نے عبداللہ بن ادریس کے تذکرے میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی سند میں ابوالحوراء نام جب آیا تو اندیشہ اس کا ہوا کہیں ابوالجوزاء، نہ پڑھا جائے اس لیے اپنی ذہنی اشارے کے لیے میں نے اس کے نیچے "حور عین" کا لفظ لکھ دیا[1] جس سے معلوم ہوا کہ علاوہ نقاط کے بعض دوسرے طریقے بھی ان حروف میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے لوگ اختیار کرتے تھے۔

بہر حال کچھ بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ نقاط کا طریقہ جب تک ایجاد نہ ہوا تھا اس وقت تک مکتوبہ چیزوں کا صحیح پڑھنا اور بھی دشوار تھا یہ تو حفظ اور یادداشت کے طریقہ سے قرآن کے محفوظ کرنے کی کرامت ہے کہ بحمداللہ اس کے کسی لفظ کے متعلق کسی قسم کا شبہ

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ ذہبی نے ابن ادریس کے اس قول کو نقل کر کے لکھ دیا ہے کہ قلت لم یکن ظهر الشکل بعد ص۲۹۱ ج۱۔ یعنی اس وقت نقطوں کا طریقہ ہنوز ایجاد نہ ہوا تھا لیکن میری سمجھ میں ذہبی کی یہ بات نہ آئی قطع نظر اس سے کہ عہد نبوت ہی میں بعض امتیازی طریقوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ نقطہ تو وہاں بھی نقاط ہی کا استعمال کیا گیا ہے دیکھئے رقش والی روایت حضرت معاویہؓ کی تاہم اتنا تو بہر حال مسلم ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول ہی میں خواہ دؤلی کو سمجھئے یا حجاج ہی کے اشارے سے سمجھئے نقطوں کا رواج عمومی طور پر پھیل چکا تھا پھر ابن ادریس جو دوسری صدی کے عالم ہیں ۱۹۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے ان کے متعلق یہ لکھنا کہ اس وقت تک نقطوں کا رواج نہ ہوا تھا اور شکل سے اگر حرکات زیر و زبر مراد ہے تو اس کی یہاں ضرورت نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ نقاط کی ترویج کے باوجود بھی اشتباہ کا اندیشہ رہ جاتا تھا یہ محدثین کی احتیاط کی انتہا تھی کہ نام تک کی صحت کے لیے اتنی نزاکتوں سے کام لیتے تھے۔ ۱۲

پیدا نہ ہوا قرأت کے اختلافات عموماً لہجوں کے اختلافات ہیں یا اس کے وجوہ دوسرے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ورنہ جیسا کہ اس زمانہ میں سمجھ لیا گیا ہے اگر بالکلیہ کھروسہ صرف کتابت کے طریقہ پر کرلیا جاتا تو حدیث تو حدیث میں سمجھتا ہوں کہ قرآن تک کے لئے وہ کتنا بڑا فتنہ بن سکتا۔[1] تدوین حدیث کی تاریخوں میں لوگ اس قسم کے لطائف کا ذکر جو کرتے ہیں کہ فلاں صاحب نے سفیان ثوری کو شقیان ثوری پڑھا، یا خالد الحذاء کو خالد الحذاء اور الحسن کے لفظ کو الحسیر پڑھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ ایک صاحب میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے حدیث کی سند کے راوی رقبہ بن مصقلا کو رقبہ بن متقلہ پڑھ دیا، تو ہم لوگوں میں آئندہ وہ رقبہ ہی کے نام سے پکارے جانے لگے اور یہی نام ان کا مشہور ہوگیا[2] (دیکھو معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۱۵۲) لیکن یہ غلطیاں تو حدیث میں اور حدیث میں بھی سند کے راویوں کے نام میں لوگوں میں لگی تھیں۔ حکیم الامت مرشد تھانوی

---

[1] خدا جانے جلال الدین سیوطی نے یہ بات کہاں سے نقل کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں والی مصر کے نام جس خط کی وجہ سے فتنہ کا آغاز اسلام میں ہوا بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصلی خط میں لکھا ہوا تھا کہ جب عامل خطہٰذا تمہارے پاس پہنچے تو اس کی بات کو قبول کیجیو۔ اسی قبول کیجیو کے مفہوم کو عربی میں "فاقبلوہ" کے لفظ سے ادا کیا گیا تھا لیکن فتنہ پردازوں نے اس کو "فاقتلوہ" بنادیا، یعنی قتل کردیجیو۔ اسی کے بعد اسلام میں وہ فتنہ اُٹھا جو پھر نہ دبا۔ دیکھو تدریب ص۱۵۱ اگر یہ واقعہ ہے تو فتنہ عثمانی کی تاریخ کی بنیاد ہی بدل جاتی ہے ۱۲۔ [2] جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں ہمارے ایک بڑے فاضل رفیق تھے لیکن عربی الفاظ کے تلفظ میں غیر محتاط تھے حتیٰ کہ لایبقیٰ کے لفظ کو جب انھوں نے لاَیَبقیٰ ایک بھری مجلس میں پڑھ دیا تو اس دن سے ایک خاص مجمع میں ان کو لوگ مولانا "لایبقیٰ" ہی کہا کرتے تھے آخر بیچارے باقی نہ رہے وفات ہوگئی۔

قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے وعظ میں ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے کسی صاحب نے بغیر استاد کے خود قرآن کی تلاوت کرنی چاہی، قرآن کھولا پہلی صورت جس پر نظر پڑی اس کی ابتداء الٓرٰ سے ہوئی تھی عربی خط میں یہ کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ صاحب نے اس کو "آلو" پڑھا غالباً اس پر مسرور بھی ہوئے ہوں گے کہ ہماری دینی کتاب نباتاتی حقائق سے لبریز ہے کھولتے کے ساتھ کھانے کی ایک چیز سامنے آگئی۔ آگے خیال کر لیا ہوگا کہ اسی آلو کے بونے کاشت کرنے پکانے کے طریقوں پر بحث کی گئی ہو گی، افسوس ہوا ہوگا کہ ملاؤں نے اس بہترین کتاب کو صرف خشک دین اور جنت و دوزخ کے تذکروں کی یادداشت بنا کر چھوڑ دیا ہے[1]۔

گو بات بہت بڑھ رہی ہے لیکن کیا کیا جائے میں نے تو جو کچھ لکھا ہے ان مقالات اور مباحث کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو کتابت کو ہر مرض کی دوا یقین کرتے ہوئے اس پر داویلا مچا رہے ہیں کہ حدیثوں کو بجائے کتابت کے اتنے دنوں تک حفاظ حدیث کے حافظوں کے سپرد کیوں کر دیا گیا۔ خود یہی سمجھے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کاش حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا یہ طریقہ ابتداء اسلام میں اگر جاری نہ ہوتا اور صرف کتابت پر بھروسہ کر لیا جاتا تو بدگمانیوں کے جو بھبھارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق ان کے دماغوں میں اٹھ اٹھ کر خفقان پیدا کرتے رہتے ہیں ان کی تولید اور پیدائش کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی

[1] اس زمانے میں طنطاوی جوہری کی تفسیر جس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے، اسی بنیاد پر اس کو خاص حسن قبول حاصل ہوا ہے تعلیم یافتہ طبقوں میں بڑی تعریف اس کتاب کی سنا جاتا ہے کہ ہو رہی ہے۔ فیا للعجب ولضیعۃ العلم والدین ۱۲

اسی مفروضہ، خود آفریدہ واقعہ کو بزرگوں پر لعن وطعن کا ذریعہ بھی بنا لیا گیا ہے، اور اسی کو پیش کر کرکے "اسوۂ حسنہ نبویہ" جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے شمع راہ کا کام دے رہا تھا، اس شمع ہی کو بجھا دینے کی کوششوں میں ایڑی چوٹی کا زور خرچ کیا جا رہا ہے۔ صرف قرآن، قرآن کے سوا کچھ نہیں اسی کا جھنڈا بلند کر دیا گیا ہے، کتابوں کے طومار کے سوا مختلف قصبوں میں ماہوار رسالے نکالے جا رہے ہیں اور قرآن بھی وہ جس کے پڑھنے والوں کو الآن کی جگہ اس میں "آلو" لکھا ہوا نظر آتا ہو آپ ان بافندہ طامات کے گوہ بیکر گٹھوں کو دیکھئے تب معلوم ہوگا کہ میں نے تو ابھی کوئی پوٹلی بھی تیار نہیں کی ہے۔

خیر اب اس قصے کو ختم کیجئے انصاف سے کام لینے والوں کے متعلق مجھے توقع ہے کہ اس سلسلہ میں واقعات کی جو روشنی مہیا کی گئی ہے اس روشنی میں وہ اس نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے کہ یاد کر کے کسی چیز کو محفوظ کرنا یا لکھ کر اس کو محفوظ کر دینا دونوں میں چنداں فرق نہیں ہے، سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہے کہ حفاظت کے ان دونوں ذرائع سے کام لیا جائے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ قرآن ہی کی حد تک نہیں بلکہ حدیثوں کے متعلق بھی شروع ہی سے اسی طریقہ کو سارے اسلاف نے اختیار کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ لوگوں کو اس کا اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ حفاظت کے ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک ہی طریقہ کو کسی وجہ سے اگر اختیار کیا جائے یا ان دونوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے کام لیا جائے تو ایسی صورت میں حفظ اور یاد کرنے کے تسلسل کو جاری کرنا یعنی ہر پہلی نسل خود یاد کر کے آئندہ نسلوں کو یاد کراتی چلی جائے تو مختلف وجوہ سے کتابت اور قلم بندی کے لحاظ سے حفظ اور یاد کرنے کا طریقہ

زیادہ اسلم واحکم ہے۔ چیزیں اپنی شکل وصورت خط وخال کے ساتھ محفوظ میں اس اعتماد کی جتنی ضمانت اس طریقہ میں ہے، صرف کتابت میں اس اعتمادی اطمینان کو آدمی کی فطرت مشکل ہی سے پا سکتی ہے۔ میری مذکورہ بالا گفتگو کا آخری خلاصہ یہی ہے، یہی وہ ہے کہ ویدکے متعلق البیرونی کی اس تاریخی شہادت کو پیش کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں جس وقت البیرونی آیا ہے، اس سے کچھ ہی دن پہلے کشمیر کے ایک پنڈت نے وید کے اشلوکوں کو قلم بند کیا تھا ورنہ اس سے پہلے خواہ جتنا بھی زمانہ گذرا ہو، اس کتاب کی حفاظت کا سارا دار ومدار یاد کرنے والے پنڈتوں اور برہمنوں کی یاد پر تھا میں نے عرض کیا تھا کہ وید پر اور جن پہلوؤں سے بھی نکتہ چینی کی جائے لیکن صرف اتنی بات کہ اتنے زمانہ تک جو کتاب قید کتابت میں نہ آسکی اس کے ماننے والوں کے اعتماد کو مضمحل کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ جیسے قرآن کو زبانی یاد کرنے کا دستور تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال سے مسلمانوں میں مروج ہے، اسی طرح وید کو جن لوگوں نے خدا کی کتاب مانا تھا، ان میں بھی یہی دستور جاری تھا کہہ چکا ہوں کہ واقعات سے یہی ثابت بھی ہوتا ہے کہ وید کے ماننے والوں نے اپنے دھرم اور دین کی بنیادی کتاب کی حفاظت وبقار کے تسلسل کو زبانی یاد کرنے ہی کے طریقہ سے کم ازکم ہزار پندرہ سو سال تک باقی رکھا اور کبھی ان کے قلب میں اس کا شبہ نہ ہوا کہ اتنی طویل مدت تک جو چیز مکتوبہ شکل میں نہیں رہی ہے اس کو دین کے جوہری حقائق اور اساسی عناصر کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہی ایک واقعہ ان ساری مسعود نامبارک کوششوں کو غیر فطری ٹھیرانے کے لئے کافی نہیں ہے حدیثوں کے متعلق یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ صدی ڈیڑھ صدی تک وہ قلمبند نہ ہو سکیں، بلکہ بجائے اس

کے یاد کر کے یاد کرنے والوں نے اس کو محفوظ رکھا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک ان کو منتقل کیا آخر فطرت کا تقاضہ اگر یہی ہوتا کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے تو صدی ڈیڑھ صدی نہیں بلکہ کم از کم تیرہ چودہ صدیوں تک کتابی قالب سے آزاد رہنے والی کتاب دیدکر در ہا کر دران انسانوں کے اعتماد کے حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوسکتی تھی جو مذہب کے آخری بنیادی اور اساسی کتاب پر اس کے ماننے والوں کو ہوسکتی ہے

حدیث پر بلاشبہ مسلمان اعتماد کرتے چلے آئے ہیں اور جب تک مسلمان مسلمان ہیں انشاء اللہ یہ اعتماد ان میں باقی رہے گا لیکن کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہوتا ہوا قرآن پہنچا ہے اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو مسلمانوں کو اپنے پیغمبر سے ملی ہیں اعتماد راسخ کا جو مقام ان چیزوں کو مسلمانوں میں حاصل ہے، کیا اعتماد کی اس لازوالی غیر متزلزل کیفیت سے ان چیزوں کے اعتماد کو کیا نسبت جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحاً خبر احاد کہتے ہیں یعنی صحاح وغیرہ کتابوں کی عام حدیثوں کی جو نوعیت ہے اور اس وقت میری بحث کا تعلق در اصل حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے آپ اصول فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو قریب قریب یہی مضمون مختلف الفاظ میں ملے گا۔ مثلاً صاحب کشف بزدوی نے لکھا ہے کہ

مَنْ سَوّاہ بالکتاب والسنۃ المتواترۃ فقد اخطاء فی رفعہ عن منزلتہ ووضع الاعلیٰ عن منزلتہ ص ۲۰ ج ۲ کشف	قرآن اور سنت متواترہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو باتیں تواتر کی راہ سے منسوب ہیں) ان دونوں کے برابر (جو ان حدیثوں کو سمجھتا ہے جنھیں خبر احاد کہتے ہیں)

اس نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا، یعنی خبر
احاد والی حدیثوں کا جو واقعی مقام اور مرتبہ
ہے اس مرتبہ سے ان کو اس نے بلند کر دیا
(یہ پہلی غلطی ہوئی) اور دوسری غلطی یہ ہے
کہ (کتاب وسنت متواترہ) کو ان کے مقام
سے اس نے گرا دیا۔

بلکہ ایسی حدیثیں بھی جو اپنے بیان کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے تواتر کی درجہ تک نہ پہنچی ہوں لیکن پھر بھی اگلی نسلوں تک انھیں عام شہرت حاصل رہی ہے اصطلاحاً جس کا نام حنفیوں نے خبر مشہور رکھا ہے، ان تک کے متعلق شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ

ان جاحدہ لا یکفر بالاتفاق
کشف ص ۳۶۸ ج ۲

اس قسم کی مشہور حدیثوں کے منکر کو کافر نہیں
ٹھیرایا جا سکتا یعنی اس پر کفر کا فتویٰ اور یہ
کہ دائرہ اسلام سے وہ خارج ہو گیا یہ حکم
نہیں لگایا جا سکتا۔

اور جب ان کا حال یہ ہے تو درجہ میں ان سے جو حدیثیں فروتر ہیں یعنی احاد خبریں ظاہر ہے کہ ان کے ماننے نہ ماننے پر مسلمان ہونے نہ ہونے کا دار و مدار کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو راہ نمائیاں میسر آتی ہیں خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی ہوں لیکن با ایں ہمہ یہ مسلمہ ہے کہ

لا یعاقب تارکھا الا بھا لیست

ان کے چھوڑنے پر چھوڑنے والے کو سزا نہیں

بفریضۃ ولا واجبۃ کشف ص۲۱ ج۲ دی جائے گی، کیونکہ (جو احکام احاد خبروں سے پیدا ہوتے ہیں) وہ نہ فرض ہوتے ہیں اور نہ واجب

اور یہ حکم تو ان کا ہے جو ان حدیثوں کو مانتے ہیں لیکن ان پر عمل کی توفیق سے محروم ہیں، باقی مسلمانوں میں ایک گروہ مثلاً معتزلہ وغیرہ جو یہ کہتے تھے کہ ایسی حدیثوں کا کیا اعتبار جن کی خبر معدودے چند آدمیوں نے دی ہو، یعنی سرے سے خبر آحاد کی افادیت کے جو منکر ہیں، ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ صاحب کشف نے نقل کیا ہے کہ

فقد ضل سواء السبیل ص۳۴ ج۲ سیدھی راہ سے وہ بھٹک گیا،

درحقیقت ان پر وہی بات صادق آتی ہے جسے فخر الاسلام بزدوی نے اپنے بلیغ فقرے میں ادا کیا ہے کہ

ھذا رجل سفیہ لم یعرف نفسہ ولا دینہ ولا دنیاہ ولا امہ ولا اباہ ص۳۶۷ یہ دراصل ایک بے وقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی یہ نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو نہ دنیا کو، نہ اپنی ماں کو نہ اپنے باپ کو[1]

بہرحال کچھ بھی ہو، میں کہنا چاہتا ہوں کہ محض زبانی یادداشت کی شکل میں رہنے کی وجہ سے جب دنیا کی کوئی منطق اعتماد کی اس چٹان کو ہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو مذہب کے بنیادی حقائق اور اساسی عناصر پر انسانی فطرت عموماً رکھتی ہے تو بتایا جائے

---

[1] یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ فخر الاسلام غصہ میں کچھ دشنام طرازی پر اتر آئے تھے بلکہ واقعہ کے اظہار کی شکل ہی اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے مطلب ان کا یہ ہے کہ واقعیت پسندی میں معقولوں کا یہی مذاق حد جنون تک پہنچ
باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ

کہ حدیثوں کا عام ذخیرہ جس سے پیدا ہونے والے نتائج کی حیثیت مسلمانوں کی دینی

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) جاتا ہے اور اسی لئے ان چیزوں کے سوا جنھیں ان کی آنکھوں نے دیکھا ہو، کانوں نے سنا ہو، الغرض اپنے حواس کے معلومات کے سوا دوسروں کی دی ہوئی خبر صرف اس لیے کہ وہ خبر ہے اور ہر خبر میں سچ ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹ ہونے کی بھی یوں کہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے خبر سے کہتے ہیں کہ کسی واقعہ کا علم ہو ہی نہیں سکتا، خواہ خبر دینے والا کوئی ہو، کسی قسم کی خبر دے رہا ہو، کسی حال میں دے رہا ہو، اور اپنے اسی وسوسے کو یہ لوگ ایک قسم کا فلسفہ قرار دے کر ان حدیثوں کا بھی انکار کرتے ہیں جن میں ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل وغیرہ کی خبر دی جاتی ہے فخر الاسلام کا خطاب اسی قسم کے وسواسیوں سے ہے کہ دنیا کے معاملات کا تو ظاہر ہے کہ زیادہ تر خبروں ہی پر دارومدار ہے آج اگر اس اصول کو مان لیا جائے کہ خبروں سے واقعات کا علم نہیں حاصل ہو سکتا تو کیا کوئی بیچارا تاجر تجارت کر سکتا ہے خبر ہی سے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیزیں فلاں جگہ ملتی ہیں، خبر ہی سے اس کو واقفیت ہوتی ہے کہ مال اس کا روانہ ہو گیا ہے یا اسٹیشن پہنچ گیا ہے، اور ایک یہی کیا زندگی کے سارے شعبوں کا یہی حال ہے اگر آدمی اس قدر تنکی ہو جائے تو چپراسی کو اس کا افسر یہ حکم دے کر بھیجے کہ فلاں صاحب کو بلاؤ چپراسی خبر دے کہ صاحب آپ کو بلاتے ہیں، اس خبر کو سن کر کہنے والا کہنے لگے کہ تو خبر دے رہا ہے خبر جھوٹی بھی ہوتی ہے اور سچی بھی اس لیے مجھے تیری خبر سے کسی قسم کا علم حاصل نہ ہوا یہ فرماتے ہوتے اگر افسر کے چپراسیوں کو جو واپس کرتا رہے تو آپ ہی خیال کیجے کہ پاگل خانے کی چار دیواری میں داخل ہونے سے کب تک بچا رہ سکتا ہے، دنیا کو جانے دیجئے آپ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں گھڑے میں پانی ہے پوچھتے ہیں کہ پانی پاک ہے مؤذن خبر دیتا ہے کہ جی ہاں پاک ہے آپ خبر قرار دے کر اس کی خبر کو مسترد کر دیتے ہیں آگے جانماز ہے کیا پاک ہے پھر وہی خبر آپ کو ملتی ہے کہ پاک ہے امام آگے ہوتا ہے کہتا ہے کہ میں باوضو ہوں۔ میرے کپڑے پاک ہیں لیکن آپ ہر خبر کو خبر ٹھیرا کر اس سے علم پانے سے انکار کریں گے تو کیا ایک وقت کی بھی نماز آپ پڑھ سکتے ہیں؟ فخر الاسلام نے آگے جو بات کہی ہے نہ یہی واقعہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کو باپ ماں کو ماں، ظاہر ہے کہ خبر دینے والوں کی خبروں ہی کی بنا پر تو یقین کرتا ہے لیکن جن کے ہاں خبر سے علم پیدا ہی نہیں ہوتا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اپنے باپ اور ماں کو پہچاننے کے حق سے وہ محروم نہیں ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ خبریں کبھی جھوٹی بھی ہوتی ہیں لیکن جھوٹی اور سچی خبروں میں تمیز کا ایک قانون ہے عوام ممکن ہے کہ اس قانون کی تفصیلات سے اس لیے واقف نہ ہوں کہ وہ زیادہ سوچ بچار سے کام نہیں لیتے لیکن ہر ایک کی فطرت اس قانون کو پہچانتی ہے اور اسی کی راہنمائی میں دین، دنیا کا کام چلتا رہا ہے محدثین نے غور و خوض کے بعد اسی قانون کے تمام اجزاء اور عناصر کی تحلیل کی ہے آئندہ اپنے موقعہ پر انشاء اللہ ان تفصیلات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ۱۲

زندگی کی تعمیر میں صرف ثانوی عناصر و اجزاء کی ہے اس حد سے زیادہ محتاط طرز عمل پر لب کشائی اور انگشت نمائی کی جرأت محض اس غلط مفروضہ کی بنیاد پر کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ سو سوا سو سال یعنی وقفہ کی مذکورہ بالا مدت جو عہد صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیان گذری اسی میں قلم بند کر کے حدیثوں کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا گیا تھا بلکہ حفظ اور یادداشت کے ذریعہ سے سینوں سے سینوں تک اس عرصے میں یہ حدیثیں منتقل ہوتی رہی ہیں، ان حدیثوں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلومات کا جو سرمایہ اس وقت دنیا میں پایا جارہا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیثوں سے رو کھنے والے ان معلومات کے قبول کرنے سے جو گریز کی راہ اختیار کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور وقتاً فوقتاً طرح طرح کی بدگمانیاں اور شککی شرارے معلومات کے اس مقدس سرمایہ کے متعلق بے اعتمادی پیدا کرنے کے لئے فضا میں جو اڑاتے رہتے ہیں، آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ کیا واقعی ان کی عقل اس کی اجازت دیتی ہے کہ بلا وجہ ان سب کو غلط بیانی کا مجرم قرار دیا جائے جن سے حدیثوں کا یہ ذخیرہ مروی ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ کسی خبر دینے والے کو محض اس لیے کہ وہ ایک واقعہ کی خبر دے رہا ہے بلا وجہ جھوٹا یقین کر لینا نہ صرف عقلی افلاس بلکہ اخلاقی افلاس کی بھی دلیل ہے جس کے متعلق جھوٹ یا غلط بیانی کا آپ کو تجربہ نہیں ہوا ہے خواہ وہ بے چارا کسی درجہ کا بھی آدمی ہو، یہ سمجھ لینا کہ وہ جھوٹا ہے اور دروغ باف ہے کسی حیثیت سے بھی شریفانہ فعل قرار پاسکتا ہے؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے آپ ہی کے ساتھ کوئی اس طرز عمل کو اگر اختیار کرے اور آپ کے حالات سے ناواقف ہونے کے باوجود فقط اس لئے کہ آپ نے کسی واقعہ کی اطلاع دی ہو سننے کے ساتھ سننے والا قہقہہ لگادے تو خود سوچئے کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا دل کیا فیصلہ کرے گا؟

پھر بتایا جائے کہ ایسی صورت میں اس ہنسی کو عقل و دانائی کی ہنسی کس طرح قرار دی جائے جو آج پیغمبرؐ کی حدیثوں سے منہ پھلانے والوں کے ہونٹوں پر ناچ رہی ہے سمجھنے والے خواہ کچھ بھی سمجھیں لیکن مجھے تو ان استحقانی مسکراہٹوں اور استہزائی عل غپاڑوں کے نیچے سبک مغزی، تنگ نظری کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں نظر آرہی ہے سنجیدگی اس قسم کی چھچھوری حرکتوں کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ تمسخر کرنے والوں کے اس گروہ نے آخر کبھی اس کو سوچا بھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اُن کے ان سارے مظاہروں کی بنیاد ان کے کس اخلاق رذیلہ پر قائم ہے کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کو ماننے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ان بزرگوں کے احترام و عظمت سے اپنے قلوب کو بلا وجہ خالی کرلے، جن کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ گذشتہ اوراق میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے بھی نہیں بلکہ ان کا مطالبہ تو شاید یہ ہے کہ جن کے متعلق سچائی اور راستبازی کے سوا اور کسی چیز کا تجربہ نہیں ہوا ہے، اچانک ان میں سے کسی ایک کو نہیں بلکہ سب کو، ہر ایک کو بلا وجہ یہ مان لیا جائے کہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے اور جھوٹ بولتے تھے، اور ایسی چیزیں ہم تک ان بزرگوں نے پہنچائی ہیں جن کا واقعہ سے کوئی تعلق نہ تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی ہے خود سوچئے کہ ان حدیثوں کے مسترد کر دینے کا مطلب کیا ہوا؟ ایمانیوں کا وہی گروہ جن کی ایمانی قوتوں اور ان قوتوں کے آثار و نتائج کا تذکرہ ابھی آپ ہم سے سن چکے ہیں، پیغمبرؐ اور پیغمبرؐ کے دین کے ان ہی وفا شعاروں کے متعلق وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا پیغمبرؐ ماننے کے باوجود اپنے اسی پیغمبرؐ اور رسولؐ کی طرف ان لوگوں نے جھوٹی باتیں قصداً منسوب کیں۔

(باقی آئندہ)

خلیفۃ الاعظم

امیر المومنین عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ

از جناب سید انوار الحق صاحب حقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
لکچرر تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

دنیا اس بات کی شاہد اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ مورخین کی بے اعتنائیوں اور بے جا اعتراضات نے بہت سی قابل قدر اور اولوالعزم ہستیوں کی خدمات پر پانی پھیر دیا ہے اور جیسی کچھ ان کی قدر و منزلت ہونی چاہئے تھی اس سے انھیں محروم رکھا گیا ضرورت ہے کہ ہمارے مورخ تعصب کی عینک اتار کر فراخدلی غیر جانبداری اور پرخلوص جذبہ کے ساتھ دنیا کے ان فاتحین اور سلاطین کے کارناموں پر تحقیق و تنقید کی روشنی ڈالیں جنھوں نے اپنی عمریں تہذیب و تمدن کی ترقی، امور سلطنت کی انجام دہی نیز رعایا کی فلاح و بہبود میں صرف کر دیں ایک مورخ کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ وہ تعصب سے بری ہو بلکہ اس کو بغور ان حالات اور تغیرات کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے جن میں یہ واقعات پیش آئے ساتھ ہی زمانہ کی رفتار اور روش بھی مدنظر رکھنی چاہئے مثلاً اگر آج سے سات سو سال قبل کے کسی بھی فرمانروا پر قلم اٹھایا جائے تو سب سے پہلے یہ بھی دیکھا جائے کہ اس وقت دنیا کے دیگر ممالک کی کیا کیفیت اور حالت تھی۔ دوسروں سے موازنہ کرنے کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ جس فرمانروا کے حالات قلمبند کئے جا رہے ہیں وہ واقعی کسی تعریف و توصیف کا اہل ہے یا نہیں۔

تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ یورپ کے عام مورخین اور خاص کر شارلمین کے سوانح نگار "مسٹر ڈیوس" جو اس بات کے شاکی ہیں کہ مورخین وسعتِ قلب اور وقت نظر سے کام نہیں لیتے ہیں۔ خود بھی اس الزام سے بری نہیں۔ اپنی تصنیف میں صاحب موصوف نے "شارلمین" کو نہ صرف انتظام مملکت میں خلیفہ عبدالرحمٰن سوئم پر ترجیح دی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن خون بہانے کا شائق، خبطی اور متلون مزاج تھا۔ حالانکہ مشہور عرب مورخ علامہ مقری کی شہادت و قول کے مطابق خلیفہ عبدالرحمٰن تمام فرمانروایان یورپ اور اسپین میں سب سے زیادہ با خلاق۔ حلیم۔ منکسر المزاج اور روشن خیال تھا، اس کی شرافت، عالی حوصلگی، اور انصاف ضرب المثل تھے۔ علاوہ بریں جب ہم خلیفہ کے دور حکومت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شارلمین برتر تو کیا اس کا ہمسر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خلیفہ کی شاندار زندگی اور حکومت کا مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شارلمین اس کے سامنے ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے زندگی کے ہر شعبہ میں خلیفہ نے ایک نئی روح پھونکی۔ اور ڈوبتی ہوئی قوم کو نہ صرف ڈوبنے سے بچایا بلکہ دنیا کی متمدن ترین قوم بنا دیا۔ علم و ادب، حسن کاری، صنعت و حرفت انتظام حکومت اور زراعت و تجارت میں چار چاند لگا دیئے۔ اسپین کو معلم اخلاق اور علم تہذیب و تمدن بنا دیا۔ ملک کو دولت سے مالامال کر دیا برعکس اس کے شارلمین نے نظم و نسق میں کوئی خاص اصلاحات نہیں کیں۔ نہ ہی اس کے دور میں ملک نے علم و ادب یا تہذیب و تمدن میں کوئی ترقی کی اور نہ کچھ زندہ جاوید عمارات یا فنون ہی عالم وجود میں آئے ان سب کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود کس طرح یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ شارلمین عبدالرحمٰن سوئم سے بلند و برتر مقام کا مستحق ہے عبدالرحمٰن کی صحیح تاریخی حیثیت و مرتبت

کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی تخت نشینی کے وقت ملک کی جو سیاسی فضا اور اخلاقی حالات تھے پہلے ان کا مطالعہ کریں اور پھر دیکھیں کہ جو مشکلات اور مسائل اس کے سامنے تھے ان کو وہ کس طرح اور کہاں تک حل کرنے میں کامیاب ہوا۔

اکتوبر ۹۱۲ئہ میں جب نوعمر عبدالرحمٰن سریر آرائے سلطنت ہوا ملک کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی تمام ملک فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا تھا اور اندلس پر تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ عبدالرحمٰن ثانی کے جانشینوں کی نااہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے حکومت میں خلل واقع ہو گیا تھا اور سلطنت کی باگ ڈور خود غرض امیروں اور چالاک وچرب زبان مصاحبوں کے نالائق ہاتھوں میں آگئی تھی۔ جس کی وجہ سے ملک میں شورشوں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور عبدالرحمٰن کی تخت نشینی کے وقت بھی ہر طرف لوٹ مار، بدامنی اور جھگڑوں اور فسادات کا دور دورہ تھا۔ امیر محمد کی پالیسی اور خاص کر امیر عبداللہ کی تلون مزاجی نے حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ امیر عبداللہ بذلہ سنج اور خوش گو سلطان تھا لیکن جوہر دماغی اور فوجی قابلیت سے مطلقاً عاری۔ جرات و بسالت کی کمی کی وجہ سے رعایا کے دلوں میں امیر عبداللہ کی کچھ بھی وقعت و محبت نہ تھی۔ امیر کی کمزوری اور بزدلی کے سبب فوج بد دل۔ اور اس کی عیارانہ چالوں سے عوام الناس اس سے سخت نالاں و بیزار ہو گئے تھے۔ امیر عبداللہ ایسے ظاہری و باطنی اوصاف کا حامل نہ تھا جن کی وجہ سے دوست اور دشمن اس کا احترام کرتے۔ دشمنوں پر اس کا رعب بالکل نہ تھا اس کی دو رویہ حکمت عملی اور ریاکاری سے رعایا اور حکام دونوں بد دل اور بدگمان رہتے تھے اور فی الحقیقت وہ شخص کیوں کر قابل اعتماد ہو سکتا تھا جس نے بھائی کو قتل کر کے تخت حاصل کیا ہو اور جس کے ہاتھ اپنے دو بیٹوں کے خون سے رنگین ہوں۔ اس لئے ملک

میں مستقل بد امنی قائم رہی۔ حکومت کی قوت کا انحصار دراصل رائے عامہ پر ہوتا ہے اور ریاست کی بنیادیں اسی وقت مضبوط اور مستحکم رہتی ہیں جبکہ عوام کی تائید و حمایت اس کو حاصل ہو اپنے اطوار اور طرز حکومت سے امیر عبداللہ نے عوام کی تائید و حمایت کو کھو دیا تھا۔ عام بیزاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے صوبوں کے گورنروں نے امیر قرطبہ کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ بڑے بڑے شہر مثلاً اشبیلیہ، قادز، طلیطلہ، جیین، غرناطہ۔ بلنیہ وغیرہ جن پر دولت قرطبہ کو بجا فخر و ناز تھا دارالخلافہ سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ اور سالانہ محاصل و خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ اور قرطبہ کی تجارتی منڈیاں سونی اور برباد ہو رہی تھیں۔ فتنہ و فساد کی وجہ سے قزاقوں اور غارتگروں کی موج تھی اور ان کی تاخت و تاراج کی وجہ سے آمد و رفت کے ذرائع غیر محفوظ اور مسدود ہو گئے تھے شہروں اور قصبوں کے باشندوں کی بھی جانیں اور مال محفوظ و مامون نہ تھے صرف وہی لوگ اطمینان و آرام سے زندگی گذار سکتے تھے جو قلعوں یا جزیروں میں پناہ گزیں تھے باغیوں کی ترک وتاز سے شہر تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ وہ جوانوں اور مردوں کو تہ تیغ کرتے اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیتے۔ اندلس کی طوائف الملوکی اور بد امنی ضرب المثل ہو گئی تھی بقول صاحب "اخبار مجموعہ" یہ بات عام طور سے مشہور ہو گئی تھی کہ "اندلس فتنہ و فساد کا مرکز بن چکا ہے، اس عام بد امنی سے وہی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں جو قلعوں یا جزیروں میں پناہ لیں یہ بھی شہرت تھی کہ اب یہ فساد اس طرح جڑ پکڑ گیا ہے کہ اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی امید نہیں" اس وقت واقعی اندلس پر فتنہ و فساد کے بادل چھائے ہوئے تھے اور افق پر تباہی اور بربادی کے آثار کے

علاوہ امید اور خوشحالی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ منذر اور عبداللہ کی مستبدانہ حکمتِ عملی کی وجہ سے مملکت کے مختلف فرقے اور طبقے حکومت کے خلاف ہوگئے تھے۔ اور ابن حفصون کی بتیس سالہ تحریکِ بغاوت اور جدوجہد بظاہر کامیاب ہوتی نظر آتی تھی خوشی اور غرور سے باغی پھولے نہ سماتے تھے۔ اور اُن کے فخر و مباہات بجا تھے۔ کیونکہ دارالخلافہ کی چاردیواروں کے باہر اب بنو امیہ کا کوئی بھی حامی اور خیر خواہ نہ تھا باغیوں کے خیالات اور امیر عبداللہ کے عہد حکومت میں عربوں کی سیاسی زبوں حالی اور کس میرسی کا صحیح نقشہ عبدالرحمٰن ابن احمد علی کی پرجوش نظموں میں ملتا ہے۔ باغیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "ہمارے دشمنوں کی برچھیاں ٹوٹ گئیں۔ ہم نے ان کے غرور کو نیچا دکھا دیا۔ جیسے وہ "ذلیل گروہ" کہا کرتے تھے آج اسی گروہ نے ان کی جڑ کاٹ دی اب ایک زمانے تک ان کے مردے جن کو ہم نے کنوئیں میں پھینک دیا ہے اس کے منتظر رہیں گے کہ کوئی ان کا انتقام لینے والا پیدا ہو" ——— اور ان کی یہ خوشی اور فخر و مباہات بجا تھے زوال وادبار کے آثار دیکھ کر بربری قبائل میں بھی سرکشی اور خودسری کا مرض پھر عود کر آیا تھا۔ کامیاب بغاوتوں کی دیکھا دیکھی بربری سرداروں نے بھی دولت قرطبہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر شاہی احکام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی قدیم عادات کے مطابق لوٹ مار کے لئے کمر باندھ لی تھی۔ جنوب مغرب کے کل علاقہ پر وہ قابض تھے جیان کا مشہور اور معروف شہر بھی ان کے قبضہ میں آچکا تھا اور بقیہ حصہ ملک ان کی فسادانگیزیوں سے عاجز اور پریشان تھا۔ ملک کے طول و عرض میں بغاوتوں اور شورشوں کے طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اور عام طوائف الملوکی کے زیر اثر نو مسلم آبادی بھی حکومت کے مخالف ہوگئی تھی اور اس طرح مغرب کے زرخیز علاقے بنو اُمیہ

کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔

داخلی مشکلات وانتشار کے علاوہ امیر قرطبہ کو شمال اور جنوب دونوں جانب دو طاقتور اور خطرناک دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ سب سے اہم اور نازک مسئلہ ملک کو عیسائیوں کی تاخت وتاراج سے محفوظ رکھنا تھا۔ اسپین کے شمالی اور پہاڑی علاقوں میں پلیو اور الفانسو کے جانشینوں نے اپنی طاقت کو نہایت ہی مستحکم اور مضبوط کر لیا تھا۔ ان میں عربوں اور مسلمانوں سے نفرت ودشمنی کا جذبہ اب بھی موجود اور پہلے سے زیادہ غضبناک تھا۔ ملک کو غیروں سے آزاد کرانے اور مسیحیت کو دوبارہ فروغ دینے کے ساتھ ساتھ سرزمین اندلس کو عربوں اور مسلمانوں کے وجود سے پاک کرنا ان کا نصب العین تھا۔ قومی عناد وحسد اور مذہبی جوش وجنون میں وہ دیوانے اور وحشی ہو رہے تھے وہ سپاہی اور غیر سپاہی میں کوئی تفریق وتمیز نہیں کرتے تھے۔ اور نہ عورتوں اور بچوں کا خیال ولحاظ کرتے تھے۔ کسی مسلمان کو خواہ عورت ہو یا بچہ معاف کرنا ان کے نزدیک ناقابل معافی گناہ تھا۔ اور مفتوحہ علاقوں میں خون کی ندیاں بہانا، شہروں اور کھیتوں کو نذرِ آتش کرنا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ قتل وغارت کے علاوہ قبروں اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اگرچہ عربوں نے ہر طرح کی مذہبی رواداری انصاف، رحمدلی اور دلجوئی کا رویہ اختیار کیا اور اندلس میں غیر مسلموں کی مذہبی عمارتوں اور عبادت گاہوں کی ہر طرح حفاظت وحرمت کی۔ ان کے حقوق اور مذہب کی حفاظت کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ قایم کیا۔ لیکن ان سب باتوں کا ان "دیوانوں اور وحشیوں" پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا۔ عربوں کو ستانے، نیست ونابود کرنے اور مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے ہر ممکن طریقۂ عمل اختیار کیا۔ اس وقت مقابلہ عربوں اور

عیسائیوں کا نہ تھا بلکہ تعصب اور جاہلیت کا تہذیب وتمدن سے معرکہ تھا۔ اور عبدالرحمٰن کے سامنے صرف سلطنت وحکومت، خاندانی شرف وعزت کی حفاظت واستحکام کا ہی دشوار مسئلہ وسوال نہ تھا بلکہ تہذیب وتمدن کی بقاء حیات کا اہم مرحلہ تھا۔ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی کے الفاظ میں "سوال یہ تھا کہ ان وحشی عیسائیوں کے ہاتھوں جو لکھنا پڑھنا تک نہ جانتے تھے۔ عربی تہذیب وتمدن کا جو روزافزوں ترقی پر تھا کیا درجہ ہوگا؟ ان وحشی جاہل عیسائیوں کا یہ حال تھا کہ جب انھیں اپنے کھیتوں کی پیمائش کرنی ہوتی تھی تو کسی مسلمان کو بلوا کر پیمائش کراتے تھے۔ اور جب لفظ "کتب خانہ" بولتے تھے تو ان کی مراد صرف ایک کتاب انجیل سے ہوتی تھی"

ایسے نازک دور میں جبکہ طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا اور اطراف واکناف میں مختلف حکومتیں قایم ہورہی تھیں اور جبکہ بقول ابن الاثیر "اندلس میں چاروں طرف بغاوت ہی بغاوت دکھائی دیتی تھی" امیر قرطبہ کو اگر کسی گروہ سے کچھ مدد اور تعاون کی امید ہوسکتی تھی تو وہ علماء اور فقہا کا گروہ تھا جن کو ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل کے عہد سے سیاست اور امور سلطنت میں خاص درجہ اور دخل حاصل ہوگیا تھا اور حکم اول کی تمام تدبیروں اور کوششوں کے باوجود ان کا اثر واقتدار اب بھی ہمہ گیر تھا عوام کی نظروں میں ان کی بڑی قدر وقیمت تھی۔ اور ایسے تشویشناک دور میں جبکہ اندلس میں اسلامی حکومت کا مستقبل تاریک نظر آتا تھا علماء اور فقہا ہی سے امید کی جاسکتی تھی کہ وہ آفات ومشکلات کا صحیح اندازہ کرکے مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو متحد اور مضبوط بنانے میں حصہ لیں گے اور مسلمانان اندلس کی ڈوبتی ہوئی کشتی حکومت کو سہارا دیں گے لیکن وہ امیر عبداللہ سے اس قدر نالاں اور ناراض ہوگئے تھے کہ انھوں نے

اپنے خطبوں میں اور وعظوں میں حکومت پر لعنت و ملامت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اپنی تہدید آمیز تقریروں سے کہ سلطنت اپنی عمر طبعی کو پہنچکر ختم ہونے والی ہے مسلمانوں کو اور بھی زیادہ پست ہمت بنا دیا تھا اور اس طرح حکومت کا رہا سہا اثر و اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا۔

بنو امیہ اور مسلمانان اندلس کے دیرینہ دشمنوں کے لئے یہ موقع نہایت ہی غنیمت اور بہتر تھا۔ ملک کا اتحاد ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ علامہ ابن خلدون کے الفاظ میں "شر و فساد اور عصیان و بغاوت کی آگ میں جل رہا تھا"۔ عربوں کی قومی عصبیت سسکیاں لے رہی تھی اور سلطنت چھوٹی چھوٹی کمزور مگر خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی جن میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھی کہ وہ لیون کے ظالم، سفاک اور پرجوش عیسائیوں کی ترک و تاز سے اندلس کو محفوظ و مامون رکھ سکے عیسائی اب اسلامی اسپین کو ایک بے دست و پا یا بے بال و پر شکار خیال کرنے لگے تھے جو کبھی بھی ان کے پنجوں سے نہ بچ سکیگا۔ پروفیسر ڈوزی کے الفاظ میں "جنوبی اقطاع اسپین کو جو مسلمانوں کے قبضے میں تھے عیسائیوں نے اس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے قزاق اور لٹیرے مسافر کے مال کو دیکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے پادریوں نے جن کے وہ بے انتہا معتقد تھے یہ سمجھا دیا تھا کہ "آسمانی بادشاہی" میں شریک ہونے کے لئے مسلمانوں سے لڑنے سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں۔ اندلوسیہ یعنی اسپین کے جنوبی علاقے جو بہت دولتمند ہیں اور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں ان کو لوٹنے میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں حاصل ہوں گی"۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کے دینی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں نے حکومت و سلطنت کے زوال اور خاتمہ کی دلخراش پیشینگوئیوں سے حکومت کا رعب

واب بھی ختم کر دیا تھا طوائف الملوکی کی تاریکی اور غم انگیز اداسی سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی اور مقتدایان دینی کے الفاظ میں ہر شخص اس وقت کا منتظر تھا جب "امیر لشکر ابن حفصون بڑی ناک قبیح چہرے والا قرطبہ کے پھاٹکوں کے سامنے آموجود ہوگا اور اس کی (اندلس اور قرطبہ) کی منحوس تقدیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔

مسلمانان اندلس کی عظمت واقتدار کا چراغ بے روغن ہو چکا تھا۔ اور اس کی ٹمٹماتی ہوئی لَو کو خاموش کرنے کے لئے بادِ مخالف کے صرف ایک جھونکے کی ضرورت تھی۔ عرب بربر، مسلمان اور عیسائی سب اس وقت کے منتظر تھے جبکہ قرطبہ کی چوٹیوں پر سے ہلالی علم اُتار کر ابن حفصون کا صلیبی پرچم لہرایا جائے۔ طارق ابن زیاد کے روشن کئے ہوئے چراغ حکومت کو بجھانے کے لئے اس سے بہتر وقت اور موقع نہیں ہو سکتا تھا ہسپانوی عیسائیوں کو موسیٰ ابن نصیر کے ہاتھوں جو ذلت اور شکست اُٹھانی پڑی تھی اس کا بدلہ لینے کا وقت آگیا تھا۔ پشتہا پشت کی سرفروشانہ جد وجہد کے بعد اب انھیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے اور اسپین میں پھر سے عیسائی پرچم گاڑدیں گے بقول پروفیسر ڈوزی اب ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ کیا اسلامی اسپین ان کے پنجہ سے کبھی بچ سکے گا اگر وہ بچ گیا تو پھر عیسائیوں کی تقدیر ہمیشہ کے لئے پھوٹ جائے گی۔

عبدالرحمٰن کی تخت نشینی عین ایسے بحران کے دور میں جبکہ ملک کی اخلاقی اور مالی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی اور ہر طرف لوٹ مار، بدامنی اور بغاوت کا دور دورہ تھا اکتوبر ۹۱۲ء میں امیر عبداللہ کا انتقال ہو گیا اور اکیس (۲۱) سال کی نوعمری میں عبدالرحمٰن سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ملک کی سیاسی واقتصادی حالت دیکھتے ہوئے ایک کم سن اور نوعمر وناتجربہ کار خلیفہ کو تخت پر متمکن دیکھ کر کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسپین کی کایا پلٹ کر دے گا۔ نوجوان امیر

کے تے دولتِ قرطبہ پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی تھی مگر بقول لین پول" ایک بڑا بادشاہ ایک بڑی ضرورت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جب قوم حد درجہ پریشان ہو جاتی ہے جب زمانہ کے سر خط و خال سے خرابی کے آثار ٹپکنے لگتے ہیں اور افق پر بربادی اور نحوست کے آثار دکھائی دیتے ہیں تب ایک بڑا بادشاہ اس لئے آتا ہے کہ اپنی قوم کو ہلاکت سے بچائے۔ امن و خوشحالی پھیلاتے اور ایک ایسے ملک پر حکمرانی کرے جو اس کی کوششوں سے دوبارہ خوش و خرم اور خوش حال بن گیا ہو۔ دسویں صدی کے آغاز میں اندلس کو ایسے حکمراں کی سخت ضرورت معلوم ہوتی تھی"۔

نئے امیر کی خوبیاں | نوجوان عبدالرحمٰن میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو دلوں کو موہ لیتی ہیں ظاہری حسن و دلکشی کے علاوہ وہ باطنی اوصاف سے بھی مزین تھا۔ امیر عبداللہ کو اپنے پوتے سے خاص انسیت اور محبت تھی یتیم شاہزادے کی تربیت اور پرداخت میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی.....

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یورپ کا کوئی ملک اسپین کا ہم پلہ نہ تھا اور قرطبہ تو علوم و فنون کا مرکز و مخزن تھا جس کے علماء و حکماء کا چار دانگ عالم میں شہرہ تھا جن کی تعظیم و تکریم کے لئے خلیفہ تک اٹھ کھڑے ہوتے تھے عبدالرحمٰن کی خوش نصیبی تھی کہ دادا کو اس کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی رہی۔ اپنی سنجیدگی و متانت، زود فہمی و ذہانت سے عبدالرحمٰن نے بہت ہی جلد علماء و اساتذہ کی نظروں میں خاص عزت و وقعت حاصل کر لی تھی۔ اس کے حسن اخلاق، عزم و استقلال رائے اور سیاسی معاملات میں دقت نظر کی بنا پر ارکان سلطنت اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ مروت و سخاوت اور ہمت و بہادری کی وجہ سے وہ عوام میں نہایت ہی مقبول ہو گیا تھا۔ غرض کہ عوام و خواص سب ہی اس کی فہم و شعور اور استقلال و اولوالعزمی

کے قائل و ثناگر تھے - اس کی ہر طبقہ و فرقہ میں انتہائی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عام تاریخی روایات کے خلاف تمام دعویداران سلطنت نے جن میں اس کے چچا اور دوسرے بزرگ بھی شامل تھے نہایت ہی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے اس کو اپنا امیر تسلیم کر لیا صرف یہی نہیں بلکہ بغاوت کو فرو کرنے اور ملک میں امن وامان قائم کرنے میں نہایت ہی خلوص اور عالی حوصلگی سے اس کے ساتھ تعاون بھی کیا اس کی تخت نشینی سے ہی مردہ دلوں میں پھر جان پڑ گئی تھی اور خیر خواہان دولت امیہ کو امید پیدا ہو گئی کہ شاید بنو امیہ کی تقدیر کا پانسہ پلٹ جائے اور عہد رفتہ کی عظمت واقتدار دوبارہ عود کر آئے حالات اور نزاکت زمانہ کے لحاظ سے امیر قرطبہ کی کامیابی کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت تھی حسن اتفاق سے عبدالرحمٰن ان سب صفات سے آراستہ تھا وہ غیر معمولی طور سے بلند نظر، مستقل مزاج، بہادر اور بردبار تھا۔ اس کی فیاضی، کشادہ دلی، اور اخلاق شاہانہ سے لوگ نہایت خوش اور مطمئن تھے اپنی نرم مزاجی اور نیکی کی وجہ سے تخت نشینی سے قبل ہی رعایا کے دلوں کو اس نے مسخر کر لیا تھا اس کی خوبیوں کی بنا پر جو عالم جوانی میں ظاہر ہو چکی تھیں عوام وخواص سب کو امید تھی کہ عبدالرحمٰن کی تخت نشینی سے اندلس کی تاریخ میں ایک نئے دور اور باب کا آغاز ہوگا۔

عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی عبدالرحمٰن کو ایسے مشکلات اور مصائب سے دو چار ہونا پڑا کہ عبدالرحمٰن الداخل کے جانشینوں میں اب تک کسی امیر کو ان سے سابقہ نہ پڑا تھا یہ مشکلات ایسی نہ تھیں کہ ان کی وجہ سے صرف بنو امیہ کا اقتدار ہی معرض خطر میں ہوتا بلکہ اندلس میں عربوں اور اسلام دونوں کی زیست وبقا کا سوال تھا۔ اس کو نہ صرف بغاوتوں اور شورشوں کا قلع قمع کرنا اور بحری لٹیروں اور قزاقوں کو سخت سزائیں دے کر راستوں کو محفوظ کرنا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ خود سر جاگیرداروں اور فرض ناشناس افسروں کی طاقت کو سلب

کر کے ان کی ناشائستہ حرکات اور ظلم و ستم کا انسداد اور پھر انتظام حکومت کو بھی درست کرنا تھا ملک کی اخلاقی اور سیاسی حالت کے علاوہ تجارت کو بھی فروغ دینا تھا اور سب سے بڑھ کر ابن حفصوں کی اس بیس سالہ تحریک بغاوت کو بھی ختم کرنا تھا جس نے بنو امیہ کی حکومت کی جڑوں تک کو ہلا دیا تھا۔

داخلی حکمت عملی | نوجوان امیر کو نہ صرف باغیوں اور شورش انگیزوں کا مقابلہ اور استیصال کرنا تھا بلکہ سب سے اہم اور مشکل مسئلہ عام رعایا کی تالیف قلوب تھی جو امیر عبداللہ کی تلون مزاجی اور بے موقع نرم و گرم پالیسی سے نالاں اور بیزار ہو چکی تھی۔ حکمران کا اصلی سہارا رائے عامہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی بلکہ بقول ہیوم "قوت اور طاقت دراصل محکوموں کے ساتھ ہوتی ہے"۔ عبدالرحمٰن نے فیصلہ کیا کہ جب تک عوام کی تائید اور حمایت اس کو حاصل نہ ہوگی اس کی حکومت کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم نہ ہو سکیں گی اس لئے تخت نشین ہوتے ہی نوجوان امیر نے وہ کام کرنے شروع کیے جن سے عام لوگ گرویدہ اور فرمانبردار ہو جائیں اور ان کی امیر قرطبہ سے منافرت و مخالفت باقی نہ رہے سب سے پہلا کام جو عبدالرحمٰن نے کیا وہ ٹیکسوں اور محصولوں میں کمی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے امیر عبداللہ کی کمزور اور پیچیدہ پالیسی کے بجائے ہمت اور صاف گوئی سے کام لینا شروع کیا عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے اس نے یہ واضح کر دیا کہ "مجھے صرف زبانی وفاداری، ضابطے کے خراج اور رسمی نذرانوں کی ضرورت نہیں بلکہ وہ حقیقی فرمانبرداری کا طالب ہے مجھے خراج کی نہیں قلعوں اور شہروں کی ضرورت ہے جو لوگ اطاعت قبول کریں گے ان کو پوری معافی دی جائیگی جو اکڑیں گے ان کو قابل عبرت سزا ملے گی"۔

پر وہ صرف الفاظ پر ہی قانع نہ رہا بلکہ بہ نفسِ نفیس خود میدان عمل میں آیا اور باغی علاقوں

کی تسخیر کے لئے فوج کشی کی چونکہ اس کی لیاقت و قابلیت، ہمت و بہادری، انصاف اور رعایا پروری کا شہرہ عام ہو چکا تھا اس لیے باغی شہروں اور سرکش سرداروں نے بلا کسی مزاحمت کے امیر کی اطاعت قبول کر لی اور امان وعفو کے طالب ہوئے۔

باغی علاقوں کا سکون | سیفت کرنے والے شہروں میں الیبی جا۔ جین۔ آرجی ڈونا اور الوپرا خاص طور سے ممتاز تھے۔ کیونکہ انہی بڑے بڑے شہروں کی نمک حرامی سے تمام سلطنت میں آفت برپا ہو رہی تھی"۔ لیکن صوبجات الوپرا اور جین کے باغیوں نے اپنی بہادری اور کوہستانی علاقوں و قلعوں کے زعم میں امیر کے اعلان کی پرواہ نہ کی۔ ان کو یہ خیال اور یقین تھا کہ ان کے قلعے ناقابل تسخیر ہیں۔ سیرا نیواڈا۔ اور سیرافیاڈی رونڈا کے کوہستانی علاقوں میں شاہی افواج اور علم دیکھے ہوئے لوگوں کو ایک مدت ہو گئی تھی۔ اور حکومت کا رعب خاک میں مل چکا تھا ان کوہستانی علاقوں کی تسخیر میں عبد الرحمٰن نے اپنی بیدار مغزی اور سیاسی تدبر کے ساتھ ساتھ جرأت و استقلال کا بھی ثبوت دیا حکومت کا اقتدار از سر نو قایم کرنے کے لئے آزمودہ اور وفادار فوج مفتوحہ علاقوں میں تعینات کی۔ اور عادل و منصف حاکم مقرر کیے جو بلا امتیاز مذہب و ملت اور بغیر کسی رو رعایت کے اپنے فرائض انجام دیتے عوام کے لیے عام معافی کا اعلان کیا گیا امیر کے مربیانہ اور منصفانہ طرز عمل نے عوام کو اس کا گرویدہ بنا دیا اور وہ سرکش باغی جو امیر عبد اللہ کی جابرانہ پالیسی کی وجہ سے آخری قطرۂ خون تک مقابلہ و مقاتلہ کے لیے تیار تھے عبد الرحمٰن کی اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے اس طرح اس کی فیاضی۔ فراخدلی اور بردباری کی وجہ سے صرف تین ماہ کی مختصر مدت میں الوپرا اور جین کے صوبوں میں اس کی حکومت دوبارہ قایم ہو گئی۔ ایک عقلمند، سیاست داں اور روشن دماغ حکمراں کی طرح عبد الرحمٰن نے صرف باغیوں کو کچلنے اور بغاوت فرو کرنے پر ہی اکتفا نہ کی

بلکہ وہ صحیح معنوں میں نظام حکومت کی اصلاح، استواری اور دولت قرطبہ کے زائل شدہ وقار کو دوبارہ قایم کرنے کا متمنی تھا۔ امیر عبداللہ کی طرح وہ سرداروں اور امیروں کی چاپلوسی اور وفاداری کے بلند آہنگ زبانی وعدوں سے مطمئن نہ تھا بلکہ عبدالرحمٰن الداخل کی طرح اس کی خواہش اور کوشش تھی کہ سارے ملک میں امیر قرطبہ کی حکمرانی اور فرمانروائی ہو تمام سردار اور جاگیردار جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا کرتے اور امن عامہ میں خلل ڈالتے رہتے تھے امیر کے قابو میں رہیں اور ان کی یہ مجال نہ ہو کہ وہ احکام سلطانی سے سرتابی کریں۔ یہ کام نہایت اہم اور مشکل تھا تاہم جس استقلال و تدبر سے عبدالرحمٰن نے امرا و افسران کی اصلاح کی وہ اپنی آپ مثال ہے، چنانچہ جس خوش اسلوبی اور شاہانہ استقلال سے عبدالرحمٰن نے محمد بن ابراہیم کی ناشائستہ حرکتوں پر صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کی خودسری کا علاج کیا اس سے ہمیں اس کے حیرت انگیز تحمل و تدبر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرطبہ سے قرمونہ جاتے ہوئے محمد بن ابراہیم نے کچھ لوگوں کے مویشی پکڑ لیئے اور اس طرح اس نے امیر سے اپنی بددلی اور ناخوشی کا اظہار کیا کہ اشبیلیہ کی فتح کے بعد اس کو وہاں کا گورنر کیوں نہ بنایا گیا رپورٹ ملنے پر عبدالرحمٰن نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہلایا کہ "اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قلعوں کے مالک رعایا کا مال لوٹ لیا کرتے تھے۔ اور کوئی ان کا کچھ نہ کر سکتا تھا تم پر فرض ہے کہ جس جس کے مویشی تم نے پکڑے ہیں ان کو واپس کر دو"۔ بات سمجھ میں آ گئی اور محمد بن ابراہیم نے امیر کی ہدایت کے مطابق واپس کر کے معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد خودسری کا سودا پھر سمایا عبدالرحمٰن نے اشبیلیہ کی دیواروں کو منہدم کرا دیا تھا تاکہ آئندہ پھر کسی حاکم کو بغاوت اور سرکشی کا خیال بھی نہ پیدا ہو محمد بن ابراہیم نے خیال کیا کہ اپنی طاقت بڑھانے اور امیر سے انتقام لینے کے لیے اس سے

اچھا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا اور اشبیلیہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کی مگر شکست کھائی۔ در گذر سے کام لیتے ہوئے عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے صاحب الشرطہ قاسم بن ولید کلبی کو جو محمد بن ابراہیم کا دوست تھا اس کو سمجھانے کے لئے بھیجا "دیکھو تم کو پھر متنبہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے خیالات پرانی قسم کے ہیں۔ اب بھی ان سے پرہیز کرو زمانہ بدل چکا ہے"۔ قاسم نہایت ہی ہوشیار اور ہوشمند آدمی تھا اس نے محمد بن ابراہیم کو امیر کی اطاعت اور قرطبہ میں حاضر خدمت ہونے کے لئے راضی کر لیا۔ فراخدلی اور عالی حوصلگی سے کام لیتے ہوئے امیر نے بھی اس کا نہایت ہی خوشدلی سے استقبال کیا اور حاجب کبیر کا خطاب دیکر اپنا وزیر بنایا۔

عبدالرحمٰن کی دوربیں اور نکتہ رس نگاہ نے اس بات کا شروع ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر تحریکِ بغاوت کو فی الواقع کچلنا ہے تو یہ اشد ضروری ہے کہ ریہ کے وسیع زرخیز اور کثیر المحاصل علاقہ کو اپنے قبضہ و اقتدار میں لائے صرف ان شہروں کے فتح کرنے اور ان سرداروں کو مغلوب کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو باغیوں کی ریشہ دوانیوں اور چالوں کے زیر اثر امیر کے خلاف حصہ لیتے اور سازشوں اور شورشوں میں تھے۔ اگر ریہ کے سرکش باغیوں کا قرار واقعی انتظام ہو جائے تو ملک میں شورش اور فتنہ و فساد کا سلسلہ آپ ختم ہو جائے گا۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ ریہ کو تسخیر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ اول تو علاقہ پہاڑی اور دشوار گذار تھا اور پھر مقابلہ خالص اور پر جوش عیسائی آبادی سے تھا جن کو حب الوطنی کے ساتھ ساتھ مذہبی حمیت و جوش بھی امیر کی مخالفت پر ابھار رہا تھا مگر کوہستان ریہ کی تسخیر میں عبدالرحمٰن کو اس کی مستقل مزاجی، حسن اخلاق اور عدل و انصاف کی شہرت سے بہت آسانی اور سہولت ہوئی۔ عرب اور عیسائی تمام مورخین

اس بات پر متفق ہیں کہ امیر عبدالرحمٰن مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بالکل بری تھا۔ اس کی قلمرو میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کیا جاتا اور وہ خود عیسائیوں کے ساتھ فراخدلی اور فیاضی سے پیش آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی سرداروں نے بھی بغیر کسی خاص مخالفت اور مزاحمت کے ہتھیار ڈالدیئے۔ اور امیر کے مربیانہ و منصفانہ طرز عمل پر اعتماد کرتے ہوئے اطاعت قبول کر لی صرف قلعہ طوشن پر محاصرہ و جنگ کی نوبت آئی کیونکہ ابن حفصون وہاں خود موجود تھا لیکن عبدالرحمٰن کی مستقل مزاجی اور جرأت سے مجبور ہو کر ابن حفصون کو قلعہ چھوڑ کر جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔

ملک میں انقلاب | امیر عبدالرحمٰن کی خوش قسمتی سے ملک میں ایک نیا انقلاب شروع ہو چکا تھا سرکش اور شر پسند عرب امیروں کا اب کوئی قابل اور بیدار مغز لیڈر نہ تھا۔ سعید بن جودی کریب بن خلدون اور ابراہیم بن حجاج کی وفات کے بعد امراء و رؤساء عرب کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔ بدامنی و طوائف الملوکی سے عوام تنگ آچکے تھے۔ بتیس (۳۲) برس کی مسلسل مجنونانہ خانہ جنگی اور لوٹ مار کی وجہ سے کافی علاقہ ویران اور تباہ ہو چکا تھا لہلہاتے ہوئے کھیت اور باغات کی جگہ ملک میں نکبت و ادبار کا دور دورہ تھا تجارت ختم ہو رہی تھی اور تہذیب و تمدن کے برکات یکسر مفقود تھے تباہ کن خانہ جنگی کے باوجود مالی دماغی نقصان فصلوں کی تباہی اور زرخیز علاقوں کی بربادی کے علاوہ انہیں اور کچھ ثمرہ یا نتیجہ حاصل نہ ہوا تھا اندلس میں عربوں کا اقتدار پہلے کی طرح قائم برقرار تھا ملکی آزادی اور قومی حکومت کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر تھا اور مستقبل قریب میں بھی پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا ابن حفصون اور اس کے پرجوش عیسائی رفقاء کی تبلیغی کوششوں، مسلمان سرداروں سے بے اعتنائی و تغافل کے برتاؤ، مسجدوں کی بے حرمتی اور ان کی جگہ گرجاؤں کی تعمیر۔ ابن حفصون کے دربار میں راہبوں کا عروج و اقتدار، ان سب باتوں نے اپنے مسلمانوں کو برگشتہ کر دیا۔

(باقی آئندہ)

ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی

(از جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

نام | مرزا عبد اللہ نام تھا۔ ارباب خاندان عالی گہر سے خطاب کرتے تھے عزیز الدین عالمگیر ثانی کے خلف اور معز الدین جہاں دار شاہ کے پوتے تھے ماں کا نام لال کنور تھا بادشاہ ہوکر ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی لقب اختیار کیا[1] والدہ کا سایہ بہت کم عمری میں سر سے اٹھ گیا تو سوتیلی والدہ نواب زینت محل نے سگی ماں سے بڑھ کر پرورش کی[2] ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۳۹ھ کو پیدا ہوئے تھے۔

تعلیم و تربیت | علم سے طبعی لگاؤ تھا عربی، ترکی، فارسی، سنسکرت[3]، ہندی میں استعداد معقول بہم پہنچائی خطاطی میں بھی درک تھا تصوف سے تعلق رکھتے تھے سید محمد مراد درویش کے مرید ہوئے مولانا فخر الدین سے بھی افادہ کرتے رہتے تھے تھوڑا بہت موسیقی میں بھی دخل تھا۔

ولیعہدی | علی گہر کو عالمگیر ثانی نے ولیعہد قرار دے لیا تھا عماد الملک غازی الدین کے فتنہ سے ولی عہد کو بچانے کے لئے جھجر اور ہانسی کے پرگنے جاگیر میں دے کر دہلی سے چلے جانے کی اجازت دے دی[4]

عالی گہر تال کٹورے پہنچ کر سلطنت کو وزیر عماد الملک کے دست تظلم سے نجات دینے کے لئے فوج بھرتی کرنی شروع کردی اس خبر نے وزیر کو متفکر کر دیا اور اس

[1] واقعات عالم شاہی [2] شاہ عالم نامہ صفحہ ۱۵ [3] مجموعہ نغز [4] نادرات شاہی صفحہ ۲۰

نے زبردستی سے بادشاہ سے شفقے بھجوائے علی گوہر باب کے بلانے پر دہلی گئے مگر جمنا کے کنارے علی مردان خاں کی حویلی میں قیام کیا عماد الملک نے بدعہدی کی اور ولی عہد کے مسکن کو محاصرہ میں لے لیا بہ دقت عیاپار ہو کر ہانسی حصار پہنچے وہاں سے نواب نجیب الدولہ کی دعوت پر گنجپورے کے راستے میراں پور پہنچے نواب نے ولی عہد بہادر کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پچاس ہزار روپے ماہوار اخراجات کے لئے نذر کرنا شروع کئے نجیب الدولہ نے بہت ہاتھ پیر مارے روہیلوں کو تیار کیا جاٹوں سے مدد لینا چاہی کہ ولی عہد کو سامنے رکھ کر عماد الملک سے اپنا انتقام لے ایک سال تک علی گہر ان کے پاس مقیم رہے آخر جب یہاں کوئی صورت بنتے ہوئے نہ دیکھی لکھنؤ روانہ ہو گئے ۹ رجمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو شجاع الدولہ نے شایان شان استقبال کیا۔ اور ہاتھی گھوڑے خیمے ڈیرے سارا امارت کا سامان مہیا کر کے پچاس ہزار روپیہ کی نذر پیش کی اور اپنے پاس رکھا۔

بنگال کا قضیہ | بنگال میں نواب سراج الدولہ کی جگہ انگریزوں نے میر جعفر کو ناظم بنا دیا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن نظامت کو گذرے تھے کہ سارا ملک اس کے ہاتھوں تنگ آگیا۔ محمد قلی خاں الہ آباد کے صوبہ دار نے اس موقعہ سے یہ فائدہ اُٹھانا چاہا بنگال پر خود قبضہ کرے چنانچہ ولی عہد کی تاک میں تھا نجیب الدولہ کے قیام کے دوران میں خطوط بھیجے تھے کہ آپ الہ آباد آجائیے چنانچہ علی گہر اور شجاع الدولہ میں مشورہ ہوتے اور الہ آباد پہنچے۔ یہاں محمد قلی خاں نے لشکر تیار کر رکھا تھا۔ ۷ رجب ۱۱۷۳ھ کو ولی عہد بہادر بنگال کی فتح کے لئے روانہ ہو گئے "کرم ناسا" ندی کو پار کیا۔ ابتدائی لڑائیوں میں ان کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن انگریزوں کی فوج کی آمد کی خبر نے محمد قلی خاں کو دل برداشتہ کر دیا عالی گہر اس سے بے خبر تھا کہ میر الظ ناظم در حقیقت اب جعفر سے نہیں ہے بلکہ ایک نئی اور بالکل اجنبی قوم سے ہے جس کی قوت عقلی اور حکمت

قوت کا کبھی اندازہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس غلط فہمی کے باعث جب شاہی لشکر اور جعفر کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو موقعہ کی نزاکت دیکھ کر عالی گہر نے محاصرہ اٹھالیا اور ۲۵ ذیقعدہ ۱۱۷۵ھ کو دیوان مکند پور میں فروکش ہوگئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

انگریزی اقتدار | فرخ سیر کے عہد میں جیسا کہ بیشتر لکھا جا چکا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگالہ میں اڑتیس گاؤں کی زمینداری خریدنے کی پروانگی مل چکی تھی اور کلکتہ کے پریسیڈنٹ کی دستک سے جو مال روانہ ہوا کرتا تھا محصول کی غرض سے اس کی تلاش موقوف ہو چکی تھی اس کے بعد سے ارباب کمپنی نے مال منگوانا اور بلا محصول روانہ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اس کے سازشی طور پر غیروں کا مال بھی اپنی دستک سے بھیجنے لگے اس حرکت سے ناظم بنگالہ کی آمدنی میں نقصان کثیر واقع ہوا اس نے ناراض ہو کر زمینداروں کو اشارہ کر دیا کہ کوئی شخص انگریزوں کے ہاتھ زمینداری فروخت نہ کرے اس وجہ سے ایک عرصہ تک انگریزوں کو اپنی ذہنی مطلب براری میں ناکامی رہی جبکہ نواب الہ وردی خاں ناظم بنگالہ نے قضا کی اور لسبب نہ ہونے اولاد ذکور کے اس کے بھتیجے کا بیٹا نواب سراج الدولہ ۱۸ برس کی عمر میں ناظم قرار پایا تو اُس سے اور انگریزوں سے اس بنا پر بگڑی کہ اُس کے چچا کا دیوان اُس سے ٹوٹ کر انگریزوں سے جاملا اور جب سراج الدولہ نے مانگا تو واپس نہ ملنے پر جنگ چھڑ گئی انگریزوں کو شکست ہوئی بہت سے مارے گئے مدراس میں بھی انگریزی اقتدار بڑھ رہا تھا وہاں سے کمک آئی مگر انگریزی فوج کے ساتھ نواب کرناٹک کی فوج بھی تھی غرض پھر بھی سراج الدولہ نے انگریزوں کو شکست دی مگر سراج الدولہ کی فوج کے آدمی اس قدر مارے گئے کہ فتح کی خوشی میسر نہ آئی بعد اس کے ان شرائط پر صلح ہوئی کہ موافق عہد نامہ شاہی کے انگریز اڑتیس گاؤں کی زمینداری

لہ شاہ عالم نامہ عہ انوار الدین نامہ

خریدیں اور مال بھی اپنی دستک سے روانہ کریں گر وہ مال صرف اپنا ہی مال ہو۔ چند روز گذرے تھے کہ اور سازش شروع ہوئی الہ وردی خاں کا داماد میر جعفر خاں معہ دیوان رائے دلبھ رائے اور جگت سیٹھ مہتاب رائے کے انگریزوں سے مل گیا انگریزوں نے اس کو ناظم بنگالہ بنا دینے کے وعدہ پر اُس سے ایک خفیہ عہدنامہ کرا لیا جس میں سراج الدولہ کے عہدنامہ پر اس قدر اور اضافہ کیا گیا کہ

کلکتہ سے دکن جھلپی تک کمپنی کی زمینداری سمجھی جائے فرانسیسی بنگال سے نکال دے جائیں اور دو کروڑ پینتیس لاکھ روپیہ بطور نقصان کے کمپنی کو دیا جائے۔"

اس عہدنامہ کی سراج الدولہ کو خبر نہ ہوئی اور وہ جعفر سے دل میں صاف رہا اس عرصہ میں انگریزوں نے پھر جنگ شروع کی مگر جب عین لڑائی میں جعفر کی بیوفائی کھلی تو سراج الدولہ کے ہوش جاتے رہے اور ساتھ ہی اُس کے پیر اُکھڑ گئے۔ اس شکست میں سراج الدولہ کو ناکامیابی ہوئی اور وہ ختم کر دیا گیا اس کے بعد سے انگریزوں کے قدم بالکل جم گئے اور حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔

میر جعفر کے ایک بیٹا تھا جو اسی زمانہ میں بجلی گرنے سے مر گیا اب جعفر کے داماد قاسم علی خاں نے وہ کارروائی شروع کی جو سراج الدولہ کے خلاف اس کے خسر میر جعفر نے کی تھی انگریزوں سے اندر ہی اندر سازشیں ہونے لگیں اور وہی پرانا طریقہ کام میں لایا گیا کہ عہدنامہ سابق پر پچیس لاکھ روپیہ نقد اور بردوان ۔ میدنی پور اور چٹ گاؤں کی زمینداری کا اضافہ کرنے کے بعد انگریز جعفر کو چھوڑ کے قاسم کے معاون و مددگار بن گئے اس میں لارڈ کلائیو کی کارفرمائی کو بڑا دخل ہے ۔ جعفر کو اصل حال سے خبر نہ تھی قاسم کی نظر پھری دیکھ کر انگریزوں کے پاس مشورہ لینے گیا ۔ وہاں جعفر تو قید کر لیا گیا

اور قاسم علی خان ناظم بنگالہ مشتہر کردیا گیا میر قاسم نے اپنے عہد حکومت میں عہد نامہ کی تمام دفعات پر عمل کیا مگر کمپنی کی ضرورتیں دن بدن بڑھ رہی تھیں۔

عالی گہر کی تخت نشینی | عالی گہر نے ۲ محرم ۱۱۷۳ھ کو دوبارہ بہار کی طرف رخ کیا سون دریا کو عبور کر کے کھتولی میں قیام کیا ۴ ماہ بعد دہلی سے خبر ملی کہ عماد الملک نے ۸ ربیع الاول ۱۱۷۳ھ کو عالمگیر ثانی کو شہید کر دیا[1]۔

دولت خواہوں کے مشورہ سے ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو عالی گہر نے کھتولی میں شاہ عالم کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

تاریخ جلوس

زہے شاہ عالی گہر عدل گستر | بادتاج و تخت دنگیں شد مسلم
برون آر سال جلوس ہمایوں | ز سلطان ہندوستان شاہ عالم[2]

(اولاد علی ذکا)

نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کو خیر خواہی کے صلے میں پہلے کو امیر الامرائی اور دوسرے کو وزارت کا خلعت ارسال کیا اور منیر الدولہ کو احمد شاہ ابدالی کے دربار میں سفیر کر کے بھیجا[3]۔

رسومات جشن جلوس سے فراغت پا کر لشکر نے حرکت کی رام نرائن نے آگے بڑھ کر نا کہ روکا مگر اس کو شکست اٹھانا پڑی اور زخمی ہو کر پٹنہ میں محصور ہونا پڑا۔ بادشاہی فوج نے پٹنے کا محاصرہ کر لیا۔

کمپنی نے اپنی فوج راجہ کی مدد کے لئے بھیجی سال بھر تک جھڑپیں رہیں آخر میں

---

[1] شاہ عالم نامہ صفحہ ۹۰ [2] مفتاح التواریخ ص ۳۴۴ [3] شاہ عالم نامہ

کامیابی انگریزوں کو ہوئی جمادی الاخر ۱۱۷۴ھ میں بادشاہ نے موسیو لا فرانسیسی کی معاونت سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور بڑے کشت و خوں کے بعد اپنے کو انگریزوں کے حوالے کر دیا انگریز سردار انھیں لے کر پٹنے چلے آئے اور قلعہ میں ٹھہرایا۔[1]

بادشاہ پھر جنگ کی تیاری کر رہے تھے ۱۰ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ کو میر جعفر کا داماد میر قاسم جو بنگال کا ناظم مقرر ہو چکا تھا وہ بادشاہ کے پاس پٹنہ آیا اور چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر بادشاہ سے نظامت کی سند حاصل کر لی۔

مگر انگریزوں نے اپنی دستک سے اپنا اور گماشتوں اور دیگر قوم کے تاجروں کا مال روانہ کرنا شروع کر دیا جس سے قاسم کی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ برباد ہونے لگا پہلے تو اس نے انگریزوں سے شکایت کی مگر جب کسی نے نہ سنی تو اس نے سرے سے اس محصول ہی کے بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ جب تمام اقوام کے تجار کو محصول کی معافی ہو گئی تو انگریزوں کی دوسروں سے اندرونی طور پر محصول وصول کرنے والی دست بردجاتی رہی میر قاسم علی کو بے رخی سے دیکھا اور دھمکایا کہ بجز ہماری قوم کے دوسری قوموں پر محصول معاف نہ ہونے پائے۔

الہ آباد کا قیام | منیر الدولہ احمد شاہ درانی کے پاس سے واپس آیا اور سلطنت کی بحالی کا مژدہ سنایا۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ نے استدعا کی الہ آباد آکر مقیم ہوں بادشاہ خود انگریزوں کی نگرانی سے بچنا چاہتے تھے آخر شوال ۱۱۷۴ھ کو پٹنے سے روانہ ہو گئے ۱۲ ذیقعدہ کو شجاع الدولہ استقبال کے لئے حاضر ہوئے۔ شرف قدمبوسی حاصل کیا اور ۵ ذی الحجہ ۱۱۷۴ھ کو الہ آباد لے آئے یہاں شجاع الدولہ ان پر مسلط ہو گیا۔

---

[1] دیباچہ نادرات شاہی

دو ڈھائی سال شجاع الدولہ شاہ عالم کو لئے پھرا مرہٹوں سے بندیل کھنڈ میں مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ ۱۷۶۱ء میں شکست پا گئے۔ بادشاہ وزیر کی ترقی کی بہاریں دیکھ رہے تھے[1] خلعت وزارت شجاع الدولہ کو مرحمت کیا جھانسی کا قلعہ فتح کر کے الہ آباد آ گئے۔

بکسر کی جنگ | میر قاسم کی انگریزوں سے چل گئی تھی ہر دو میں آخرش مقابلہ ہوا شکست پاکر شجاع الدولہ کے پاس الہ آباد آیا۔ وزیر نے بظاہر استعانت اور بباطن بنگال پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے پرچم کے نیچے عظیم الشان لشکر اکٹھا کیا اور بنارس کی طرف انگریزوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے۔

۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء کو بکسر میں قاسم اور شجاع الدولہ کی فوج نے مل کر انگریزوں سے جنگ کی جس میں کثرت سے انگریز کام آئے یہ کمک جو اودھ سے آئی تھی اس میں بسبب اس کے کہ بنارس ماتحت اودھ تھا مہاراجہ بنارس بھی شریک تھا جب موقع جنگ میں انگریزوں کی حالت ابتر ہونے لگی تو انھوں نے مہاراجہ بنارس کو توڑ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے آقا کی فوج میں بے لڑے انگریزوں کو گھس آنے دیا اور یہی جنگ بکسر کی جنگ کے خاتمہ کا باعث ہوئی۔

شجاع الدولہ جان بچا کر نوابان روہیل کھنڈ کی خدمت میں آ گیا یہاں اُن کی بڑی خاطر و مدارات ہوئی۔ اب بادشاہ بے یار و مددگار تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کی حفاظت میں دے دیا۔ اور الہ آباد واپس چلے آئے

"بکسر کی لڑائی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر گئی اب تک انگریز ہندوستان میں تجارت کرتے تھے اس فتح کے بعد تین بڑے صوبوں کے حاکم بن گئے۔

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ ،

شجاع الدولہ اور انگریز | شجاع الدولہ سے پچاس لاکھ اور ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کے دو صوبے الہ آباد اور کوڑہ جہاں آباد شاہ عالم کی جاگیر میں دئے جانے پر صلح کرلی بادشاہ کا قیام الہ آباد میں برقرار رکھا گیا۔

اس عرصہ میں میر قاسم کے بجائے میر جعفر دنیا سے چل بسا انگریزوں نے اس کے بیٹے نجم الدولہ کو مسند نشین کیا

اب گذشتہ عہد ناموں پر اس قدر اور اضافہ کیا گیا کہ نائب صوبہ انگریز کے مشورہ سے مقرر ہوا کرے گا اور بلا اجازت ان کے موقوف نہ ہو سکے گا۔

غرضکہ چند روز تک انگریزوں نے اپنا آوردہ نائب صوبہ بناکر اس جھگڑے کو بھی الگ کیا صرف نجم الدولہ برائے نام ناظم رہے ۲۶ لاکھ سالانہ میر جعفر کی طرف سے شاہ دہلی کو جاتا تھا خود برابر اور بدستور وعدہ پر بہار اڑیسہ بنگال کی دیوانی کا فرمان ۲۴ صفر ۱۱۷۹ھ ۱۷۶۵ء کو حاصل کر کے نظامت کا جھگڑا بھی ختم کر دیا۔

شاہ عالم الہ آباد میں سلطنت کر رہے تھے نگراں انگریز تھے[1] اور اٹھارہ سو روپیہ ماہوار کھانے کے شجاع الدولہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے"۔

سات برس بادشاہ الہ آباد میں رونق افروز رہے۔ امراء نے رنگ رلیوں میں لگا کر جی بہلانے کا سامان مہیا کر دیا

بادشاہ کی دہلی میں تشریف آوری

عیش و عشرت کی بانسری الہ آباد میں بج رہی تھی کچھ دن بعد دل گھبرا گیا دلی جانا چاہتے تھے نجیب الدولہ نے مرہٹوں سے دوآبے کے کچھ ضلع دے کر صلح

---

[1] سیر المتاخرین

کرلی تھی کیونکہ مادھوراؤ پیشوا ۸۰ ہزار فوج سے پانی پت آگیا جواہر سنگھ راجہ بھرت پور مرچکا تھا کچھ دن ہوئے تھے نول سنگھ گدی نشین ہوا تھا اس کو شکست دیتا ہوا ۱۱۸۴ھ میں دہلی آیا ادہر سکھ دوآبے میں لوٹ مچار ہے تھے اس بنا پر نجیب الدولہ نے مرہٹوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے یہ صورت اختیار کی تھی تھوڑا عرصہ نہ گذرا تھا رجب ۱۱۸۴ھ کو نجیب الدولہ انتقال کر گئے مرہٹوں نے پورے ملک پر حکومت کرنے کا پھر منصوبہ باندھا تجویز یہ کہ شاہ عالم کو فی الحال ہاتھ میں لیا جائے اور درخواستیں آنے لگیں کہ آپ اپنی موروثی راج دہانی کو چھوڑے ہوئے کیوں الہ آباد پڑے ہیں ضابطہ خاں خلف نجیب الدولہ مرہٹوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر دہلی چھوڑ اپنے علاقہ کو چلے گئے۔ بادشاہ کے منہ میں پانی بھر آیا انگریزوں اور شجاع الدولہ دونوں کی مرضی کے خلاف دہلی روانہ ہوگئے فرخ آباد آکر مقیم ہوئے یہاں مرہٹہ سردار آکر قدمبوس ہوئے نواب فرخ آباد نے نذرانہ پیش کیا وہ منظور کرتے ہوئے ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ مئی ۱۷۷۲ء کو دہلی میں تشریف فرما ہوئے[1]

نواب ضابطہ خاں | مرہٹوں کی راہ میں ضابطہ خاں ایک زبردست کانٹا تھا سمجھتے تھے یہ روہیلوں کا بڑا سردار بھی ہے لہذا انھوں نے شاہ عالم کو ابھارا کہ ضابطہ خاں پر حملہ کر دینے کی ضرورت ہے بادشاہ ان کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا نہ تو اس کو اس کی پرواہ تھی کہ یہ جماعت حکومت مغلیہ کی درپے ہے اور اس سے زیادہ نجیب الدولہ کے جو احسانات تھے وہ سب بالائے طاق رکھکر شوال ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۲ء میں روہیلوں کے تباہ کرنے کے ارادہ سے اپنی فوج لے کر روانہ ہوگئے اس فوج کشی کا ضابطہ خاں مقابلہ نہ کرسکا سکھرتال میں قلعہ بند ہوا اس کے بعد شجاع الدولہ کی پناہ میں گیا۔ مرہٹوں نے خاندان نجیب الدولہ کے جملہ افراد یہاں تک کہ عورتوں تک کو پکڑ کر قید کیا

[1] وقائع عالم شاہی دا لبسٹ انڈیا کمپنی کا ریکارڈ

مال اسباب لوٹا شاہ عالم اپنے سامنے محذرالت روہیلہ کو ذلیل وخوار ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔[1]
غوث گڈھ کے علاوہ پورا سہارنپور کا علاقہ بادشاہی قبضہ میں چلا گیا بادشاہ ماہ ربیع الاول
۱۱۸۶ھ میں فتح و کامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے شہر میں رونق افروز ہوئے۔[2]

مرہٹہ کامیاب ہوئے مگر انھوں نے مال میں سے بادشاہ کو کچھ حصہ نہ دیا آخر کار
بادشاہ نے کچھ سوچ کر نول سنگھ جاٹ کی سرکوبی کو ان مرہٹوں کو روانہ کیا اور مرزا نجف خاں
ایرانی جو اپنے بھائی روہیلوں کو تباہ و برباد کرنے میں مرہٹوں سے زیادہ بازی لے
گیا تھا اس کو بخشی فوج مقرر کیا مرہٹوں سے نجات کی صورت بادشاہ نے یہ نکالی تھی مرزا
نجف خاں نے مغل فوج کی بھرتی شروع کی مرہٹے تاڑ گئے انھوں نے فوراً ہی ضابطہ خاں
سے ساز باز کر کے معقول تاوان کے بدلے میں امیر الامرائی دلانے کا وعدہ کر لیا[3] کوچ چالوں
کو نظر انداز کر کے دہلی آیا اور بادشاہ سے خواہش کی کہ ضابطہ خاں کو امیر الامرا بنایا جائے
بادشاہ ٹال مٹول کرنے لگے بزور شمشیر مرہٹوں نے ضابطہ خاں[4] کا قصور بھی معاف کرایا اور
جاگیر اور امیر الامرائی بھی دلوائی بادشاہ لاچار تھے اور ان کے اشارے پر چل رہے تھے
۱۱۸۶ھ میں بادشاہ سے الہ آباد اور کوڑہ جہاں آباد کی سند جاگیرداری بھی اپنے حق میں
لکھوالی اس کے بعد مرہٹوں نے ہاتھ پیر نکالے روہیل کھنڈ پر ان کا نزلہ ڈھلا لوٹ مار

---

[1] نخبۃ التواریخ قلمی (ملک بیت المصنف علی گڈھ) [2] جام جہاں نما صفحہ ۷۰، ج ۲

[3] ضابطہ خاں بہادر جری بہادر شخص تھا مگر بادشاہ کی تلون مزاجی اور امرائے سلطنت کے ساز باز سے وہ حکومت مغلیہ کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوا اپنے والد کے ہم خیال ہوتے ہوئے اس نے چاہا پھر مرہٹہ اقتدار نہ بڑھے مگر اس کی تدابیر بر دئے کار نہ آئیں ذی علم اور اہل اللہ کا گرویدہ تھا حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان کی خدمت ہر طرح سے کرتا رہتا تھا اور حضرت شاہ فخر الدین دہلوی کا معتقد ہی نہیں بلکہ عہد خاص سے تھا مناقب فخریہ میں ہے کہ

اور در حسن اعتقاد مردے بود بے نظیر در سعادت ازلی یکتائے روزگار بود[4] [4] مناقب فخریہ صفحہ ۴۳

غارتگری کا بازار گرم ہوگیا۔ یکایک نارائن راؤ پیشوا کے مرنے کی خبر نے مرہٹوں کو فکر مند کر دیا وہ روہیلوں سے صلح کرکے دکن جانے کو ہوئے بادشاہ سے من مانی شرائط منوا کر دکن گئے۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں ایرانی | مرزا نجف خاں کے دن پھرے یہ ایران سے آکر محمد قلی خاں صوبہ دار الٰہ آباد کا ملازم رہا اس کے بعد میر قاسم کا متوسل بنا منیر الدولہ کے توسط سے الٰہ آباد میں شاہی ملازمت اختیار کرکے دہلی چلا آیا اس نے اپنی بہادری اور تدبر سے ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں بہادر غالب جنگ خطاب حاصل کیا۔[۱]

پہلے جاٹوں کا زور توڑا پھر بادشاہ کی صب پر ضابطہ خاں کے مقابلہ کو آیا سکھوں اور روہیلوں کے متحدہ لشکر سے خونریز جنگ کرکے ۹ رمضان ۱۱۹۰ھ کو نواب ضابطہ خاں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔

بادشاہ نے مرزا نجف خاں کو روہیلوں کی مذکورہ لڑائی تباہی و بربادی کے صلہ میں امیر الامرا اور نائب وزارت کے عہدہ پر سرفراز کیا۔ اب نجف خاں نے ہاتھ پیر نکالے ایران سے لوگوں کی آمد شروع ہونے لگی دلی میں چند دنوں کے عرصہ میں ایرانی ایرانی نظر آنے لگے۔ اپنے مسلک کی ترویج عام کر دی دھیرے دھیرے اسلامی شعائر مٹنے لگے نئے نئے مشغلے شروع ہوگئے بے غیرتی بڑھی ہوئی تھی۔

قوم کی حمیت و غیرت نے دوسری کمزور اقوام کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ سکھوں

---

[۱] مرزا نجف خاں شجاع الدولہ کا رشتہ دار تھا اس نے اپنا نائب وزیر مقرر کرکے بادشاہ کے پاس بھیجا انگریزوں نے بھی اس کی سفارش کی کیونکہ وہ انگریزوں کا ہمنوا مرہٹوں اور روہیلوں کا دشمن تھا۔[۲] ادھر اس کو جاٹوں کی خودسری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ [۲] تاریخ ہندوستان جلد ۹ صفحہ ۳۲۴

لے کر لاہور تک قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ شاہ عالم نے پھر زور باندھا اور دوآبے سے
نے مجدالدولہ کو ان کے مقابلہ پر بھیجا وہ شکست کھا کر دلی بھاگ آیا۔ مرزا نجف خاں آگرہ تھا
بادشاہ نے اُسے دلی بلایا (۱۱۹۳ھ مجدالدولہ گرفتار ہوا اور اُس کی خدمات مرزا نجف خاں
کے سپرد ہوئیں)۔

مرزا نجف خاں جہاں اپنوں کے لئے متعصب تھا وہاں شجاع اور بہادر بھی تھا
اُس نے سکھوں کی تنبیہہ کے لئے ایک لشکر روانہ کیا ۱۱۹۵ھ میرٹھ میں دونوں لشکروں
کا مقابلہ ہوا۔ شاہی لشکر جیت گیا سکھوں کا سردار ۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ کھیت رہا
پھر سے لاہور تک کا کل علاقہ مغل حکومت کا مطیع ہوا اور پھر نئے سرے سے سکہ بیٹھ گیا
چنانچہ مرزا ۱۷۸۰ء میں روہیلکھنڈ کی مہمات میں مصروف رہا اس نے اکبر آباد
کا قلعہ جاٹوں سے لے کر محمد بیگ ہمدانی کے سپرد کیا جاٹوں کے راجہ رنجیت سنگھ کو اس
کا بڑا داغ تھا اُس نے دس ہزار فوج جمع کی اور سکندرہ تک آ پہنچا دلی میں اس وقت
صرف پانچ ہزار سوار اور دو پلٹنیں سپاہیوں کی تھیں جن سے اُس کی تدبیر ہوئی۔
شکست کھا کر واپس گیا پھر بیگم سمرو فرانسیسی کو ساتھ لے کر آیا مرزا روہیلکھنڈ
سے آگیا تھا وہ ۱۷۸۰ء میں سرکوبی کو روانہ ہو گیا۔ کہریانہ سے سردار نجف قلی خاں دس
ہزار سپاہ سے آگیا یہاں دلی میں مجدالدولہ عبدالاحد خاں فتنہ اٹھا رہا تھا کہ آصف الدولہ
نواب وزیر کا وکیل لطافت خاں پانچ ہزار سپاہ سے پہنچ گیا اُس نے مجدالدولہ کی
تدبیر میں چلنے نہ دی مرزا نجف خاں ہوڈل میں پہنچا وہاں سے جاٹوں کو رگیدتا ہوا ڈیگ
تک گیا۔ سمرو نے بھی زور لگایا مگر مرزا کی شجاعت سے منہ کی کھائی قلعہ ڈیگ ۱۷۷۶ء میں
مرزا کے ہاتھ آیا چند لاکھ روپیہ نقد اور بہت کچھ آگرہ کی لوٹ کا مال ملا۔ جاٹ بے سر

بھاگ کے کھیر کے قلعہ میں پناہ لی۔ اب جاٹوں کے پاس صرف تین قلعہ رہ گئے تھے بھرت پور کی راج گدی نجف خاں نے کیونکہ رانی نے اس کو بھائی کہا تھا اس بنا پر اس کے لڑکے کو عطا کی اور تمام جاٹوں کی بستیوں میں داد و دہش سے اسلام پھیلایا لطف یہ ہے کہ وہ بیشتر سادات کے زمرہ میں شمار کئے جانے لگے[1]۔ وہاں سے لوٹ کر دلی آیا

مرزا نجف خاں کی موت | اس بہادر نے ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا اس کے بعد سے حکومت کا بالکل شیرازہ بکھر گیا امرا میں پھوٹ پڑ گئی مرزا کے متوسلین میں سے محمد شفیع خاں اور افراسیاب خاں میں امیر الامرائی کی رسہ کشی ہونے لگی یکے بعد دیگرے امیر الامرا ہوئے۔ اس اثنا میں مرزا جواں بخت ولی عہد نے جو رنگ امرا کی چپقلش کا دیکھا خود اس نے چند امرا کو موافق کر کے بادشاہ کو ان کے پھندے سے نکالنا چاہا اور امیر الامرا بن کر انتظام سلطنت کرنے لگا بادشاہ سلامت شکرانے کی نماز دوگانہ ادا کرنے جامع مسجد گئے خیرات و مبرات بہت کی گئی مگر محمد شفیع اور افراسیاب خاں یہ دونوں میل کر گئے بادشاہ پھر ان کے قبضہ میں آکر شاہ شطرنج بن گیا۔ ولی عہد کو جان بچانا مشکل پڑ گئی۔ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۸ھ کو طوفانی شب میں دہلی سے راہ فرار اختیار کی رام پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے[2]

مادھوجی سندھیا | مادھوجی سندھیا اور مرزا شفیع خاں امیر الامراء میں خفیہ معاہدہ ہو چکے تھے کہ وہ دلی پر اقتدار قایم کرے اور امیر الامراء نے پورے طور پر مدد دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ سندھیا ایک بڑی فوج لے کر جمبل کے شمال ہی میں پہنچا تھا کہ اس نے شفیع کی موت کی خبر سنی۔ سندھیا نے دلی دربار میں خطوط بھیجے جس میں اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ شاہی

[1] تاریخ بھرت پور از مولوی رحیم بخش جج پوری قلمی [2] وقائع عالم شاہی۔

خاندان کی شان و شوکت کو از سر نو قایم کرنا چاہتا ہے جو ایک چال پر مبنی تھی اور یہ صورت اپنی ریاست سے قریب میں رکھنے کی پیش کی کہ شاہ عالم معہ اپنے دربار کے چلے آئیں جہاں وہ سلطنت کے کاروبار کو مختلف جماعتوں کے اطمینان کے مطابق طے کر سکیں اور اس نے امیر الامرا افراسیاب خاں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ افراسیاب نے بلا سوچے سمجھے سندھیا کا آلہ کار بن کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اس کی موافقت میں بادشاہ کی رائے کو مائل کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی شاہ عالم آگرہ جانے پر راضی ہو گئے اور روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں ادھر مادھو سندھیا بڑھتا ہوا دلی تک آ گیا اور افراسیاب کو مشورہ کے لئے بلایا اور خیمہ میں دھوکے سے قتل کرا دیا۔

مادھو سندھیا کا اقتدار | بادشاہ نے پیشوا کو وکیل مطلق کیا اور مادھو کو الیبری کو نائب کا منصب مرحمت کیا مادھو جی نے بادشاہ کی کمزوری اور مسلمان امرا کی باہمی شکر رنجیوں سے فائدہ اٹھا کر آگرہ سے دہلی تک کے علاقہ پر قبضہ کیا اور بادشاہ کی ۶۵ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور تمام امرا کی جاگیریں ضبطی میں لائی گئیں یہ دن تھا جس دن مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہوا بادشاہ مرہٹہ ریاست کے تنخواہ دار کی حیثیت سے براج رہے تھے اور مادھو کے مناقب فرما رہے تھے سہ

ملک و مال سب کھوئے کر پڑے تمہارے بس   مادھوا ایسی کیجیو آدے تم کو جس

مسلمانوں میں حکومت کے اس ناگوار واقعہ نے غم و غصہ کی ایک لہر پیدا کر دی اتفاقیہ راجہ پرتاب سنگھو والی جے نگر بر سر پرخاش ہوا اس سے لڑنے مادھو سندھیا گیا عین موقعہ جنگ میں اس کے سرداروں نے سندھیا کو دھوکا دیا اور اس کو شکست اٹھانا پڑی اور گوالیار کا رستہ لیا[1]

---

[1] تاریخ ہندوستان ۹ : ۲۲۱، ۲۲۴   (باقی آئندہ)

ادبیات

اشک

از جناب میر ناصر شرفی صاحب تہران

رفتم آں لالہ روئے دیدم باز   قصۂ عشق خود بیاں کردم
اشکہائے ز درد سوز و گداز   از سر ہر مژہ رواں کردم

گفتمش اے گل سفید چمن   بر من زار رحم خواہی کرد؟
یا چو زیبا رخان غنچہ دہن   سوئے عاشق کنی نگاہ سرد

ہمہ ایں نالہ ہائے محزونم   حاصل از درد ہائے داغ من است
ایں دل بے قرار پرخونم   شعلۂ آتش چراغ من است

نگہم بر نگاہ او افتاد   خویشتن را در آسماں دیدم
رفتم از دست ناگہاں آہ داد   پرتوے از خدا در آں دیدم

گفتمش دیدہ خوں شد از رویت — از گلِ روئے خود خبر داری؟
دلِ من خاک شد سرِ کویت — بسرِ کوئے خود گذر داری؟

گفت غم را بجانِ من رہ نیست — از دو دیدہ گہر نمی بارم
دلم از سوزِ عشق آگہ نیست — بخدا دوستت نمیدارم

خواستم تا ز جائے برخیزم — یادِ لے زار و رنجیش و افسردہ
مشتِ خاکی بسر فرو ریزم — خاکِ دلدادگانِ دل مردہ

دیدم از دیدگانِ محبوبم — قطرہ اشکے بناز پیدا شد
آں پریرو دی شہر آشوبم — با ہماں قطرہ اشک رسوا شد

اے لبِ قلبہائے طوفانی — کہ زبان رازِ آں نگوید باز
لیک آں دیدگانِ نورانی — راز دلدادہ میکنند ابراز

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ

جلد اول طبع دوم — للعہ/ — مجلد صہ/ — زیر طبع

جلد دوم — للعہ/ — " — صہ/

جلد سوم — للعہ/ — " — صہ/

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جیّد برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔